سورہ کہف کی تفسیر کے تناظر میں
دجالی فتنہ
کے نمایاں خدوخال
تصنیف
حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
تحقیق جدید
شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ
المیزان

سورہ کہف کی تفسیر کے تناظر میں

دجّالی فتنہ کے نمایاں خدوخال

تصنیف
حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

تحقیق جدید
شیخ الاسلام مفتی محمّد تقی عثمانی مدظلہ

المیزان ناشران و تاجران کتب
الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور پاکستان فون: ۷۲۱۲۷۶۲، ۷۱۲۲۹۸۱-۰۴۲

سلسلہ مطبوعات - ۲۶۲
سن اشاعت ۲۰۰۷ء
محمد شاہد عادل نے
زاہد بشیر پرنٹرز سے چھپوا کر
المیزان اُردو بازار لاہور سے شائع کی۔

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ٥

تذکیر بسورۃ الکہف

یعنی

دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال

دجالی فتنہ جس میں قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار حاصل کر کے بنی آدم کو دین و مذہب سے اسی اقتدار کے آثار و نتائج دکھا دکھا کر باغی بنانے کی کوشش کی جائے گی‘ اسی فتنہ سے حفاظت کی ضمانت ارشادِ نبوی ﷺ کے مطابق قرآن کی جس سورۃ میں بتائی گئی ہے‘ اسی سورۃ کے مضامین و مشتملات اسی فتنے کے آثار کو پیش نظر رکھ کر اس کتاب میں واضح کیے گئے ہیں۔

ایمانی زندگی کے ساتھ جو جینا چاہتے ہیں اور اسی پر مرنا چاہتے ہیں‘ ان کے لیے اس کتاب میں طمانیت و سکینیت کا کافی سرمایہ جمع کر دیا گیا ہے۔

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ٥؟

سید مناظر احسن گیلانی

فہرست مضامین

باب چہارم

باب پنجم

باب ششم

باب ہفتم

اصحاب کہف جدید تحقیق کی روشنی میں

❖❖❖

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مرتب

بیا جامی رہا کن شرمساری!
زصاف و درد پیش آر آنچہ داری!

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نوراللہ مرقدہٗ کی یہ وہ پہلی تالیف ہے جس کی تدوین کی سعادت مجھ بے استحقاق کو حاصل ہوئی اور خاطر احسن میں اس کو قبولیت کا شرف بھی ملا، پھر یہی اعتماد "تدوین حدیث" اور "مقالات احسانی" کی یکے بعد دیگرے تدوینی سعادت اندوزی کا باعث بن گیا۔

"تذکیر بسورۃ الکہف" کی ترتیب وتدوین کا موقع مجھ کو ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء کے درمیان ملا تھا، جب سید الملت والدین علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ زندہ تھے اور جستہ جستہ حضرت علامہ نے اس مسودہ پر نظر ڈالی تھی اور وہ بعض تاویلات سے مطمئن نہ تھے۔

اس کتاب کی اشاعت کا ارادہ پہلے پہل چونکہ اقبال سلیم صاحب گاہندری، مالک نفیس اکادمی کراچی نے ظاہر کیا تھا اس لئے مولانا گیلانی نے اس کا مسودہ انہی کو بھیجا تھا، کہ راقم الحروف سے اس کی تدوینی خدمت لے کر اس کو شائع کردیں مگر جب اقبال سلیم صاحب اپنے عزم سے ہٹ گئے تو میں نے یہ مسودہ ان سے لے کر مولانا کی خدمت میں واپس بھیج دیا اس روائیداد کو حضرت گیلانی کے الطاف ناموں میں ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۵ فروری ۱۹۵۴ء کے والا نامہ میں مجھ کو تحریر فرماتے ہیں۔

"مدت ہوئی اقبال سلیم صاحب نے سورۂ کہف کی تذکیر (تفسیر) کا مسودہ مجھ سے طلب کیا تھا، لکھا بھی تھا کہ آپ ہی کے سپرد اس مسودہ کی تصحیح و ترتیب کا کام

انہوں نے کر دیا۔ اس کے بعد وہ اچانک خاموش ہو گئے' میں نے خط بھی لکھا مگر جواب نہ آیا' ممکن ہو تو اس کے حال سے آگاہ کیجئے''۔

پھر ۱۴ ستمبر ۱۹۵۴ء کے کرم نامہ میں یہ جملہ تحریر فرمایا:

''اگر وہ (اقبال سلیم صاحب) چھاپنا نہ چاہتے ہوں تو مسودہ واپس ہی فرما دیجئے' یہاں کوئی ناشر ان شاء اللہ شائع کر دے گا''۔

اس کے بعد کا الطاف نامہ مورخہ ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء اس ضمن میں مفصل ہے اور زیادہ غور طلب بھی۔

الی العزیز السعید الرشید مولوی غلام محمد صاحب اید کم اللہ بروح منه

الکہف کا مسودہ' ریاض کا سلیمان نمبر' نصیر میاں سلمہٗ (یعنی محترم حکیم نصیر الدین ندوی اجمیری نظامی دواخانہ کراچی) کا پیغام اور خدا جانے کیا کیا' آپ کی یہ کمال سعادت مندی ہے کہ ایک فقیر لا ابالی از کار رفتہ' متروک الدنیا کی ایک ایک فرمائش کی تعمیل میں کافی وقت ضائع فرمایا۔ بار بار جعفری صاحب (رئیس احمد صاحب جعفری مرحوم جو اس وقت ''ماہنامہ ریاض'' کراچی سے نکالتے تھے) کے ہاں جانے کا خیال آتا ہے تو دل شرما جاتا ہے کہ کن قصوں میں آپ کو پھنسا دیا' آپ کے خط کے ملنے کے دوسرے دن بحمد اللہ سورۃ الکہف کا مسودہ بھی اچھی حالت میں مل گیا اگرچہ اس کا افسوس ہوا کہ پاکستان میں اس کتاب کی اشاعت کا سامان نہ ہو سکا حالانکہ اسی ملک میں اس کی اشاعت کی زیادہ ضرورت تھی۔

خیر جو خدا کا حکم' خدا کرے کہ بھارت ہی میں اشاعت کا نظم ہو جائے۔ آپ نے مضمون بندی اور ترتیب فہرست نیز آیتوں پر اعراب لگانے میں جو زحمت برداشت فرمائی ہے' اس کا بہت بہت شکریہ۔ بڑا کام ہو گیا' افادیت ان شاء اللہ بہت زیادہ بڑھ گئی اور امید ہے کہ اسی فہرست اور آپ کے قائم کردہ عنوانوں کے ساتھ شائع ہو گی۔ دیباچہ میں ان شاء اللہ اس کا ذکر بھی کر دیا جائے گا۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ ذاتی طور پر آپ کے نزدیک یہ کتاب کیسی رہی' خیال آتا ہے کہ سید صاحب

(حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ) کی رائے عالی کا بھی تذکرہ اس کے متعلق آپ نے کسی سابق مکتوب میں فرمایا تھا۔ ❶ کم ازکم اس سے اتنا معلوم ہوا کہ سید صاحب اس کے مندرجات سے ناخوش نہ ہوئے تھے۔ ابتداء میں انہوں نے مجھے لکھا تھا۔ کہ ''کہیں قادیانیوں کے مغالطوں کا شکار نہ ہو جانا شاید ان پر واضح ہوا ہوگا کہ ایسا نہ ہوا''۔

اس سب کچھ ہو جانے کے بعد مجلس علمی کراچی کے بانی مولانا محمد موسیٰ میاں افریقی رحمۃ اللہ علیہ سے خود حضرت گیلانیؒ ہی کے ذریعہ تعارف حاصل ہوا تو وہ احقر کی تحریک پر اس کتاب کی اشاعت پر بشوق آمادہ ہو گئے۔ اس لئے میں نے پھر یہ مسودہ حضرت گیلانی سے طلب کیا۔ جواب باصواب آیا۔

''سورۂ کہف والا مقالہ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) اپنے ساتھ لے کر چلے گئے میں ان سے طلب کروں گا اگر مولانا نے واپس کر دیا تو اس کو بھی ان شاء اللہ بھیج دوں گا۔ ایک خاص حصہ میں ترمیم کی بھی ضرورت محسوس ہوئی غالباً اسی مصلحت تکوینی کو عدم اشاعت میں زیادہ دخل ہے''۔

(اپریل ۱۹۵۵ء)

مسودہ حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کے ہاں سے فوراً آ گیا مگر جہاں تک نظر ثانی وترمیم کا تعلق ہے ۱۲۷ اکتوبر کے گرامی نامہ میں مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ

''اتنی قوت بھی اس عرصہ میں پیدا نہ ہو سکی کہ ان دونوں کتابوں (تدوین فقہ اور سورۂ کہف) کی نظر ثانی کر لوں۔ ❷

---

❶ اب خود راقم الحروف کو یاد نہیں کہ کیا عرض خدمت کیا تھا۔ حضرت گیلانی کو حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی رائے گرامی کا بڑا لحاظ ہوتا تھا حضرت علامہ کی وفات پر جو ''نوحہ سلیمانی'' حضرت گیلانی نے لکھا ہے اس میں ایک شعر یہ بھی ہے۔

اپنی تحریروں میں خود میری نظر تجھ پر رہی　　　رائے کا تیری رہا دل کو ہمیشہ انتظار!

❷ یہ تمام مکتوبات گیلانیؒ ماہنامہ ''بینات'' کراچی بابت ذیقعدہ ۱۳۸۳ھ م اپریل ۱۹۶۴ء میں شائع ہو چکے ہیں۔۱۲

مسلسل علالت نے بالکل مضمحل کر دیا اور بالآخر یہ گوہر کان سیادت' یہ صاحب خبر ونظم عالم' یہ بے نفس و باخدا عارف' چشتی و قادری نسبتوں کا سنگم' ۵ جون ۱۹۵۶ء کو قصبہ گیلانی (بہار) میں واصل بحق ہو گیا۔ نوراللہ مرقدہ' قدس سرہ۔

مولانا گیلانی کے آخری ایام حیات میں یہ مسودہ ان کے شاگرد عزیز وجلیل ڈاکٹر یوسف الدین صاحب (صدر شعبہ اسلامیات جامعہ عثمانیہ) کے ذریعہ ان کے واحد مرید اور مبیضہ نویس شاگرد محترم مخدوم محی الدین صاحب تک پہنچ گیا اور جب ان سے میں نے اس کا مطالبہ کیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ خود اس کی اشاعت کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں' چنانچہ برسوں مسودہ انہی کے پاس پڑا رہا اور اس کی اشاعت کی کوئی سبیل نہ ہو سکی' خدا خدا کر کے ۱۹۷۰ء کے وسط میں حیدرآباد دکن میں ''قرآن وسیرت سوسائٹی'' کی طرف سے یہ چھپ کر منظر عام پر آیا اور الحمد للہ کہ من وعن راقم الحروف کی مرتبہ شکل میں شائع ہوا۔ گو اس میں اس کا کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔

بہرحال خوشی کا مقام ہے کہ مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حسب خواہش اب پاکستان میں بھی اس کی اشاعت کا سامان ہو رہا ہے۔

ناسپاسی ہو گی اگر اپنے فاضل دوست جناب عبدالرؤف خان صاحب اسسٹنٹ کنٹرولر امتحانات بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن (کراچی) کا ذکر نہ کروں' جنہوں نے زبان سے بات نکلتے ہی ''تذکیر بسورۃ الکہف'' کی اشاعت کا مرحلہ طے کر دیا' ان کے اس تعاون سے حضرت گیلانیؒ کی روح یقیناً مسرور ہو گی۔

آخر میں دو لفظ ''یاجوج وماجوج'' اور خصوصاً ''دجال'' کی تعین سے متعلق بھی عرض کرنے کو جی چاہتا ہے' اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ اس کے جو اشارات احادیث نبویہ میں ملتے ہیں وہ سب اپنی نوعیت میں تمثیلی ہی ہیں' اس لئے ان کے حقیقی تشخص وتعین میں فکر ونظر اور ذوق علمی کے اعتبار سے فرق کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جو تاویل وتعبیر مولانا گیلانیؒ نے اس کتاب میں اختیار فرمائی ہے' اس سے دوسرے صاحب بصیرت علماء کو اختلاف ہو' مگر حتمی بات تو بہرحال خود ان کی بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ اصل حقیقت تو وقت مقدر ہی پر نگاہوں کے سامنے

آئے گی۔ البتہ مولانا گیلانیؒ جیسے عمیق نظر، وسیع العلم، عبقری عالم اور ملت محمدیہ کی بدحالی کی اصلاح کا سوز و درد رکھنے والے خادم دین کی پیش کردہ توضیحات وتشریحات کی یہ افادیت کیا کم ہے کہ اس سے متجسس ذہن کی کئی الجھنیں دور اور فکر کی بہت سی سلوٹیں صاف ہو جاتی ہیں اور نگاہ کو ایسی ایک سمت کی رہبری ملتی ہے، جس سے وہ اب تک ناآشنا تھی، نیز قرب قیامت کے موجودہ دور میں دجالی فتنوں سے ایمان کو بچا کر لے چلنے اور حفاظتی تدابیر پر فوراً گامزن ہو جانے کا خیال، بلکہ عزم اہل ایمان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مولانا کا بڑا احسان ہے اور یقین ہے کہ ملت اسلامیہ کی طرف سے اس کے بدلے ان کو نامتناہی اجر بارگاہ شکوریت سے ملتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ اس تذکیر گیلانی کے ذریعہ اہل ملت کو گمراہی سے محفوظ اور ہدایت پر قائم رکھے۔ آمین۔

والسلام علی من اتبع الهدی

بندۂ ناچیز

غلام محمد

یکم دسمبر ۱۹۷۵ء

☆☆☆

دیباچہ

الحمد لله و كفى و الصلوٰة و السلام على عباده الذين اصطفٰى

سورۂ کہف کے مطالعہ اور مراقبہ نے جن مضامین اور خیالات کی طرف ذہن کو منتقل کیا ہے' وہی تحریری لباس میں آپ کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔ تفسیر یا تاویل کا اطلاق لغۃً اس پر صحیح ہو یا نہ ہو' لیکن مستقل فن بن جانے کے بعد فن تفسیر کے لئے جو چیزیں ضروری قرار پا چکی ہیں' یا قرآنی الفاظ کے واضح پہلوؤں کو ترک کر کے ایسے مطالب اور نتائج کا قرآن کی طرف انتساب جن کی طرف عام حالات میں آدمی کا ذہن مشکل ہی سے منتقل ہو سکتا ہے' تاویل کا مطلب اگر یہی ہے تو مجھے یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ جو کام آپ کے سامنے پیش ہو رہا ہے۔ اس نقطہ نظر سے نہ یہ تفسیر ہی کہلانے کا شاید مستحق ہو سکتا ہے اور نہ تاویل ہی کا اطلاق اس پر درست ہو سکتا ہے' کیونکہ فن تفسیر کی اصطلاحی خصوصیات سے بھی یہ کتاب آپ کو خالی نظر آئے گی۔ اس میں نہ قصص ہیں نہ روایات اور نہ مفسرین کے اقوال ہی سے کتاب کی ضخامت بڑھائی گئی ہے۔ اسی طرح اپنا حسن ظن تو یہی ہے کہ کھلے کھلے صاف واضح نتائج قرآنی الفاظ سے چونکہ نکالے گئے ہیں' اس لئے تاویل بھی ہم اس کو نہیں کہہ سکتے۔

کچھ بھی ہو' ازالہ اشتباہ کے لئے اپنی اس ناچیز خدمت کا نام بجائے تفسیر و تاویل کے احتیاطاً خاکسار نے ''تذکیر بالقرآن'' رکھ دیا ہے' گویا تفسیر و تاویل کے مقابلہ میں ''تذکیر'' قرآنی خدمت کی ایک نئی قسم یا نئے پہلو سے آپ روشناس ہو رہے ہیں۔ سمجھنا چاہے کہ اس ذریعہ سے لکھنے والا خود بھی چونکنا چاہتا ہے اور دوسروں کو بھی چونکنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ ''تذکیر'' کے الفاظ سے اپنے اسی نصب العین کو واضح کرنا مقصود ہے۔ کہنا وہی ہے جو اکبر مرحوم کی زبان سے مدتوں پہلے کہلایا گیا تھا کہ:

خوشی ہے سب کہ آپریشن میں خوب نشتر یہ چل رہا ہے
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے، مریض کا دم نکل رہا ہے

ربنا انك تعلم ما نخفي و ما نعلن وما يخفي على الله من شئى في الارض ولا في السماء

سید مناظر احسن گیلانی
گیلانی (بہار)
۲۳اگست۱۹۵۲ء

☆☆☆

باب اول

دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال

مشہور حدیث جو ابوداؤد' مسلم' ترمذی' نسائی' احمد' بیہقی وغیرہ سے محدثین کی کتابوں میں پائی جاتی ہے' جس میں بیان کیا گیا ہے کہ دجال کے فتنے سے جو محفوظ رہنا چاہتا ہو' اس کو چاہئے کہ سورۂ کہف کی ابتدائی یا خاتمہ کی آیتوں کی تلاوت کرے' بعض روایتوں میں ابتداء یا خاتمہ کا ذکر نہیں ہے' بلکہ فرمایا گیا ہے کہ مطلقاً سورۂ کہف کی دس آیتوں کی تلاوت' اس کے تلاوت کرنے والوں کو دجال کے فتنے میں مبتلا ہونے سے بچا لیتی ہے' حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ' ابودرداء' ابن عمر' ابن عباس رضی اللہ عنہم صحابیوں سے الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ مندرجہ بالا کتابوں میں یہ حدیث مروی ہے۔ [1]

''المسیح الدجال'' کی شخصیت اور حقیقت سے بحث نہیں' یہ ایک مستقل جداگانہ مسئلہ ہے' یہاں مقصود صرف وہ ''فتنہ'' ہے جسے ''المسیح الدجال'' کی طرف پیغمبرانہ پیشین گوئیوں میں منسوب کیا گیا ہے۔''

دجال کے متعلق آپ نے جو کچھ سنا ہوگا' یا کتابوں میں جن چیزوں کا انتساب اس کی طرف کیا گیا ہے' سب کو پیش نظر رکھنے کے بعد کلی تعبیر ان کی یہی ہو سکتی ہے کہ بعض قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار اس کو بخشا جائے گا' مثلاً مسافت یعنی مکانی فاصلوں کو صفر کے درجہ تک گویا اس کے زمانے میں پہنچا دیا جائے گا۔ اس تیز رفتاری کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا کہ ''جیسے

---

[1] مستند روایتوں میں بھی ہے کہ جمعہ کے دن سورۂ کہف کو جو پڑھے گا وہ اس جمعہ تک نور اور روشنی میں رہتا ہے' مستدرک حاکم اور بیہقی کی روایت ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس جمعہ سے آئندہ جمعہ تک گناہ اس کے بخش دیئے جائیں گے یہ بھی ہے کہ سورۂ کہف جس گھر میں پڑھی جاتی ہے اس میں شیطان داخل نہیں ہوتا مسلمانوں کا عام دستور بھی ہے کہ ان میں متقی اور پرہیزگار لوگ ہر جمعہ کو سورۂ کہف ضرور تلاوت کرتے ہیں۔ مسجدوں میں اسی لئے سورۃ کے متعدد نسخوں کے رکھنے کا عام رواج ہے۔ ارباب ثروت کو یہ کرنا بھی چاہئے۔

بارش کو تیز آندھی اڑائے لے جاتی ہو" کچھ یہی صورت اس کی رفتار کی ہوگی۔ ❶

صحیح مسلم کے الفاظ "کالغیث استد برته الریح" کا مطلب یہی ہے اور یہ کرۂ زمین کے ملکوں اور شہروں میں نہیں بلکہ ایشیاء افریقہ یورپ و امریکہ وغیرہ کے ایک ایک گاؤں تک رسائی اس کی چالیس دن میں ہو جائے گی تو اس ابن سمعان والی روایت کے الفاظ "فلا ادع قرية الاهبطتها فی اربعین لیلة" (مسلم) سے یہی سمجھ میں آتا ہے اور یہ حال تو اس کی تیز رفتاری کا ہوگا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف کنز العمال میں جو خطبہ منسوب کیا گیا ہے اس میں آئندہ پیش آنے والے حوادث کے سلسلہ میں دجال کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا تھا کہ ینادی بصوته یسمعه به مابین الخافقین (خلاصہ کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۵۳ بر مسند احمد)۔ "پکارے گا دجال ایک ایسی آواز سے جسے خافقین (مشرق ومغرب) کے درمیان رہنے والے سنیں گے" جس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف "رفتار" بلکہ "آواز" کے سلسلہ میں بھی

❶ آج لوگوں کے سامنے ہوائی جہاز کی شکل میں جو سواری آ چکی ہے ان کے لئے نبوت کی بیان کی ہوئی اس تشبیہ کے سمجھنے میں شاید کوئی دشواری نہ ہوگی باقی اس سلسلہ میں دجال کے گدھے کا عام چرچا جو عوام میں پھیلا ہوا ہے اس میں شک نہیں کہ عام شہرت اس گدھے کو ضرور حاصل ہوگئی ہے لیکن صحاح کی کتابوں میں دجال کے متعلق حدیثوں کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے اس کو اس گدھے کے ذکر سے ہم خالی پاتے ہیں البتہ ابن عساکر وغیرہ کی ایسی کتابیں جنکی روایتوں کا معیار صحت بہت کچھ بحث طلب ہے ان میں حمار کے لفظ سے دجال کی سواری کا ضرور ذکر کیا گیا ہے۔ مگر آگے جو تشریحی صفات اس حمار یا گدھے کے بیان کئے گئے ہیں مثلاً یہی کہ اس گدھے کے دو کانوں کے بیچ کا فاصلہ (۸۰) ہاتھ کا ہوگا یعنی ۴۰ باغ ہوگا اور حضرت علیؓ کے خطبہ میں تو اس گدھے کے ایک ایک کان کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ تیس تیس ہاتھ کے برابر ہوں گے اور اس سے بھی عجیب تر اس کی یہ صفت کہ اس گدھے کے ایک قدم کا فاصلہ دوسرے قدم سے اتنا طویل ہوگا کہ عام حالات میں اس فاصلہ کو لوگ ایک دن اور ایک رات یعنی چوبیس گھنٹوں میں طے کر سکتے ہیں۔ الفاظ عربی کے یہ ہیں مابین حافر حماره الی الحافر الاخر مسیرة یوم ولیلة (ص ۵۳ ج ۲ خلاصہ کنز) ایسی صورت میں گدھے والی روایت کی صحت اگر تسلیم بھی کر لی جائے جب بھی "حمار" کے لفظ سے عموماً جو بات سمجھ میں آتی ہے دجال کے گدھے کی حقیقت چاہیے کہ اس سے مختلف ہو۔ یہ ظاہر تفہیم کا ایک تمثیلی طریقہ معلوم ہوتا ہے ورنہ ہمارے سامنے جو گدھے ہیں ان میں یہ خصوصیتیں کہاں مل سکتی ہیں۔ آج مچھلی کی شکل ہوائی جہازوں کی بنائی جاتی ہے۔ اگر کبھی گدھے کی شکل یا قالب ان ہی کو عطا کر دی جائے تو کیا تعجب ہے۔ آگے بھی اس تمثیلی بیان کی کچھ تشریح آ رہی ہے ۱۲

فاصلہ کا مسئلہ دجال کے زمانہ میں غیر اہم ہو کر رہ جائے گا۔ اسی کتاب میں مستدرک حاکم کے حوالہ سے عبداللہ بن عمرو کی ایک روایت دجال ہی کے متعلق جو پائی جاتی ہے اس میں بھی ہے کہ ''دجال کی آواز کو مشرق و مغرب کے باشندے سنیں گے۔ (ص ۴۹ جلد ۲ کنز العمال)

اسی طرح روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ علاج و معالجہ کے طریقے ترقی کر کے اس حد تک پہنچ جائیں گے کہ **الاکمہ** (مادر زاد اندھے) **الابرص** (کوڑھی) تک کو چنگا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ (کنز ص: ۴۸ جلد ۲)

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ **سخرت له انهار الارض** (یعنی زمین پر بہنے والے دریاؤں اور نہروں پر بھی اس کو قابو عطا کیا جائے گا) جس سے معلوم ہوا کہ سیرابی کے ذرائع میں غیر معمولی ترقیاں رونما ہوں گی اسی کے ساتھ **ثمارها** کا اضافہ بھی ہے یعنی زمین کی پیداواروں پر بھی اس کو قابو بخشا جائے گا۔ سیرابی کے ذرائع پر قابو یافتہ ہونے کا لازمی نتیجہ ہے اور یہی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مون سون برساتی ہواؤں سے بھی کام لینے کی تدبیر اس پر منکشف ہو جائیگی۔ حدیث کے الفاظ ہیں کہ:

یامر السماء فتمطر والارض فتنبت (ص: ۳۸ جلد ۲ کنز برمسند)

''بادل کو حکم دے گا تو برسنے لگے گا اور زمین کو حکم دے تو اگانے لگے گی۔''

اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ نباتاتی پیداواروں کے سوا زمین کے پیٹ کے معدنی ذخیروں کو بھی برآمد کرنے میں غیر معمولی کرشموں کا دجال اظہار کرے گا حدیث کے الفاظ ہیں کہ:

ویمر بالخربة فیقول لها اخرجی کنوزك فتتبعه کنوزها

(کنز ص ۳۸ جلد ۲)

اجاڑ زمینوں پر گزرے گا اور کہے گا کہ نکال اپنے ذخیروں کو پس یہ ذخیرے اس کے پیچھے ہو لیں گے اور ان ہی روایتوں میں دجال کی طرف **یحیی الموتیٰ** (یعنی وہ مردے کو زندہ کرے گا) کے الفاظ جو منسوب کئے گئے ہیں ان سے تو ثابت ہوتا ہے کہ مردوں کو زندہ کرنے کی بھی قدرت اس میں پیدا ہو جائے گی یہ بھی ہے کہ مردے کو زندہ کر کے دکھائے گا بھی صحاح میں ہے کہ زندہ آدمی کو چیر کر رکھ دے گا پھر دونوں ٹکڑوں کو جوڑ کر اسی کو زندہ کر دے گا اور کچھ اسی نقطہ پر

ختم ہوتا نظر نہیں آتا بلکہ روایتوں کے اس حصے پر غور کیجئے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ دجال لوگوں کو ایک کرشمہ یہ بھی دکھائے گا کہ (بعض خبیث روحیں) یعنی شیاطین لوگوں کے سامنے نمودار ہو کر کہیں گے کہ ہمارا یہ نام ہے اور تمہارے ہم مرے ہوئے باپ یا مری ہوئی ماں یا دوسرے عزیز ہیں الفاظ روایت کے یہ ہیں:

و یبعث معه الشیاطین علی صورة من قدمات من الاباء و الامهات والاخوان و المعارف فیاتی احدهم الی ابیه و اخیه فیقول الست فلانا' الست تعرفنی۔ (کنز العمال ص:۴۵)

''اور اٹھائے جائیں گے دجال کے ساتھ بعض شیاطین ان لوگوں کی شکلوں میں جو مر چکے ہیں باپ' ماں' بھائی اور جانے پہچانے لوگ' پھر کوئی اپنے باپ یا بھائی کے پاس جائے گا تب وہی پوچھے گا' کہ میں فلاں آدمی کیا نہیں ہوں؟ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟''

بعض روایتوں کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

دجال کے ساتھ کچھ شیاطین ہوں گے جو مردوں کی سی شکل بنا کر زندوں سے کہیں گے کہ مجھے تم پہچانتے ہو' میں تمہارا بھائی یا تمہارا باپ یا تمہارا فلاں رشتہ دار ہوں کیا تم نہیں جانتے؟ کہ ہم مر چکے ہیں۔ (ص ۴۷)

الغرض اس کا بھی سراغ ملتا ہے کہ مردوں کے ساتھ زندوں کے تعلق پیدا کرنے کا دعویٰ بھی اسی طریقہ سے کیا جائے گا' جیسے سنا جاتا ہے کہ یورپ و امریکہ میں آج کل مردوں کا حاضر کرانے اور ان سے مکالمہ کے مواقع ان مردوں کے زندہ عزیزوں کے لئے ''اسپر یچولیزم'' والوں کی طرف سے مہیا کئے جاتے ہیں۔ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے مسند احمد میں دجال ہی کے متعلق ایک طویل حدیث پائی جاتی ہے جس کا ایک جزو یہ بھی ہے۔

دجال کسی دیہاتی سے کہے گا کہ تمہارے ماں' باپ' کو زندہ کر کے میں کھڑا کر دوں تو تم مجھے اپنا رب مانو گے؟ دیہاتی کہے گا کہ اچھا' ایسا کر کے دکھاؤ تب دو خبیث روحیں اس دیہاتی کے سامنے اس کے ماں باپ کی شکل اختیار کر کے نمایاں ہوں گی

اور دیہاتی سے کہیں گی کہ اے میرے بیٹے' تم دجال کا ساتھ دو اور اس کی پیروی کرو' یہی تمہارا رب ہے (کنز العمال ص ۲۰۴ جلد ۲)

بہر حال قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار جو دجال کو عطا کیا جائے گا' وہ یہی' یا اسی قسم کی دوسری باتیں بھی ہیں جن کی تفصیل دجال کی متعلقہ حدیثوں میں پڑھی جا سکتی ہیں' لیکن جہاں تک میرا خیال ہے' دجال کو دجال بنانے والا اس کا وہ طرز عمل ہو گا جو اپنے اس غیر معمولی اقتدار کے استعمال میں وہ اختیار کرے گا۔

میرا مطلب:

یہ ہے کہ قوانین قدرت پر غیر معمولی اقتدار بجائے خود ایسی چیز نہیں ہے جو آدمی کو دجال بنا دے بلکہ قرآنی تعلیم کی رو سے تو قدرت کے قوانین سے استفادہ نسل انسانی کے مقام خلافت کا عام اقتضا ہے۔ آدم علیہ السلام کو اسماء کا جو علم بخشا گیا تھا اسی اجمالی علم کی یہ تفسیر ہے' ماسوی اس کے کون نہیں جانتا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی اسی قسم کا غیر معمولی اقتدار بخشا گیا تھا۔ علوی اجرام' یا سفلی اجسام کی تسخیر کی مثالوں سے ان کی زندگی معمور نظر آتی ہے۔ سمندر کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ضرب عصا سے پھٹ جانا' یا شق القمر کا معجزہ جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہے یا پھر خود قرآن میں ذکر کیا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اکمہ' وابرص کو چنگا بھی کرتے تھے بلکہ مردوں کو زندہ کر کے بھی دکھاتے تھے' بہر حال پیغمبروں کی زندگی میں اس قسم کی چیزوں کی کیا کمی ہے مگر پیغمبروں کو یہی اقتدار جب بخشا گیا تو اپنے اس اقتدار سے جو کام وہ لیتے تھے' اس سے دنیا واقف ہے یعنی اقتدار بخشنے والے قادر و توانا کے شکر سے ان کے قلوب بھی معمور ہو جاتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی خدائے بخشایندہ مہربان کی طرف کھینچتے تھے' تسخیری مظاہر کو حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے سامنے پا کر فرمایا کرتے تھے۔

هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ج لِيَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ط وَ مَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ج وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِيْمٌ۔ (النمل آیت: ۴۰)

''یہ میرے پروردگار کی مہربانی ہے' مجھے وہ جانچتا ہے کہ میں اس کا گن گاتا ہوں یعنی

شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں' جو شکر کرتا ہے اپنے لئے کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے اسے معلوم ہو کہ میرے رب کی ذات سب سے بے پرواہ اور عظمت والی ہے۔''

لیکن اس کے بالکل برعکس جیسا کہ سب جانتے ہیں دجال اپنے اقتدار کے کرشموں کو اقتدار بخشنے والے خدا سے خود باغی بننے اور دوسروں کو بھی خدا سے بیزار و باغی بنانے میں استعمال کرے گا۔ اس کی یہ خصوصیت اتنی نمایاں ہوگی کہ عوام و خواص ہر ایک پر بشرطیکہ وہ مومن ہوں' حدیثوں میں آیا ہے کہ پہلی نظر میں اس کے مشن کا یہ امتیازی نصب العین خود بخود واضح ہو جائے گا۔ صحیح بخاری وغیرہ میں یہ مشہور روایت جو دجال ہی کے متعلق پائی جاتی ہے' یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انه مكتوب بين عينيه ك ف ر' يقرء ه كل مومن كاتب او غير كاتب۔

''دجال کی دونوں آنکھوں کے بیچ میں ک ف ر (کفر) لکھا ہوا ہوگا جسے ہر مومن پڑھ لے گا خواہ کاتب ہو یا غیر کاتب۔''

''کاتب'' یعنی لکھنے پڑھنے والے لوگ اور ''غیر کاتب'' یعنی نوشت و خواند کا سلیقہ جن میں نہ ہو' کسی سے بھی دجال کی یہ خصوصیت مخفی نہ رہے گی۔ گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ کفر یعنی ''ک' ف' ر'' یہی دجالی تمدن و تہذیب کا امتیازی چھاپ ہوگا' ماحول ہی ایسا پیدا ہو جائے گا کہ دنیا بے ایمانی' الحاد' بے دینی کا شکار ہوتی چلی جائے گی۔ حضرت انسؓ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن فرمایا کہ ''دجال کے دیکھنے کا موقعہ جسے مل جائے اس کو چاہئے کہ اس سے دور ہی رہے'' اس کے بعد یہ ارشاد ہوا تھا کہ:

والله ان الرجل لياتيه وهو يحسب انه مومن فيتبعه مما يبحث به الشبهات۔ (ابو داؤد وغیرہ)

''اللہ کی قسم ہے کہ دجال کے پاس آدمی آئے گا یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ مومن ہے مگر (ملنے کے ساتھ ہی) اس کا پیرو بن جائے گا' جس کی وجہ سے وہ شبہے اور شکوک ہوں گے جو دجال سے ملنے کے ساتھ ہی پیدا ہو جائیں گے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں کو اپنے خیالات سے متاثر کرنے کی غیر معمولی مہارت بھی

اس میں پائی جائے گی اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مردوں سے آگے بڑھ کرعورتوں کو بھی متاثر کرے گا۔حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

اخر من یخرج الیه النساء حتی ان الرجل یرجع الی امه وبنته واخته و عمته فیو ثقهار باطا۔

''دجال کے ساتھ آخر میں عورتیں بھی نکل پڑیں گی حالت یہ ہوجائے گی کہ آدمی اپنی ماں' بہن' بیٹی اور پھوپھی کو اس اندیشہ سے باندھے گا کہیں دجال کے ساتھ نہ نکل پڑیں۔''

بہرحال قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار کا غلط بلکہ قطعی معکوس استعمال یہی وہ ''فتنہ'' ہے جس میں المسیح الدجال خود بھی مبتلا ہوگا اور کوشش کرے گا کہ اس کی بھڑکائی ہوئی فتنے کی اس آگ میں دوسرے بھی جھونک دیئے جائیں۔ باقی یہ مسئلہ اپنی کرشمہ نمائیوں میں وہ کن ذرائع سے کام لے گا؟ ظاہر ہے کہ جب تک المسیح الدجال خود دنیا کے سامنے نہ آجائے اس سوال کا صحیح جواب نہیں دیا جاسکتا۔کیا سحر و جادو یا اسی قسم کے غیر مادی ذرائع پر اس کو قابو بخشا جائے گا؟ یا جیسا کہ حافظ ابن حزم محدث کا خیال ہے۔

ابن حزمؒ کا نقطہ نظر:

انما هو محیل یتحیل بحیل معروفة کل من عرفها عمل مثله (الملل و النحل ص :۴۱)

''دجال حیلوں سے کام نکالے گا' ایسے حیلے جن کا علم جو بھی حاصل کرے گا وہی سب کچھ کر کے دکھا سکتا ہے جو دجال دکھائے گا۔''

جس کا حاصل یہ ہوا کہ ابن حزم کے نزدیک دجال ''حیل'' سے کام لے گا''حیلہ'' لفظ کی جو جمع ہے۔عام طور پر میکانکی طریقوں کی تعبیر عربی زبان میں ''حیل'' کے لفظ سے کی جاتی ہے۔ مثلاً جرثقیل کے طریقوں کا ذکر ''حیل'' کے ذیل میں کرتے ہیں ''علم الحیل'' نام ہی اس علم کا ہے جس میں میکانکی طریقوں سے چیزوں پر قابو حاصل کرنے کی تدبیریں بتائی جاتی ہیں اور یہی ابن حزمؒ کا مقصود بھی ہے۔انہوں نے دوسری جگہ ''دجالی کرشموں'' کا تذکرہ کرتے ہوئے بعض مثالوں سے ''دجالی کرتبوں'' کو سمجھانا چاہا ہے' مثلاً لکھا ہے کہ اس کی نوعیت وہی ہوگی جیسے

بعض لوگ مرغیوں کو ہڑتال کھلا کر دکھا دیتے ہیں کہ گویا مرغیاں مر گئیں۔ ان کی حس وحرکت غائب ہوگئی پھر ان ہی مرغیوں کے حلق میں زیتون کا تیل جب ٹپکاتے ہیں تو پھڑ پھڑا کر اٹھ بیٹھتی ہیں' بھڑوں کے متعلق بھی اپنا ذاتی تجربہ نقل کیا ہے کہ پانی میں ہم انہیں ڈال دیا کرتے تھے' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب مر گئیں' پھر ان ہی مردہ بھڑوں کو دھوپ میں لا کر تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دیتے تو زندہ ہو جاتی تھیں' اسی سلسلے میں اپنے وطن (اندلس) کے ایک آدمی محمد محرق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بند کمرے میں یہ تماشا دکھاتا تھا کہ کوئی دوسرا بولنے والا اس کمرے میں موجود نہیں ہے لیکن بولنے کی آواز اسی کمرے میں گونجتی تھی۔ حافظ کا بیان ہے کہ اس کمرے کی دیوار کے مخفی شگاف میں نلکی لگی ہوئی تھی جس سے لوگ ناواقف تھے۔ اسی نلکی کے دوسرے سرے پر کمرے سے باہر بات کرنے والا بات کرتا تھا' مگر محرق باور کراتا تھا کہ کسی بولنے والے کے بغیر اس کے سامنے آوازیں آتی ہیں۔ (الملل والنحل)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حدیثوں میں بھی اس کی تصریح نہیں کی گئی ہے کہ "دجال" اس راہ میں کن ذرائع سے کام لے گا اور نہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ قدرتی قوانین کا علم حاصل کر کے ان کو اپنے قابو میں لائے گا۔

اور یہ قصہ کچھ دجالی کرشموں ہی تک محدود نہیں ہے۔ قیامت سے پہلے آئندہ پیش آنے والے جن واقعات کا حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہے سب ہی کے متعلق یہ مناسب ہے کہ دیکھنے سے پہلے خواہ مخواہ اپنی طرف سے ان کے اسباب وعلل کے متعلق فیصلہ نہ کر دیا جائے۔ [1]

---

[1] مثلاً روایتوں میں آتا ہے کہ یاجوج و ماجوج کے اچانک مر جانے اور ختم ہو جانے کے بعد جب زمین ان کی گندگیوں سے صاف ہو جائے گی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایمان کے ساتھ پہاڑ سے اتر کر زمین پر آئیں گے تو بیان کیا گیا ہے کہ نشوونما کی قوت زمین کی اتنی زیادہ بڑھ جائے گی کہ ایک ایک انار سے بڑی بڑی ٹولیاں سیر ہو جائیں گی اور انار کا خول دانوں کے نکال لینے کے بعد جو رہ جائے گا وہ اتنا بڑا ہوگا کہ یہی ٹولیاں اس کے سائے میں قیام کریں گی۔ ایک طرف اس خبر کو رکھئے اور دوسری طرف غور کیجئے ان تجربات پر جو جاپان میں ایٹم بم کے چلنے کے بعد کئے گئے۔ کہتے ہیں جس علاقے میں چلایا گیا تھا وہاں کی زمین میں جو چیز بعد کو بوئی گئیں تو اپنی مقدار میں حیرت انگیز طور پر دیکھا گیا کہ وہ بڑھی ہوئی ہیں شلجم' مولی وغیرہ کی جو جسامت اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہے عام حالات میں اس کا باور کرنا مشکل ہے۔

پچھلے دنوں بعض لوگوں نے عجلت سے کام لیکر یورپ وامریکہ کے موجودہ تمدن وتہذیب کو دجالی تمدن وتہذیب قرار دیتے ہوئے یہ فیصلہ بھی جو کر دیا کہ ''المسیح الدجال'' جس کی پیشین گوئی کی گئی ہے وہ آ گیا اور اب مسلمانوں کو'' دجال'' کے انتظار کی زحمت نہ کھینچنی چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فیصلہ بھی زودفکری اور زود بیانی کے عارضہ کا نتیجہ تھا اور اب بھی جن لوگوں کو اس خیال پر اصرار ہے تو سمجھنا چاہئے کہ زودفکری کے مرض سے وہ شفایاب نہیں ہوئے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ قدرتی قوانین پر غیر معمولی اقتدار پچھلی دواڑھائی صدیوں میں یورپ وامریکہ والوں کا مسلسل قائم ہوتا چلا جا رہا ہے اور اپنے اس اقتدار کو ان ممالک کے باشندے بھی ان ہی '' دجالی اغراض'' میں جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے استعمال کر رہے ہیں'' ک' ف' ز'' یعنی کفر والحادیا خدا سے بیزاری یا انحراف موجودہ مغربی تہذیب کا ایسا عام چھاپ ہے' جسے ہر جاہل وعالم بشرطیکہ ایمان کی کوئی کرن اپنے اندر رکھتا ہو' جانتا اور پہنچانتا ہے۔ خالق کی مرضی کے مطابق اس کے بندوں کے آگے زندگی کا جو نظام خدا کے پیغمبروں نے پیش کیا ہے' اس نظام زندگی کی طرف سے پژمردگی اور افسردگی پیدا کرنے میں آج یورپ جن چابک دستیوں سے کام لے رہا ہے ان کو دیکھتے ہوئے نبوت کی وہ پیشینگوئی سمجھ میں آتی ہے کہ مومن' دجال کے پاس جائے گا' لیکن جب واپس لوٹے گا تو طرح طرح کے شکوک وشبہات کی چنگاریاں اپنے اندر بھڑکتی ہوئی پائے گا۔ یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ مردوں سے متجاوز ہو کر عورتوں کو بھی فتنہ کی یہ آگ گھیرتی چلی جا رہی ہے' اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ'' اسپر یچولیزم'' کے شیطانی تجربات کے دعوی پیش کر کے اس معیار ہی کو یورپ والوں نے چاہا کہ مشتبہ کر دیں' جس مذاہب وادیانات کے سلسلہ میں حق وباطل کو جانچا جاتا تھا' اگر واقعی یہ مان لیا جائے کہ جن مخفی روحوں سے مکالمہ کا ادعاء اس طبقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے یہ شیاطین نہیں بلکہ گزشتہ مرے ہوئے لوگوں کی واقعی روحیں ہیں تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ مرنے کے بعد والی زندگی کی بھلائی اور برائی' خیر وشر کا تعلق ان امور سے نہیں ہے جن کے ساتھ خیر وشر کے نتائج کو مذاہب وابستہ قرار دیتے ہیں' اور یہ بھی صحیح ہے کہ گو صاف صاف واضح لفظوں میں خدائی کا دعویٰ یورپ کی طرف سے ابھی دنیا کے سامنے نہیں رکھا گیا ہے لیکن جس فکری رفتار کا لوگوں کو اس زمانے میں عادی بنا دیا گیا ہے' اس رفتار کا آخری نتیجہ یہی ہے اور

یہی ہوسکتا ہے' کہ بجائے خدا کے سب سے آخری اقتداری قوت کائنات کی بنی نوع انسانی کو تسلیم کرلیا جائے' مسئلہ ارتقاء جو مغربی طریقہ فکر کی تنہا مخصوص راہ ہے' وہی اس نتیجہ تک خود بخود سوچنے والوں کو پہنچا دیتا ہے' بلکہ انسانوں میں بھی چوں کہ آج ہر قسم کی طاقتوں اور قوتوں کا مرکز یورپ وامریکہ ہی بنا ہوا ہے' اسی ''خدا'' کے لفظ کا اطلاق خواہ مغربی تہذیب وتمدن کے نمائندوں پر نہ کیا جائے لیکن خدا اگر اسی طاقت کا نام ہے جس کے اوپر کوئی طاقت نہیں ہے تو آج ان دلوں کو چیر کر دیکھئے جو مغربی تمدن کی زیر اثر ہیں' ان کے اندر سے یہی عقیدہ اور احساس باہر نکل پڑے گا۔ یعنی یورپ وامریکہ والوں سے بڑا کوئی نہیں ہے' ان ہی پر سارے کمالات کی انتہا ہوتی ہے۔

جو کچھ اس تہذیب وتمدن کے متعلق لکھا پڑھا جاتا ہے اور جس قسم کی گفتگو یورپ کی اس نشاۃ جدیدہ کے متعلق عوام وخواص کی مجلسوں میں کی جاتی ہے' رسالوں' اخباروں' سینماؤں اور تھیٹروں میں جو کچھ سنایا اور دکھایا جاتا ہے' شعوری وغیر شعوری طور پر یہی اثر ان سے دماغوں اور دلوں میں جاگزیں ہوتا چلا جارہا ہے' کوئی شک نہیں کہ یہ سب کچھ ہورہا ہے' مگر بایں ہمہ جیسا کہ میں نے عرض کیا کھلے کھلے صاف لفظوں میں خدائی کا دعویٰ ابھی نہیں کیا گیا ہے' اور قوانین قدرت پر بھی ان کا اقتدار بلندی کے نقطہ تک ابھی نہیں پہنچا ہے' جس نقطہ پر حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ''المسیح الدجال'' کا اقتدار پہنچ جائے گا' اس کی کوشش جیسا کہ سنا جاتا ہے ان ممالک میں ہورہی ہے کہ مردوں کو زندہ کرنے کا راز بھی دریافت کرلیا جائے' ایسی خبریں بھی کبھی کبھی آجاتی ہیں کہ بعض حیوانوں بلکہ شاید انسانوں تک کے متعلق احیاء موتی یعنی مردوں کو زندہ کرنے کا عمل کامیاب ہوچکا ہے' یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ بادلوں پر بھی قریب ہے کہ قابو پالیا جائے' مگر انصاف کی بات یہی ہے کہ صحیح کامیابی جیسی کہ چاہئے اس راہ میں مغرب کی جدید تہذیب اور اس کی ارتقائی وصنعتی کوششوں کو ابھی نہیں ہوئی ہے اور اس کے سوا بھی ایسے مختلف وجوہ واسباب ہیں جن کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہئے کہ نبوت کی پیشین گوئیوں میں جس ''المسیح الدجال'' کا ذکر جن خصوصیتوں کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے خروج وظہور کا دعویٰ بھی قبل از وقت ہے' ہاں اتنی بات صحیح ہے کہ مغرب کا جدید تمدن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''المسیح الدجال'' کے خروج کی زمین تیار کررہا ہے' کیونکہ اپنی اقتداری قوتوں سے وہی کام یورپ کی اس نشاۃ جدیدہ میں

بھی لیا جا رہا ہے' جس میں ''المسیح الدجال'' اپنی اقتداری قوتوں کو استعمال کرے گا' خدا بیزاری یا خدا کے انکار کو ہر دلعزیز بنانے کی راہ یورپ صاف کر رہا ہے یا کر چکا ہے لیکن بجائے خدا کے خود اپنی خدائی کے اعلان کی جرات اس میں ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ المسیح الدجال اسی قصے کی تکمیل کر دے گا۔ کچھ بھی ہو صحیح اور صاف بچی تلی بات جس میں خواہ مخواہ نبوت کے الفاظ میں کھینچ تان اور رکیک تاویلوں کی ضرورت نہیں ہوتی یہی ہے کہ ''المسیح الدجال'' کے خروج کا دعویٰ تو قبل از وقت ہے' مگر ''المسیح الدجال'' جس فتنے میں دنیا کو مبتلا کرے گا' اس فتنے کے ظہور کی ابتدا کسی نہ کسی رنگ میں مان لینا چاہئے کہ ہو چکی ہے' دوسرے لفظوں میں چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ دجال آیا ہو نہ آیا ہو' لیکن ''دجالیت'' کی آگ یقیناً بھڑک چکی۔ آخر حدیثوں ہی میں یہ بھی تو آیا ہے کہ ''المسیح الدجال'' سے پہلے ''دجاجلہ'' کا ظہور ہوگا' بعض روایتوں میں ان کی تعداد ۳۰ اور بعضوں میں ستر چھہتر تک بتائی گئی ہے۔ ''دجال'' سے پہلے ان ''دجاجلہ'' کی طرف ''دجالیت'' کا انتساب بلا وجہ نہیں کیا گیا ہے' بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''المسیح الدجال'' جس فتنے کو پیدا کرے گا کچھ اسی قسم کے فتنوں میں اس سے پہلے ہونے والے ''دجاجلہ'' دنیا کو مبتلا کریں گے۔

اسی بنیاد پر میرا خیال ہے کہ ''المسیح الدجال'' کے زہر کا علاج جیسے بتایا گیا ہے کہ سورۂ کہف کی آیتوں میں پوشیدہ ہے' اسی طرح اگر چاہا جائے تو ہر دجالی فتنہ کے زہر کا ازالہ بھی اسی سورۂ کی آیتوں اور جن معارف و مضامین پر یہ آیتیں مشتمل ہیں ان میں تلاش کیا جائے چونکہ موجودہ مغربی تہذیب و تمدن جس کے زیر اثر دنیا کی اکثریت آ چکی ہے اور آتی چلی جا رہی ہے' دجالی جراثیم کا جیسا کہ دنیا دیکھ رہی ہے سرچشمہ بنی ہوئی ہے' تقریباً وہی فتنے جن کے ظہور کی خبر ''المسیح الدجال'' کے عہد میں دی گئی ہے' یورپ کی اس تہذیب و تمدن سے ابل رہے ہیں۔

اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر فقیر نے سورۂ کہف کے مضامین اور مشتملات میں جب غور کیا تو بعض حیرت انگیز نتائج سامنے آئے۔ شاید دوسروں کو بھی اس سے کچھ فائدہ ہو' ان کو قلم بند کر لیا گیا' آج ان ہی کی اشاعت کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔

واللہ ولی الامر والتوفیق۔

باب دوم

دجالی فتنہ کے اشارات سورہ کہف میں

دجالی فتنہ جسے چاہیں تو آپ ''حماری ❶ تہذیب وتمدن'' بھی کہہ سکتے ہیں اس فتنے کے نمایاں خدوخال' آثار ولوازم آپ کے سامنے پیش ہو چکے۔ اگر ان نشانیوں اور علامتوں سے آپ اس فتنے کے پہچاننے میں کسی حدتک کامیاب ہو چکے ہیں تو اس کے بعد میں خیال کرتا ہوں کہ سورۂ کہف کے اشاروں سے ان شاء اللہ مستفید ہونے کی صلاحیت آپ میں پیدا ہو چکی ہوگی' جواب آپ کے سامنے رکھے جاتے ہیں' سورۂ کہف کے مشتملات اور مضامین کی اجمالی فہرست کا پہلے جائزہ لے لیا جائے تو مناسب ہے۔

(الف) سورہ کے ابتدائی رکوع اور خاتمہ کے رکوع میں چند کلیاتی اشارے پائے جاتے ہیں جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ معلوم ہوگا' دجالی فتنے سے ان اشاروں کا کافی گہرا تعلق ہے۔

(ب) ان کلیاتی اشاروں کے سوا چند قصص اور حکایتیں ہیں۔ یعنی

---

❶ ''حمار'' عربی میں گدھے کو کہتے ہیں ''المسیح الدجال'' کی طرف جس گدھے کا انتساب کیا گیا ہے روایۃً درایۃً اس کا حال جو کچھ بھی ہے وہ پہلے عرض کر چکا ہوں' اسی کے ساتھ اگر اس کو بھی سوچا جائے کہ تمدن جدید کے ائمہ اجتہاد' کارل مارکس کو سب سے بڑی کارفرما جوہر قوت' جدوجہد میں پیٹ اور پیٹ کے تقاضے جو نظر آئے ہیں اور اسی کے ساتھ فرائڈ نے جنسی میلان کی نشاندہی بنی آدم کی ساری تگ ودو میں جو کی ہے ان دونوں نظریات کو اگر ملایا جائے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ انسانیت جن جذبات کے رو میں تمدن جدید کے ان محققوں کو بہتی نظر آئی ہے' ان کی مثالی صورت کے لئے گدھے کے قالب سے بہتر قالب شاید کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ آخر شکم پروری اور خرنفسی کے سوا غریب گدھا اور بھی کچھ ہے؟ عہد جدید کا انسان جب ان ہی دو کارفرما قوتوں کی سواری ہو کر آسمان کے قلابے زمین سے اور زمین کے قلابے آسمان سے ملا رہا ہے کدوکاوش جدوجہد کے تمام شعبے چھوٹے چھوٹے پیمانے پر' جب ان ہی دو محرکہ قوتوں کے زیر اثر گردش کر رہے ہیں' نسل انسانی کی ساری اچھل پھاند جب ان ہی دونوں جذبات سے زور حاصل کر رہی ہے تو گدھے کی سواری کے سوا ''المسیح الدجال'' کی ران کے نیچے آپ ہی بتائیے کہ اور نظر ہی کیا آتا' سوار جب خود کہہ رہا ہو کہ میں گدھے پر سوار ہوں تو دیکھنے والوں نے کیا غلطی کی جب اس کو گدھے پر سوار دیکھا۔ ۱۲

۱۔ اصحاب کہف کا قصہ

۲۔ علم لدنی اور خدا کے حضور سے علم و رحمت پانے والی ایک شخصیت سے موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات۔

۳۔ ذوالقرنین کا قصہ (اسی قصہ کے ضمن میں یاجوج و ماجوج کا ذکر بھی پایا جاتا ہے)

۴۔ دو آدمیوں کی مثالی سرگذشت اور مکالمہ' جن میں ایک کے قبضہ میں قدرتی پیداواروں کے حصول کے بڑے اہم ذرائع و وسائل تھے' اور دوسرے کا دامن ان ذرائع و وسائل سے خالی تھا۔

۵۔ دنیا کی موجودہ پست زندگی کی ایک تمثیل۔

۶۔ آدم علیہ السلام اور شیطان کے قصہ کا اعادہ' بعض جدید اضافوں کے ساتھ۔

قرآنی قصص کی تاریخی تحقیق چنداں ضروری نہیں:

ان تمثیلی قصص و حکایات کو بیان کرتے ہوئے بعضوں کے شروع میں تو صراحتاً یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس کا ذکر بطور مثال اور نمونہ کے لوگوں کے سامنے کیجئے مثلاً فرمایا گیا ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ۔

''اور بیان کر بطور مثال کے دو آدمیوں کا حال''۔

یا دنیا کی اس پست زندگی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔

''اور بیان کر ان کے لئے اس پست زندگی کی مثال''

اور بعضوں میں اس کی تصریح تو نہیں کی گئی ہے' مگر سباق و سیاق اور قرآن کے شیوہ بیان کے جو مذاق شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ محض کسی گزرے ہوئے واقعہ کا دہرانا' یعنی افسانہ گوئی کا انتساب قرآن کی طرف خود اپنی عقل و تمیز کا مضحکہ ہے' اسی لئے قرآنی قصص و حکایات کی تاریخی جستجو کم از کم میرے نزدیک ایک غیر ضروری مشغلہ ہے۔ قرآن کا عام دستور ہے کہ بڑے بڑے تاریخی واقعات سے صرف ان ہی اجزاء کا وہ انتخاب کر لیتا ہے جن سے خاص مقصد کے ذہن

نشین کرانے اور سلجھانے میں مدد ملتی ہو۔ نہ صرف گزرے ہوئے واقعات و حوادث بلکہ جس زمانے میں قرآن نازل ہو رہا تھا اور ایک عالمگیر تاریخی انقلاب کے متعلقہ حوادث مسلسل یکے بعد دیگرے پیش آتے چلے جارہے تھے ان کے ذکر کی بھی ضرورت کہیں اگر پیش آ گئی ہے تو اس وقت بھی حسب دستور ذکر کے لئے ان ہی اجزا کو اس نے چن لیا ہے' جن سے اس خاص مقام میں کسی قسم کا تفہیمی کام وہ لینا چاہتا ہے۔ بدر و اُحد' فتح مکہ جیسے اہم فیصلہ کن معرکوں کا تذکرہ آپ کو قرآن میں اگر ملے گا بھی تو اسی نوعیت کے ساتھ جو میں نے عرض کیا' ورنہ بعض اہم واقعات مثلاً شعب ابی طالب میں نظر بندی' ہجرت حبشہ' فتح خیبر اور ازیں قبیل بیسیوں چیزیں اسی سلسلے کی ایسی ہیں کہ ان کے ذکر سے ہم قرآن کو خالی پاتے ہیں' یا ذکر ملتا بھی ہے تو اتنا مجمل کہ جب تک واقعہ کے تفصیلات کا علم نہ ہو ان اجمالی اشاروں سے واقعہ کا علم نہیں ہو سکتا' اور اس کی وجہ وہی ہے کہ قرآن نہ قصے کہانی کی کوئی کتاب ہے اور نہ کوئی وہ تاریخی یادداشت یا ریکارڈ ہے' اس کا ایک متعین موضوع ہے ❶ اسی لئے اس کے سارے مباحث اسی ایک موضوع خاص کے لئے ہیں۔ جہاں جہاں مناسب تھا' بعض گزرے ہوئے واقعات اور قصص کا بھی اس نے ذکر کیا ہے' مگر اسی التزام کے ساتھ یعنی صرف بقدر ضرورت اسی حد تک اپنے بیان کو محدود رکھتا ہے جس کی اس خاص مقام میں ضرورت ہوتی ہے' اس لئے آپ پائیں گے کہ ایک ہی قصہ کا اعادہ مختلف مقامات میں مختلف طریقوں سے قرآن میں جو کیا گیا ہے تو کہیں نسبتاً تفصیل و بسط کا رنگ پایا جاتا ہے اور کہیں اسی قصے کے کسی خاص جز کا ذکر کرتے ہوئے آگے نکل جاتا ہے مجھے تو اپنے تجربہ کی بنیاد پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''ہڈی'' جیسے ایک ہی ہوتی ہے مگر جسدی نظام میں وہی ''ہڈی'' کسی جگہ کافی طویل و عریض موٹی نظر آتی ہے اور دوسری جگہ بھی ہڈی ہی ہوتی ہے مگر ایک ڈیڑھ انچ سے زیادہ بڑی نہیں ہوتی' کچھ یہی طریقہ قرآنی قصص کے استعمال میں اختیار کیا گیا ہے' ایک ہی لکڑی ہوتی ہے بڑھئی مختلف پیمانوں پر اسی ایک لکڑی سے ٹکڑے بنا بنا کر اپنی اپنی

❶ یعنی جس کی استدعا ''اهدنا الصراط المستقيم'' کی دعا میں کی جاتی ہے' وہ سیدھی راہ جس پر پڑ کر انسانیت قدرت اور اس کے قوانین سے وفاقی تعلق پیدا کر لیتی ہے قرآنی تعبیر جس کی ''انعام'' کے لفظ سے لی گئی ہے۔

جگہ پر ان چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو فٹ کرتا چلا جاتا ہے۔ قرآنی قصص کے متعلق ضرورت ہے کہ قرآن پڑھنے والے اس خاص نقطہ نظر کو اگر سامنے رکھیں گے تو ان پر قرآن کا ایک عجیب و غریب اعجازی نظام واضح ہوگا۔

بہر حال مجھے کہنا یہ ہے کہ سورۂ کہف کے ان قصص و حکایات کی تاریخی تحقیق' یعنی کہاں اور کب یہ واقعات پیش آئے' تاریخی آثار اور کتابوں سے انہی کے متعلق کس قسم کے معلومات فراہم ہو سکتے ہیں' یا ہو چکے ہیں' یہ بالکل ایک جداگانہ بحث ہے' جیسا کہ میں نے عرض کیا' جس غرض سے قرآن اتارا گیا ہے اس کے لحاظ سے بحث و تحقیق کے اس جھگڑے میں پڑنا غیر ضروری ہے۔ یوں علمی نقطہ نظر سے جیسے دوسرے تاریخی واقعات کی سراغ رسانی علم کی خدمت ہے' اس خدمت کو بھی انجام دے تو علمی حلقوں میں یہ خدمت بھی قدر و قیمت کی مستحق ہوگی' لیکن جس نتیجے تک پہنچانے کے لئے قرآن کی روشنی عام کی گئی ہے اس کے لئے تو صرف قرآن ہی کافی ہے۔ [1]

دجالی فتنہ کی بنیاد یعنی نظریہ ارتقاء:

بہر حال سب سے پہلی بنیادی بات' دجالی فتنے سے ماؤف فطرتوں کی آپ جانتے ہیں کیا ہے؟ باور کرایا جاتا ہے جس کسی کو جو کچھ بھی ملا ہے اسی سے ملا ہے جس کے پاس خود کچھ نہ تھا' تا ایں کہ زندگی بھی اسی سے ملی جس میں زندگی نہ تھی' علم اسی سے ملا جس میں علم نہ تھا۔ الغرض جس میں بینائی نہ تھی اس سے بینائی' جس میں شنوائی نہ تھی اس سے شنوائی' جس میں ارادہ نہ تھا اس سے ارادہ' جس میں اختیار نہ تھا' اسی سے اختیار و اقتدار سب کچھ تقسیم ہوا۔ یہی بنیادی احساس ہے جسے ہر اس دل اور دماغ میں آج پائیں گے جس پر دجالی فتنے کے عفریتی پر

[1] لیکن براہ راست عربی زبان میں قرآن سے جو استفادہ نہیں کر سکتے ان کو سمجھانے کا مرحلہ ذرا دشوار ہے۔ پہلے قرآنی الفاظ نقل کروں پھر ان کا ترجمہ کروں' مطلب بیان کروں' اس کے بعد بتاؤں کہ دجالی فتنے کی سمیت کے ازالہ میں سورۂ کہف کے اس جزو سے مدد لینے کی کیا شکل ہے دماغ میں مختلف تجویزیں آئیں مگر دل کسی پر جما نہیں' حق تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کر کے میں کچھ کہنا شروع کرتا ہوں' آپ پڑھتے جایئے دیکھئے اس راہ سے فائدہ کی صورت خدا چاہے گا تو نکل آئے گی۔

چھائیاں پڑ چکی ہیں۔ان کے تاریک سائے میں آنے کے ساتھ ہی پانے والے کچھ اس قسم کے احساسات اپنے اندر پاتے ہیں۔

صرف ایک لفظ ''ارتقا'' جادو کا کوئی چمچہ ہے' جس میں بھر بھر کر وہ سب کچھ پلا دیا جاتا ہے جسے انسان کی فطرت کسی طرح پینے پر آمادہ نہیں ہوسکتی تھی' ہستی ہی سے ہستی کی پیدائش کا سلسلہ جن کے سامنے جاری ہے'' کچھ نہیں'' سے ''کچھ'' بھی پیدا ہوسکتا ہے' جو اس کے تصور سے بھی عاجز ہے' اسی غریب انسان کو ہضم کرا دیا جاتا ہے کہ کمالات وصفات کا یہ بحر بے کراں جو کائنات کے نباتاتی' حیوانی' انسانی طبقات میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے ابتداءً یہ سب کچھ نیست و نابود تھے' پھر وہی کمالات جو نیست و نابود تھے' ارتقائی عمل کی راہ سے ہست و بود کے قالب میں جلوہ گر ہوتے چلے گئے اور ہوتے چلے جارہے ہیں' گویا جو نہ تھے وہ ہوگئے اور ہوتے چلے جارہے ہیں۔یہی منوایا بھی جاتا ہے اور ماننے والے اسی کو مان بھی رہے ہیں' جس خیال کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے' اسی کے نگلوا دینے میں کامیابی کے لئے خصوصاً اس دعویٰ کے ساتھ کہ عقل ومشاہدے کے سوا دلیل و حجت کی حیثیت سے کوئی تیسری چیز پیش نہیں ہوسکتی' اس عقل ومشاہدے کے برخلاف یہ کیسے مان لیا گیا کہ جس مادے میں کچھ نہ تھا اسی سے سب کچھ نکل آیا' حالانکہ نہ باور کرنے والوں کے سامنے کی یہ بات ہے اور نہ باور کرانے والوں کے سامنے کی۔دنیا جب پیدا ہو رہی تھی اس وقت نہ یہ موجود تھے' نہ وہ' مگر جانے بغیر جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم کسی چیز کو مان نہیں سکتے وہ ایک ایسے بنیادی مسئلہ میں جانے بغیر ماننے پر خود بھی تیار ہوگئے اور دوسروں کو بھی تیار کرنے کی کوششوں میں منہمک ہیں۔

بہرحال جس میں کچھ نہ تھا اسی سے یہ سب کچھ نکل آیا' صفر سے عدد کیسے پیدا ہوا' نابود نے بود کا' نیستی نے ہستی کا لباس کیسے اختیار کرلیا؟ ان قصوں کو تو جانے دیجئے' زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو میری کتاب ''الدین القیم'' کا مطالعہ کیجئے' یہاں میں ایک دوسرے نفسیاتی مسئلہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ ''جس مادے میں کچھ نہ تھا اسی سے سب کچھ نکل آیا'' جس کی فکری تعمیر اس بنیاد پر قائم ہوگی' مادے کی کیچڑ سے ابل کر باہر آنے والے اس شخص کے احساسات کیا ہوں

گے؟ کائنات کے اس بحر مواج کی ہر موج میں صد کام نہنگ کے چھپے ہوئے حلقوں کو توڑتے پھوڑتے ہوئے سمجھتا ہے کہ موجودہ زندگی کے پانے میں وہ کامیاب ہوا ہے' کس زندگی کے پانے میں؟ جو خود مستقل ''قید غم'' ہے اور ''غم کی اس قید'' پر بھی مسلسل حوادث و آفات کے ہتھوڑے پڑتے چلے جاتے ہیں' تا ایں کہ بالآخر غم ہی کی شکل میں زندگی ملی تھی' جب تک ساتھ رہی شورش بن کر ساتھ رہی' جس دن سوزش اس کی ہوئی' زندگی بھی ختم ہو گئی' الغرض ایک بے سہارا تنکے کی طرح ہستی کے سمندر میں ''کچھ نہیں'' سے ''سب کچھ'' بن جانے والا یہ انسان تیرتا رہتا ہے' جس کا کوئی محافظ کوئی نگران نہیں' جس کی سعی کا کوئی حاصل' اور جس کے وجود یا زندگی کا کوئی مطلب اور کوئی انجام نہیں۔

''دجالیت'' کے اس عہد میں ساری بیقراریاں' جن میں آدمی کا دل تہہ و بالا ہوتا رہتا ہے' سچ پوچھئے تو ان کی ضمانت درحقیقت بے کسی کے اس شعوری احساس میں پوشیدہ ہے جو زندگی کی اس ارتقائی توجیہ کا لازمی نتیجہ ہے۔

اب ایک طرف دجالی ذہنیت کے اس قدرتی نتیجے اور لازمی احساس کو رکھئے اور سورۂ کہف کی پہلی سطر کے پہلے جزء ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' پر ٹھہر جایئے۔ میں آپ سے بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ آگے پڑھئے یا نہ پڑھئے صرف ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' سے علم کی جو روشنی پیدا ہوتی ہے' وہ تاریکی کے ان مہیب بادلوں کو چھانٹنے کیلئے کافی ہے۔

سمجھا آپ نے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کا کیا مطلب؟ کھولا گیا ہے کہ ہر وہ کمال یا صفت جو تعریف و توصیف کی مستحق نظر آتی ہے یہ ''اللہ'' یعنی اس کی ذات کے ساتھ مختص ہے' جس کی کار فرمائیوں کی یہ کائنات جلوہ گاہ ہے' جس کا حاصل یہی تو ہوا کہ جس میں کچھ نہ تھا اس سے نہیں بلکہ جس میں سب کچھ ہے اسی سے ہے' جس کسی کو جو کچھ بھی ملا ہے' جس کا سب کچھ ہے اور جس میں سب کچھ ہے' حیات ہے' علم ہے' قدرت ہے' ارادہ ہے' رحم ہے' رافت ہے' جو اس سے پیدا ہوا ہے' خیال تو کیجئے کہ ان مایوسیوں اور وسواسی محرومیوں سے اس کو کیا واسطہ' جو یہ سوچتا ہے کہ جس میں کچھ نہ تھا' اسی سے نکل کر میں دنیا میں آیا ہوں اور اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی کچھ باقی نہ رہوں گا۔

جس کے پاس سب کچھ ہے اگر دستگیری کے لئے اسی کی طرف وہ ہاتھ بڑھائیں جن کے پاس کچھ نہیں ہے اور یوں وہ بے یاروں کی یاوری، غمخواروں کی غم خواری، ناداروں کی دارائی کرے اور ان کی خالی جھولیوں کو بھر دے، بھرتا چلا جائے۔ سوال یہی ہے کہ پستی سے نکال کر بلندی کی طرف چڑھانے کے لئے کچھ نہ رکھنے والوں کی طرف سے سب کچھ رکھنے والی ہستی کی اپنے مقام رفیع سے نزولی توجہ کیا کسی حیثیت سے کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے جس کے تسلیم کرنے میں انسانی فطرت اپنے اندر کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا جھنجھلاہٹ محسوس کرے؟

نزول کے بعد ارتقاء:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' یعنی تمام قابل تعریف خوبیوں اور زیبائیوں کے سرچشمہ اور اسی کامل وجود کو بنیاد بنا کر نزول کے بعد ارتقاء کا یہی وہ قرآنی نظریہ ہے جسے ''سورۃ الکھف'' کی پہلی سطر میں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کے بعد ان الفاظ میں ہم بناتے ہیں، فرمایا گیا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کی حقیقت کو پیش کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے۔

اَلَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ۔

''جس نے اتاری کتاب اپنے بندے پر۔''

ان الفاظ سے یہی علم تو بخشا گیا ہے کہ بندہ جس کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا، اس پر الحمد والے اللہ نے یعنی جس کے پاس سب کچھ ہے اپنی کتاب اتار دی، اور یوں جو نیچے تھے ان کو اونچا کرنے کی راہ اس نے کھولی۔

نزول اور اتار کے ارتقاء اور چڑھاؤ کے اس فطری اور طبعی طریقے کا مقابلہ عہد دجالیت کے اس ارتقائی وسوسہ سے کیجئے جس میں ''کچھ نہیں'' سے باور کرایا جاتا ہے کہ سب کچھ نکل آیا ہے۔ سمجھایا جاتا ہے کہ مادہ جس میں کچھ نہ تھا، نہ زندگی تھی، نہ علم، نہ ارادہ، وہی ان کمالات وصفات کی تلاش میں اٹھ کھڑا ہوا جو اس کے لئے نامعلوم اور مجہول ہی نہیں تھے بلکہ بذات خود معدوم اور قطعاً معدوم تھے۔ جاہل طالب اور مجہول بلکہ مطلق معدوم مطلوب، یہ عجیب وغریب ارتقائی لطیفہ آپ دیکھ رہے ہیں، پیچ در پیچ الجھنوں میں گتھا ہوا ہے، اس میں ان مجہول و معدوم کمالات و

صفات کی طلب کیسے پیدا ہوئی؟ اس طلب کے بعد اپنی انتخابی قوت سے کام لے کر ناقص صفات کو چھوڑتے ہوئے' کامل صفات کو چنتے ہوئے' وہ آگے آخر کس بل بوتے پر بڑھ رہا ہے' اور اسی بے جان' بے عقل وتمیز طالب کو یہ معدوم مطلق صفات آخر کیسے مل گئے؟ جن سے آج مادے کا وجود آراستہ وپیراستہ نظر آرہا ہے' یہ کتنی ٹیڑھی کڑی پیچ وخم والی راہ ہے جس پر ''کچھ نہیں سے سب کچھ نکل آنے'' کے فلسفہ یا وسوسہ نے ان کو ڈال دیا' جس معمہ کو اس توجیہ سے آج حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے وہ تفہیم کے اس طریقہ سے' انصاف شرط ہے' سلجھتا ہے' یا اس کی الجھنیں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں؟ اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جن کی فطرت ابھی سلامتی کے نقطہ نظر سے زیادہ دور نہیں ہوئی ہے' ورنہ توڑی مروڑی طبیعتوں میں یہی الٹی باتیں سیدھی بن بن کر اترتی چلی جارہی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عہد دجالیت کی یہ باتیں سیدھی ہیں' لیکن سرشت بشری کے سب سے بڑے نباض عارف رومیؒ کا فیصلہ تو یہ ہے کہ

؎ چون فسون دیو در دلہائے کج
می رود چوں کفش در پائے کج

ٹیڑھے پاؤں میں ٹیڑھا جوتا اگر فٹ ہو جائے تو آپ ہی بتایئے کہ اس کے اور ہوتا کیا؟ بہر حال میں تو سمجھتا ہوں کہ سورۂ کہف کے مذکورۂ بالا الفاظ میں **الحمد لله** پر بنیاد قائم کر کے نزول کے بعد ارتقاء کی جو راہ پیش کی گئی ہے اس کی یعنی ارتقاء کی اس راہ پر چلانے والی الکتب یا قدرتی دستور العمل اور ہدایت نامے کی پہلی خصوصیت:

وَلَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجًا۔

''اور نہ رکھی کتاب اتارنے والے اللہ نے اس میں کسی قسم کی کوئی کجی۔''

جو بیان کی گئی ہے اس کا مطلب جیسا کہ میں سمجھتا ہوں یہی ہے کہ عوج یعنی پیچ وخم' کجی اور ٹیڑھ سے اس کتاب کا کوئی رشتہ نہیں ہے' وہ خود سیدھی ہے' سیدھی بات بتاتی ہے' سیدھی راہ پر چلتی ہے' فکر ونظر کی مصنوعی ورزشوں اور سوفسطائیت کے مغالطی کرتبوں سے جن کے دل' جن کے دماغ الٹے پلٹے مسلے دلے نہیں گئے ہیں' تجربہ کر کے دیکھ لیجئے ان کے اندر یہ کتاب اتر جائے گی' اترتی چلی جائے گی' ان کو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ اس کتاب کے لئے پیدا کئے گئے ہیں' اور یہ

کتاب ان کے لئے پیدا کی گئی ہے' مگر دجالی فتنوں کی آنچ سے پگھلائی ہوئی ٹیڑھی' ترچھی ذہنیتوں اور عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالے ہوئے کج دماغوں' پھرے ہوئے سروں' سے یہ کتاب اچٹ جاتی ہے۔ نہ وہ اس کے وزن کو محسوس کر سکتے ہیں اور نہ یہ کتاب اپنے واقعی وزن کو انہیں محسوس کرا سکتی ہے۔ ان کے لئے بھینس سے انڈے اور انڈے سے روغن گل' روغن گل سے ساری دواؤں کا نکلنا اور نکالنا آسان ہے۔ آخر جس مادے میں کچھ نہ تھا' جب یہ مانا جاتا ہے کہ اسی سے سب کچھ نکل آیا تو اس میں اور بھینس کے مذکورہ بالا مشہور لطیفے میں کیا فرق ہے؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' صفر سے عدد کی پیدائش کا تو وہ تصور کر سکتے ہیں' بلکہ اسی کو واقعہ ٹھہرا رہے ہیں' مگر جس ہتھیلی میں سو روپے ہوں ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے دس یا بیس روپے کیسے نکلے؟ "الحمد لله" کو خشت اول قرار دے کر قرآن' کائنات کی تعمیر کی جو توجیہ پیش کر رہا ہے وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ لامحدود کمالات والے خدا نے اپنے کمالات کو محدود پیمانوں پر نمایاں کیا ہے' کچھ نہ رکھنے والوں کو اسی سب کچھ رکھنے والے کے یہاں سے ملا ہے' جو کچھ ملا ہے' مگر یہ شراب سائغ اور گوارا مشروب' مفتون طبائع کے لئے داروئے تلخ بنا ہوا ہے اور "کچھ نہیں سے سب کچھ نکل پڑنے کا" اسی ارتقائی وسوسہ کو سارے فکری امراض کی دوا تسلیم کر لیا گیا ہے۔

خود جس مسئلہ میں الجھنوں کے کانٹوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے' انہیں کانٹوں کی سیج پر انہیں نیند آ گئی ہے اور یقین کئے بیٹھے ہیں کہ زندگی کے سارے اساسی سوالوں کی گرہیں' الجھنوں کے ان ہی کانٹوں کی نوک سے کھل چکی ہیں اور آئندہ کھلتی جائیں گی اور یہ سب اسی لئے ہو رہا ہے کہ پاؤں کو ٹیڑھا بنا لینے کے بعد ان کو نظر آ رہا ہے کہ ٹیڑھا جوتا ان کے لئے سیدھا بن گیا ہے' مگر ان کی ذہنیت اور فکر کی یہ مصنوعی کجی جو ہر ٹیڑھی بات کو آج سیدھی پا رہی ہے اور سیدھی باتیں ان کو ٹیڑھی نظر آ رہی ہیں۔ یہ ایک مرض ہے جو باہر سے ان کے اندر آیا ہے' شاید اسی کو بتانے کیلئے اور اسی خارجی سمیّت کو نکالنے کے لئے دوسری خصوصیت اس "الکتاب" اور زندگی کے قدرتی دستور العمل کی ایک اور صرف ایک "قَیِّمًا" کے لفظ سے ظاہر کی گئی ہے۔ دیکھنے میں ہے تو بظاہر یہ ایک لفظ جس کا حاصل یا ترجمہ جیسا کہ فقیر کا خیال ہے اور مفسرین کی کافی تعداد اس خیال کی موید ہے' یعنی علاوہ اس خصوصیت کے اس کتاب اور اس کی تعلیمات میں کسی قسم کی کجی نہیں پائی

جاتی۔ دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ لازوال' غیر فانی' انمٹ' اٹل حقائق اور اصول پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ قیام وبقا کی شدت اور حد سے زیادہ استحکام واستواری پر ''قیـــم'' کا یہ لفظ دلالت کرتا ہے جس کے سوا کچھ نہ رہے گا' جو ایسا برقرار وباقی رہنے والا ہے اور ہر چیز جو کچھ بھی اس کے سوا ہے سب کے قیام وبقا کی ضمانت جس کی قدوس وپاک ذات کے ساتھ وابستہ ہے' اس کو القیوم بھی اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ خود قائم و برقرار ہے۔ سب کو وہی اور اس کا ارادہ قائم وبرقرار رکھے' ٹھہرائے ہوئے اور تھامے ہوئے ہے' خیر یہ تو ''قیـــم'' کے اس قرآنی لفظ کی گویا لفظی تحقیق تھی' اب غور کیجئے اس لفظ کی معنویت کے اس پہلو پر جس کی وجہ سے اس خاص مقام پر وہ داخل اور شریک کیا گیا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' طبائع میں کج اور ٹیڑھ پیدا کرنے کے بعد ٹیڑھی باتوں کے اتار دینے میں کامیاب ہو جانا' اس میں شک نہیں کہ تجربہ کی اور سامنے کی بات ہے' کامیابی حاصل کرنے والے آج اسی راہ سے کامیابی حاصل کر رہے ہیں' مگر اسی کے ساتھ دوسری بات بھی جس کی طرف میرے خیال میں ''قیـــم'' کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے' یہ بھی تو دور کی نہیں بلکہ قریب کی ایسی بات ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا' آخر ہم ہوں یا آپ کیا یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ وہ سارے ''اعوجاجی'' خرافات اور دجالی نظریات جن کا چرچا دنیا میں آج پھیلا ہوا ہے۔ تعمیر کیساتھ ہی خرابی کی صورتیں بھی کتنی سرعت کے ساتھ ان میں مضمر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مشرق میں پرانے اذکار رفتہ مسئلہ کو دقیانوس کی طرف منسوب کر کے کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ تو دقیانوسی خیال ہے' دقیانوس بے چارہ خدا ہی جانتا ہے' کتنے ہزار سال پہلے دنیا کا بادشاہ ہوا تھا' مگر آج عصری نظریات کی دقیانوسیت کے لئے کون نہیں جانتا کہ غریب ملکہ وکٹوریہ کے عہد کی طرف منسوب کر کے کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ تو ''وکٹورین ایج'' یعنی عہد وکٹوریہ کی بات ہے' حالانکہ ولادت کے نہ سہی مگر اس ملکہ کی موت کے زمانے کو پانے والوں کی تعداد کروڑہا کروڑ کی تعداد میں ابھی زندہ ہے ''قیـــم'' کے برعکس' بے ثباتی کی اس خصوصیت کیلئے اس سے زیادہ اعترافی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے ع مردہ زایند از بطون امہات

یہی دجالی عہد کے نظریات کا سب سے بڑا طرائے امتیاز ہے' کلیات تو کلیات جن کی بنیاد

صرف تخمینی ٹٹوں یا ان تیروں پر عموماً قائم ہے جنہیں چلانے والے اندھیرے میں چلاتے رہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے دیکھے بھالے جزئیات مثلاً آدمی کے لباس کا مسئلہ کہ سوچ سمجھ کر آرام و آسائش، زیب وزیبائش کے پہلوؤں کا لحاظ کر کے اس کی وضع قطع متعین کی جاتی ہے، مگر سنتے ہیں کہ بسا اوقات بازار سے گون یا ٹوپی، یا اسی قسم کی کوئی چیز خریدنے والوں کو دیکھا گیا ہے کہ گھر کی طرف بھاگے یا بھاگی چلے یا چلی جارہی ہیں تا کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس کو استعمال کر لیں، ورنہ گھر پہنچنے تک ممکن ہے کہ اس خاص لباس کا فیشن اور چلن باقی نہ رہے۔

جن سیمابی بے قراریوں پر ''تمدن جدید'' اور ''دانش نو'' کی بنیاد قائم ہے اس کی یہ کتنی دلچسپ مثال ہے، ممکن ہے کہ یہ لطیفہ ہو مگر زود فربہی اور زود لاغری کے اس خصوصیت کے اظہار کی یہ بہت ہی اچھی تمثیل ہے، بعض کارٹونی تصویروں میں اسی لطیفہ کو مصور کر کے دکھایا گیا تھا، میں نے اس کو دیکھ کر کہا کہ عہد دجالیت کے صرف لباسی جزئیات ہی کا یہ حال نہیں ہے بلکہ دجالیت کا سارا فلسفہ، سارا تمدن، دھوپ، چھاؤں کا فلسفہ اور دھوپ، چھاؤں کا تمدن ہے، اس کے نیچے پناہ ڈھونڈنے والوں کو نہ دھوپ ہی سے استفادہ کا موقع میسر آسکتا ہے اگر وہ دھوپ کھانا چاہتے ہوں، اور نہ چھاؤں میں بیٹھ کر سکون واطمینان کی چند سانسوں کی آرزو پوری ہوسکتی ہے۔

''قیـــم'' کے مقابلے میں ''غیر قیـــم'' ہونا اس فلسفہ یا تمدن کی یہی خصوصیت، اس پیچ وخم یا ٹیڑھ اور کجی کے راز کی غمازی کر رہی ہے جو ''دجالی'' یا ارتقائی تمدن'' کی ہر شاخ اور ہر شعبہ کی رگوں اور ریشوں میں رواں دواں ہے۔ ''ارتقا'' نام ہی اس کا ہے کہ ہر آنے والے دن میں گزرے ہوئے کل کی مسلمہ (مانی ہوئی) بات غلط ثابت ہو جائے، کل تک جمہوریت کا نظام انسانیت کے ارتقاء کا آخری نقطہ عروج تھا، لیکن آج سرمایہ داری کے رسوا کن طوق کو گلے میں لٹکائے ہوئے گلی کوچوں کے بچوں کی تالیوں کا وہ نشانی بنا ہوا ہے، اور اب انسانیت کا ''فردوس گم گشتہ'' باور کرایا جارہا ہے کہ اشتراکی نظام میں مل جائے گا جن کو یہ فردوس مل چکی ہے، کہتے ہیں کہ ان کو سب کچھ مل گیا ہے جس کی تلاش میں آدم کی اولاد سرگشتہ پھر رہی تھی، لیکن یہ سب کچھ تو ہم سن رہے ہیں دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے، کہ جو کچھ سنا جارہا تھا وہی دکھایا بھی گیا یا نہیں؟ جوانی کے بعد بڑھاپے کا، صحت کے بعد مرض کا، زندگی کے بعد موت کا، صلح کے بعد

جنگ کا' سیرابی اور خوش حالی کے بعد قحط اور خشک سالی کا' امن و عافیت کے بعد وباؤں اور جنگوں کے مصائب کا' الغرض یہ یا اسی قسم کے سارے خطرات جو بنی آدم کی زمینی زندگی کے لئے روح فرسا دھمکیاں بنی ہوئی ہیں کیا ان سب کا سدباب ہو گیا؟ جب تک اس کی بشارت نہیں سنائی جائے گی' کیا جنت سے نکالا ہوا انسان صرف اس سے خوش ہو جائے گا کہ مرض کے بعد دوا کا' بھوک کے بعد کھانے کا' پیاس کے بعد پانی کا' پھٹنے کے بعد کپڑوں کا' بیمار پڑنے کے بعد دوا کا' مرنے کے بعد کفن و دفن کا' اس کے نظم کر دیا جائے گا؟ کسی نہ کسی شکل میں یہ سب کچھ تو اب بھی اس کو میسر ہے' لیکن زندگی کے چوبیس گھنٹوں میں اب بھی اس کے غم کی گھڑیاں مسرت کی گھڑیوں سے زیادہ ہیں۔ اور جب تک یہ سارے خطرات زمین کے اس کرے پر اسے دھمکاتے رہیں گے' اس وقت تک غم کے اوقات کا یہ اوسط مشکل ہی سے ختم تو کیا معنی' شاید کم بھی نہیں ہو سکتا۔

خیر میں کیا کہنے لگا عرض یہ کر رہا تھا کہ "قیم" کا یہ لفظ جس سے بندے پر نازل ہونے والی "الکتاب" کے مشتملات و تعلیمات کی خصوصیت ظاہر کی گئی ہے لازوال' غیر فانی حقائق کا یہ وہ مجموعہ ہے' تاریخ کے نامعلوم عہد سے جس پر انسانیت کی تعمیر و ترقی کی بنیاد قائم کرنے کی دعوت دی گئی' نوح نے بھی انکی طرف بلایا اور ابراہیم نے بھی' موسیٰ نے بھی اور عیسیٰ نے بھی علیہم السلام۔ سارے "النبیون" اور اللہ کے رسولوں نے ہر عہد اور ہر زمانہ میں' ہر بستی کے رہنے والوں کو ان ہی کی طرف پکارا جس کے پاس کچھ نہیں ہے مگر سب کچھ کے پانے اور حاصل کرنے کی فطری آرزو اپنے اندر رکھتا ہے' چاہے کہ وہ آگے بڑھے اور جس کے پاس سب کچھ ہے' اسی سے کچھ کچھ پانا چاہتا ہے' پاتا چلا جائے۔ پہلوں کو جو "الکتاب" دی گئی اس میں بھی یہی تھا اور اسی "الکتاب" کی آخری شکل میں بھی اسی کی صلائے عام دی گئی ہے۔ [1]

---

[1] اشارہ سورۂ اعلیٰ کی آخری آیتوں کی طرف ہے بل توثرون الحیوۃ الدنیا والاخرۃ خیر وابقی ان ھذا لفی الصحف الاولی صحف ابراھیم و موسی (غ م)

سادگی کی جگہ پیچیدگی:

بہر حال ”وَلَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجًا۔“ (نہ رکھی اس میں کسی قسم کی کجی) کی سلبی یا منفی خصوصیت اور اسی کے ساتھ قَيِّمًا ُ لازوال ُ غیر فانی ُ امٹ اور اٹل ہونے کے ایجابی و مثبت خصوصیت ُ قانون نزول کے تحت ناقصوں کو ساحل کمال تک پہنچانے کے لئے وجود کامل۔ یا الحمد والے اللہ کی طرف سے ”الکتاب“ یعنی زندگی کا جو دستور العمل دیا گیا ہے اسی دستور العمل کی مذکورہ بالا دونوں منفی و مثبت یا سلبی و ایجابی ایسی دو خصوصیتیں ہیں کہ ان کی روشنی میں ”دجالی ادبیات“ کی تاریکیاں خود بخود نمایاں ہو جاتی ہیں ُ آپ جائزہ لیتے چلے جایئے ُ واضح ہوتا چلا جائے گا کہ سیدھی سادی باتوں تک عہد دجل میں پیچیدہ ترین راہوں سے پہنچے اور پہنچانے کی کوشش یہی اس کے عہد کا امتیازی وصف ہے۔ قلب کی راحت ُ دل کا سکون ُ جو مٹی کے کسی لوٹے میں بھرے ہوئے پانی سے وضو کر لینے اور وضو کے بعد کسی کے قدموں پر سر ڈال دینے سے جس وقت چاہا جائے حاصل کیا جا سکتا ہے ُ مگر غم غلط کرنے کے اسی مقصد کے لئے دیکھئے کروڑہا روپے کی سینمائی تصویریں تیار ہو رہی ہیں ُ اربوں کی لاگت سے ملک کے طول و عرض میں ”تماشا گھروں“ کا جال بچھا دیا گیا ہے ُ اور ملک نہیں ُ ایک ایک شہر بلکہ اب تو قصبات تک کے باشندوں کی کمائی کا معقول حصہ دل بہلانے کے ان فضول تماشوں میں بھسم ہو رہا ہے اور پھر بھی وہ خنکی جو وضو کے مفت پانی اور بغیر کسی ٹیکس کے ”لاہوتی دربار“ کی باریابی سے دلوں کو میسر آ سکتی ہے اور آ رہی ہے ُ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ خنکی اور ٹھنڈک کی اس کیفیت کو اس سارے جال جنجال سے حاصل کرنے میں آپ قطعاً کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح امن و امان کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے اخلاقی تصحیح کی ضرورت کا احساس آج بھی کیا جا رہا ہے جیسے پہلے کیا جاتا تھا ُ لیکن اسی غرض کو حاصل کرنے کے لئے پیچ و غم کی ٹیڑھی ُ ترچھی راہیں اختیار کی گئی ہیں ُ آئندہ دنیا میں جو نسلیں پیدا ہونے والی ہیں پیدا ہونے سے پیشتر ان کو ان کے خیال ُ صرف خیال کو دماغوں میں ابھار ابھار کر دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ موجودہ نسلوں کو اپنی اخلاقی غلطیوں کا جواب ان ہی آئندہ پیدا ہونے والی نسلوں کو دینا پڑے گا ُ جب جواب دینے والے دنیا سے ناپید

ہو جائیں گے' کبھی تاریخ کے فن کو پیشہ بنانے والے یعنی مورخین سے ڈرایا جاتا ہے کہ جب وہ کتابیں لکھیں گے یا مدرسوں میں سبق پڑھائیں گے تو تمہارا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں کریں گے' کیسی عجیب بات ہے کہ امید باندھی جاتی ہے کہ اخلاقی بدکاروں کو ان دھمکیوں کے دباؤ سے دبا لیا جائے گا۔ کامیابی کی یہ راہ ان کو سیدھی راہ نظر آئی اور پیدا ہونے والوں کو اپنے پیدا کرنے والے خالق کے سامنے کھڑا کر کے جواب دہی کی ذمہ داری بنی آدم میں جو بھاری جاتی تھی' یہی راہ ان کو ٹیڑھی راہ دکھائی دے رہی ہے۔ وہم اور صرف وہم سے زیادہ کے سوا جو گویا کچھ نہیں ہے باور کرایا جا رہا ہے کہ وہی واقعہ ہے اور واقعہ ہی کو وہم ٹھہرایا جا رہا ہے۔ کسی معاوضہ کے بغیر جس نے وجود بخشا' وجود کے کمالات بخشے' اسی بخشنے والے ارحم الراحمین' **علی کل شئی قدیر** کی رحمتوں اور دستگیریوں پر بھروسہ کرنے والے وہم کے شکار ٹھہرائے گئے' مگر وہم کے ان ہی الزام لگانے والوں کی زبانوں سے جب یہ یا اسی قسم کے فقرات نکلتے ہیں کہ میں تو فطرتاً رجائی پیدا ہوا ہوں' پرامید رہنا اور مستقبل سے مایوس نہ ہونا' یہی میری فطرت ہے مگر جب پوچھا جاتا ہے کہ اس رجا اور امید کی بنیاد کیا ہے؟ تو پھر ان کی ''اعوجاجی'' ذہنیتوں اور ژولیدہ الجھی ہوئی توجیہوں کی گتھیاں اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ سننے والا مشکل ہی سے اپنی ہنسی روک سکتا ہے اور میں کہاں تک گناؤں' مجھے تو دجالی زندگی کے ہر پہلو میں ''پیچا پیچ'' اور گرہ در گرہ کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آیا' عدالت ہو یا انصاف' علاج ہو یا معالجہ' تعلیم ہو یا تعلم یا اسی قبیل کی کوئی اور چیز ہو' پہلی نظر میں اس کی سب سے بڑی خصوصیت وہی ''عوج'' سامنے آتی ہے اور ''پیچا پیچ'' کا گورکھ دھندا سامنے آ جاتا ہے۔

اور یہ تو عرض ہی کر چکا ہوں کہ ''قانون ارتقاء'' کو بنیاد بنا کر زندگی کا جو دستور العمل بھی مرتب کیا جائے گا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آج جو مانا گیا ہے کہ سچ ہے' بلکہ سچائی صرف اسی میں منحصر ہے' کل تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہی جھوٹ اور صرف جھوٹ تھا' ورنہ جو کچھ آج مانا جا رہا ہے اگر کل بھی وہی مانا گیا تو ارتقاء کا یہ لفظ ہی بے معنی اور بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔ گویا ارتقائی اصول پر ساحل مراد تک پہنچانے کے لئے انسانیت کے آگے نجات کی جو ''کشتی'' بھی پیش کی جاتی ہے' اس کی پیشانی پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ ساحل تک پہنچانے کا سوار ہونے والوں کو یقین نہیں

دلایا جا سکتا بلکہ ممکن ہے کہ منجدھار میں پہنچ کر وہی چیز جس کا نام آج نجات کی کشتی ہے کل وہی ''گرداب بلا'' اور ''لطمہ موت'' کی شکل اختیار کرے اور اسی کے مقابلہ میں دوسرا جہاز بھی کھڑا ہوا ہے جس میں ضمانت دی جاتی ہے کہ سیدھی راہ سے لے جانے والوں کو لے جائے گا اور قطعی طور پر ہر ایک کو ڈگمگائے بغیر ساحل پر پہنچا دیا جائے گا۔ اس ضمانت نامے پر تاریخ انسانی کے ہر دور کی برگزیدہ ترین ہستیوں کی تصدیقی مہریں ثبت ہیں' نوح کی' ابراہیم کی' موسیٰ کی' عیسیٰ کی' محمد ﷺ کی' غرض سارے انبیاء علیہم السلام اور بنی آدم کے سارے رہنماؤں کے دستخط روشن حروف میں اس ضمانت نامے پر جگمگا رہے ہیں' آپ کو اختیار ہے کہ اپنی نجات کے لئے ان دونوں میں سے جس کشتی کا چاہے انتخاب کر لیجئے اور یہ امید کی جاتی ہے کہ خواص کے ساتھ عوام بھی اگر غور کریں گے تو مستفید ہو سکتے ہیں۔

قرآنی انتباہات:

الکہف کی پہلی سطر یا پہلی آیت کے متعلق جو کچھ بھی ادا کر دیا گیا ہے اسی پر قناعت کر کے آیئے اب آگے بڑھئے لِتُنْذِرَ (تا کہ دھمکائے) کے لفظ سے دوسری آیت کا آغاز کیا گیا ہے اور بجائے کنائے اور اشارے کے نسبتاً زیادہ واضح اور صاف لفظوں میں قرآن کا یہ بیان شروع ہوتا ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا دھمکی سے اس بیان کی ابتدا کی گئی ہے۔ قدرتی طور پر تین ہی سوالات اس کی دھمکی کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں یعنی

۱۔ کس چیز کی دھمکی دجالی فتنے سے تعلق رکھنے والی اس سورۃ میں دی گئی ہے؟

۲۔ کیا دھمکی عام ہے' یا کسی خاص طبقہ اور خاص قسم کے صفات و احساسات رکھنے والوں کی طرف اس دھمکی کا رخ ہے؟

۳۔ اگر عام نہیں بلکہ دھمکی کا رخ کسی خاص طبقہ کی طرف ہے اور یہی واقعہ بھی ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن کی طرف دھمکی کا رخ ہے ان کی خصوصیات کیا ہیں اور جن کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اس کی دھمکی اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج سے ان کو ڈرنا نہ چاہئے

ان کو کن امتیازی اوصاف سے پہچانا جا سکتا ہے؟

ان ہی تینوں سوالوں کا جواب بعد کی آیتوں میں دیا گیا ہے۔ اب میں آپ کے سامنے قرآنی الفاظ کی روشنی میں ان ہی تینوں سوالوں کے جوابوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

کس چیز کی دھمکی دی گئی ہے؟ یہی پہلا سوال تھا دجالی فتنہ کی جن خصوصیتوں کو بیان کر چکا ہوں ذرا ان کو دماغ میں تازہ کر لیجئے میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ کو بھی حیرت ہوگی کہ تیرہ سو سال پیشتر سرزمین عرب کی بیابانی آبادی میں اس پیشین گوئی کا اعلان الہامی امداد کے بغیر کیسے ممکن تھا؟ کلیدی لفظ جس کے سمجھ لینے کے بعد واقعہ خود آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا وہ بـأس کا لفظ ہے' یوں تو لغت میں مثلاً قاموس کے فارسی ترجمہ "منتهی الارب" میں "بأس" کے لفظ کو لکھ کر حسب ذیل معانی درج کئے ہیں' یعنی "بیم و عذاب وسختی وقوت' حرب و دلیری" مگر سارے معانی جو اس لفظ کے نیچے درج کئے جاتے ہیں قدر مشترک ان کا اگر نکالا جائے تو وہ یہی ہو سکتا ہے کہ فطرت انسانی میں ناگواری جن حالات و واقعات سے پیدا ہوتی ہے منجملہ دوسرے الفاظ کے عربی میں اس کی تعبیر "بـأس" بھی ہے مگر یہ تو "بـأس" کی لغوی تشریح ہے قرآن میں ایک سو سے زائد مقامات میں اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے' مثلاً عرب کے یہود کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ "بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ" یا عذابوں کے متعلق اس کا اعلان کرتے ہوئے کہ کبھی وہ اوپر سے آتے ہیں اور کبھی نیچے سے' تیسری شکل اسی عذاب کی یہ بھی بتائی گئی ہے کہ مختلف ٹکڑیوں میں بانٹ کر "يُذِيْقُ بَأْسُهُمْ بَأْسَ بَعْضٍ" کا منظر قدرت کی طرف سے قائم کر دیا جاتا ہے' جس کا مطلب یہی ہے کہ ایک کی چوٹ دوسرے کو لگائی جاتی ہے۔

اسی طرح سورۃ البقرہ میں صبر کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے "حِيْنَ الْبَأْسِ" بھی فرمایا گیا ہے۔ الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے مقامات میں "بـأس" کے لفظ کی جو تفسیر کی گئی ہے اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حرب وقتال' جنگ و جدال کی وجہ سے جو دکھ اور تکلیف لڑائی کے ہر فریق کو پہنچتی ہے قرآن اسی دکھ اور تکلیف کو "بـأس" کہتا ہے۔ گویا یہ ایک قسم کا قرآنی محاورہ ہے اس محاورہ کو پیش نظر رکھئے' اب سوچئے آگے کے ان قرآنی الفاظ کو یعنی فرمایا گیا ہے۔

"لِيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ"

''تا کہ دھمکائے باس شدید سے جو لدنی ہے۔''

''بـأس'' کا مفہوم تو متعین ہو ہی چکا' جو جنگ اور جنگ سے پیدا شدہ مصائب اور تکلیفوں کی تعبیر ہے' آگے ''شَدِيْدًا'' کی قید کا اضافہ کیا گیا ہے جس کا مادہ شدت ہے اور شدت سختی کو کہتے ہیں معلوم ہوا کہ جنگ اور اس کے لائے ہوئے مصائب جن کی دھمکی دی گئی ہے وہ معمولی نہ ہوں گے اور بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی ہے بلکہ شدید کے بعد ''مِن لَّدُنْه'' کے الفاظ ہیں' جیسے علم کی قرآن کی رو سے دو قسمیں ہیں' یعنی ایک قسم علم کی تو وہ ہوتی ہے جسے تعلیم کے مقررہ طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے اور دوسری قسم علم ہی کی ایک یہ بھی سمجھی جاتی ہے جو عالم اسباب کے توسط کے بغیر براہ راست حق تعالیٰ کے حضور سے عطا کیا جاتا ہے اسی دوسری قسم کا نام اردو میں بھی ''علم لدنی'' مشہور ہو گیا ہے۔ بظاہر یہ محاورہ اسی سورۂ کہف کے دوسرے مقام سے ماخوذ ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات جس شخص سے ہوئی تھی سمجھا جاتا ہے کہ ان کا نام خضر علیہ السلام تھا ان ہی کی دوسری خصوصیتوں کے ساتھ ایک خصوصیت یہ بھی بتائی گئی ہے۔

وَعَلَّمْنٰهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا۔

''اور سکھلایا ہم نے اس کو (یعنی خضر علیہ السلام) کو اپنے حضور سے علم۔''

بہر حال ''بـاس شـدیـد'' کے ساتھ ''مـن لـدنـه'' کا اضافہ دھمکی میں جو کیا گیا ہے' بغیر کسی تاویل کے اس کا یہی مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ شدید جنگ جس کی یہاں دھمکی دی گئی ہے اسباب وعلل سے بالاتر ہوگی اور براہ راست قدرت کی طرف سے ایسے ''مـن لـدنـی'' حالات پیش آئیں گے کہ اسباب کی راہ سے مقابلہ کرنے والوں کے سارے عقلی داؤ پیچ اور فکری تگ و دو' ذہنی ادھیڑیں سب کے سب بیکار ہو کر رہ جائیں گے' کیونکہ اسباب کی راہ سے تو ان ہی چیزوں کا مقابلہ ممکن ہے جو اسباب ہی کی راہوں سے پیدا ہو رہی ہوں' لیکن ''من لدنی'' قانون کے تحت قدرت کا ہاتھ جب چیزوں کو پیدا کرلے گا ان کا مقابلہ بھلا کون کرسکتا ہے۔ ❶

---

❶ بلکہ قرآن کی دوسری سورۃ جس کا نام سورۃ ''دخان'' ہے اس کو بھی پڑھئے' اس میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ لوگ جب خدا کے متعلق شک میں کھیلنے لگیں گے اور ان کے مابین جو کھلا ہوا رسول یعنی ''رسول مبین'' آیا تھا جو تاریخی عہد کا رسول تھا' مشرق والوں سے بھی اسی قدر قریب تھا جتنا مغرب والوں (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

مُسبّب کا انکار ذہنی پراگندگی کا موجب ہے:

اسباب کی راہ سے جب تک چیزیں پیدا ہوتی رہتی ہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا' ان کا مقابلہ اسباب کی راہ سے ممکن ہے جو صرف اسباب ہی اسباب کے قائل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ لامحدود اسباب کی راہ سے سر نکالنے والے حوادث جو اس دنیا میں پیدا ہوتے رہتے ہیں' ان کی انتہا کسی مسبب واحد پر نہیں یعنی کثرتوں سے بھری ہوئی اس دنیا کا شیرازہ بند خالق' **حی و قیوم** کا ارادہ قاہرہ نہیں ہے' بلکہ اسباب وعلل میں بٹی اور بکھری ہوئی یہ دنیا ان کے نزدیک واقع میں بھی بٹی اور بکھری ہی ہوئی ہے۔ ان بے چاروں کا تو سارا دارومدار ہی اسباب ہی کے الٹ پھیر پر ہے۔ اس سبب سے نہیں تو اس سبب سے' اس راہ سے نہیں تو اس راہ سے' مقاصد واغراض کو تلاش کرنا' اسی پر پاپڑ بیلتے ہوئے کامیابی پر کبھی خوش ہونا' ناکامی میں جھنجھلانا' اسی چکر میں اپنی زندگی وہ ختم کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو گویا وہ ایک ایسے بیابان میں پاتے ہیں جس میں طرح طرح کے درندے چھوٹے ہوئے ہیں' ان کو کچھ نہیں معلوم کہ ان درندوں کو وہ شکار کریں گے یا خود ان درندوں کے شکار ہو جائیں گے۔ گویا باگ ڈور توڑ کر جیسے گھوڑا چھوٹ گیا ہے اور بگٹٹ

(گزشتہ سے پیوستہ) سے نزدیک تھا' اس کی اندرونی و بیرونی زندگی کے دونوں پہلو سب کے سامنے تھے مگر باوجود اس کے اسی ''رسول مبین'' پر معلم و مجنون ہونے کا الزام لگایا گیا یعنی یہود و نصاریٰ وغیرہ مذہبی اقوام کے علماء اور کتابوں سے اس نے کچھ سیکھ لیا ہے' اور یہ کہ دماغی فتور مثلاً صرع (مرگی) وغیرہ جیسے امراض میں مبتلا ہے۔ گویا تحقیقات کے نام سے ''رسول مبین'' کے متعلق یورپ کی لائبریریوں کو جن کتابوں سے بھر دیا گیا ہے' قرآن نے مذکورہ بالا دو لفظوں میں خلاصہ کر دیا ہے۔ بہر حال ان دونوں بہتانی جرائم کی پاداش میں بھی اعلان کیا گیا ہے کہ بالآخر **یوم نبطش البطشة الکبری انا منتقمون** (اس دن ہم پکڑیں گے بڑی پکڑ کے ساتھ اور اس دن ہم انتقام لینے والے ہوں گے) جو بظاہر ''من لدنی'' عذاب الٰہی کی ایک تعبیر معلوم ہوتی ہے۔ اسی سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے **بطشہ کبریٰ** (بڑی پکڑ) سے پہلے لوگوں پر ''**دخان مبین**'' یعنی دھواں کا عذاب آئے گا۔ یہ ''**دخان مبین**'' کیا ہے؟ مفسرین کسی واضح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے۔ قیامت سے اس دخانی عذاب کا تعلق اس لئے نہیں ہو سکتا کہ ٹلتا رہے گا۔ فرمایا گیا ہے۔ **انا کاشفوا العذاب** (ہم عذاب کو ٹالنے والے ہوں گے) اب اسی کے ساتھ سوچئے کہ عہد جدید کی لڑائیوں میں سارے آتشیں آلات جو استعمال ہوتے ہیں سب میں دخان یعنی دھواں ہی مشترک جز ہے' ہیروشیما میں ایٹم بم جو گرایا گیا تھا تو کہتے ہیں کہ چالیس میل طویل دھواں پیدا ہوا اور قطر بھی اس دھویں کا میلوں کا تھا۔ **واللہ اعلم بالصواب**۔

بھاگا جاتا ہو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس سے ٹکرلے گا اور کس کی کھوپڑی اس کے ٹاپوں سے چکنا چور ہو جائے گی۔ اسی قسم کی ذہنیت میں وہ مبتلا رہتے ہیں عالم کثرت کے متعلق انتشار و پراگندگی کا جو فلسفہ ان کے دل ودماغ پر مسلط رہتا ہے اس کا یہ لازمی اور منطقی نتیجہ ہے تاہم ایک سبب ناکامی کا تجربہ ان کے اندر دوسرے سبب کی آزمائش کا خیال مسلسل چونک پیدا کرتا رہتا ہے یہی رحمت کا ایک پہلو ہے جس سے اپنے منکروں کو بھی ارحم الراحمین محروم نہیں فرماتا ہے۔

اسی طرح جو عالم کی ساری کثرتوں کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ قادر مطلق کی آخری مشیت اور ناقابل شکست لاہوتی ارادے کے ساتھ ان کا نظم وابستہ ہے اس کی پیدا کی ہوئی دنیا میں کوئی چیز اس وقت تک شریک ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس عالم کے پیدا کرنے والے خالق کردگار کا ارادہ اس کو پیدا کر کے اپنی آفریدہ اس دنیا میں شریک ہونے کا موقع اس کو عطا نہ فرمائے۔ الغرض گوناگوں کثرتوں میں بظاہر الجھی ہوئی نہیں بلکہ سب سے بڑی سلجھانے والی قوت کے ساتھ بندھی چلی آرہی اور بندھی چلی جارہی ہے اس یقین اور ایمان والے اس قسم کی ذہنی پراگندگیوں میں تو مبتلا نہیں رہتے مگر جب تک خالق کا واحد ''ارادہ'' ان ہی گوناگوں اسباب وعلل کے قالب میں چیزوں کو پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس وقت تک ان کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ خدائی نعمتوں کو اسباب کے ان ہی مختلف سانچوں اور قالبوں میں ڈھونڈتے ہیں قالب میں نہ ملے تو دوسرے قالب کی طرف توجہ کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مشہور قول:

من قدر الله الى قدر الله۔

''ہم خدا کی تقدیر سے خدا ہی کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں۔''

اس کا یہی مطلب ہے مرض بھی خدا ہی کی تقدیر سے ہوتا ہے اور مرض کے ازالہ کی خاصیت دواؤں میں جو پائی جاتی ہے یہ بھی خدا ہی کی تقدیر ہے۔''

بہر حال مومن ہو یا غیر مومن جب تک ''مسبب'' براہ راست سامنے نہ آجائے اسباب کے تجربے کی راہیں دونوں پر کھلی رہتی ہیں لیکن سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ''بـاس شـديـد'' کاظہور ''مـن لـدنـی'' رنگ میں آدم کی اولاد کے سامنے ہونے لگے کہ اسباب کے ترکش کے سارے تیر اس وقت بے کار ہو جائیں گے جن کے نزدیک عالم اسبابی نظام کسی ''واحد مسبب''

کے ارادے کے ساتھ وابستہ نہیں ہے' ان کے تجربوں کا سلسلہ تو شاید اس وقت بھی باقی رہے گا' لیکن ان کے یہی تجربات ہی بتاتے چلے جائیں گے کہ

جتنا پھڑکو جال کے اندر
جال گھسے کھال کے اندر

یہ "من لدنی" عذاب کا دور ہوگا اس وقت العیاذ باللہ

"من لدنی" کے اعلان کے ساتھ وہ سامنے آ جائے گا اور ثابت کرتا چلا جائے گا کہ یہ پھسپھسے عنکبوتی تاروں سے بھی زیادہ کمزور اسباب اب کیا کام دیں گے' مگر اسباب وعلل میں جکڑی ہوئی اس دنیا میں جن کی نظر "مسبب" کی طرف سے نہیں ہٹی ہے کیا خود مسبب" کے سامنے آ جانے کے بعد وہ بھی اسی طرح اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کریں گے' جیسے اخیر "مسبب" والے اسباب میں الجھے ہوئے لوگ اپنے آپ کو بے سہارا پائیں گے؟

"من لدنی باس شدید" کی دھمکی کے بعد اسی سوال کا جواب

وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ۔

"اور بشارت دیتا ہے ان ماننے والوں کو جو بھلے کام کرتے رہتے ہیں"

دیا گیا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ براہ راست "مسبب" کا سامنے آ جانا' اس میں ان کے لئے دہشت ہے جو شروع ہی سے

ہر لحظہ بہ شکل دگر آں یار برآمد

کے یقین پر اپنا قدم جمائے ہوئے ہیں' اسباب کی راہ سے جب چیزیں پیدا ہو رہی تھیں تو ان کو بھی وہی پیدا کر رہا تھا اور آج اگر وہ اسباب کے حجاب کو اٹھا کر سامنے آ گیا ہے تو جو کچھ بھی پیدا ہو گیا اسی کے ارادے' اسی کے حکم' اسی کے اذن' سے پیدا ہوگا۔ یہ "المومنین" کا گروہ ہو گا۔ انہوں نے اس کو پہچانا اور مانا جسے خالق تعالیٰ نے اپنی مرضی سے آگاہ فرمایا تھا اور حکم دیا تھا کہ اسی کی "مرضی" کے مطابق زندگی بسر کرنے کا مطالبہ ان لوگوں سے کیا جائے جو ہماری پیدا کی ہوئی دنیا میں رہتے ہیں اور خود وہ بھی ہمارے ہی پیدا کئے ہوئے ہیں' اسی کا نام "ایمان" ہے اور خالق کی ظاہر کی ہوئی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام "عمل صالح" ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ''بے ایمانی'' صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ خدا کا انکار کیا جائے بلکہ ''خدا'' کو مان کر' خدا کی مرضی کی تلاش کو غیر ضروری ٹھہرانا یا خدا کی بخشی ہوئی آگاہی سے باغی ہوکر خود اپنے تراشیدہ' بافیدہ خیالات وساوس کے متعلق یہ سمجھنا کہ یہی ''خدا کی مرضی'' ہے اور اپنی ہی من مانی باتوں کی پیروی کے متعلق سمجھنا کہ ہم خدا کی مرضی کی پیروی کررہے ہیں ''بے ایمانی'' کے دائرے میں یہ ساری چیزیں داخل ہیں۔ پس تباہی اور بربادی اگر ہے تو صرف ان ہی کے لیے ہے جنہوں نے ایمان کی راہ کو چھوڑ کر ''بے ایمانی'' کا راستہ پکڑا اپنے آپ کو مسبب کی مرضی کے مطابق بنانے کا جو موقع ان کو دیا گیا تھا' اس قیمتی موقع کو کھو دیا۔

بہر حال اسباب کا پردہ ہٹا کر براہ راست ''مسبب'' ہی سامنے آجائے تو اس وقت اس کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ اپنی ہر خواہش اور ہر احساس کے مخالف اگر چاہیں اور وہی ''بأس شدید'' کے رنگ میں ان کے ظاہر و باطن کو محیط ہو جائے اور اسی کی آگ ان کے اندر اور باہر کو پکڑ لے تو جو کچھ انہوں نے کیا تھا خود سوچنا چاہیئے کہ اس کا انجام بجز اس کے اور کیا ہوتا؟

اہل ایمان کو عافیت کی بشارت:

خلاصہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کو جو ''مسبب'' کی مرضی سے آگاہ کرنے والے بزرگوں یعنی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو مان کر اسی کی مرضی کے مطابق جینے اور مرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں' قرآن نے اس ''من لدنی'' عذاب اور اس کے نتائج کی طرف سے قطعی طور پر نڈر اور بے خوف بنا کر یہ بشارت ان کو سنائی ہے کہ اب تو ''اسباب'' کا قصہ ختم ہو گیا' تم اب کیوں ڈرو بلکہ خوش ہو جاؤ کہ تمہاری سعی و عمل جس کا رخ مسبب ہی کی طرف تھا' اب اس کی قیمت تمہارے سامنے آئے گی۔ اسباب فانی تھے' اس لئے ان کے نتائج بھی فانی تھے' لیکن انسانی توانائیوں کے وہ نتائج جو غیر فانی طاقت کی مطابقت کی راہ سے پیدا ہوتے رہے' چاہئے کہ وہ بھی غیر فانی ہوں' اسی کی اطلاع

اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًاo مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًاo (الکھف: ۲ - ۳)

''بلاشک وشبہ ان کے لئے اجر حسن ہے' مگن رہیں گے اس میں ہمیشہ ہمیش''۔

کے الفاظ میں دی گئی ہے۔ یعنی حق تعالیٰ یا مسبب الاسباب کی مرضی کے مطابق جینے کی کوشش جس اجر و معاوضہ کو پیدا کرے گی' نہ ایسی چیزیں ہوں گی جو فطرت انسانی اور اس کے احساسات کے مطابق ہوں گی' اور اپنی اپنی کوششوں کے اس معاوضہ سے کوشش کرنے والے اس طرح مستفید ہوتے رہیں گے کہ استفادہ کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا بلکہ "اجـــــــراً" کے ساتھ "حسناً" کی صفت کا اضافہ جو کیا گیا ہے' یہ اضافہ بھی بلاوجہ نہیں ہے۔

ظاہر ہے' مادہ اس لفظ کا "حسن" ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی کا علم حاصل کر کے جو اس پر اور اس کے نتائج پر غیر متزلزل اعتماد اپنے اندر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے' اور خدا کی ظاہر کی ہوئی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عزم راسخ کر کے مر جانے کا قطعی فیصلہ کر چکے ہیں' وہ ایمان اور عمل صالح والی اس زندگی کے نتیجہ کو ایسی شکل میں اپنے سامنے پائیں گے جس کا سب سے بڑا نمایاں امتیاز حسن و جمال ہوگا' اور فطرت انسانی کا سچ پوچھئے تو سب سے بڑا مطالبہ یہی "حسن و جمال" ہے بھی۔

لہلہاتے ہوئے مرغزار' بہتے ہوئے پانی' ہرے بھرے باغ' کھلے ہوئے پھول' گدرائے ہوئے پھل' الغرض نباتی' حیوانی' انسانی یا اس سب کے سوا سارے کونی طبقات میں آدمی کی فطرت حسن ہی کی تلاش کرتی ہے' جمال ہی کی جستجو اس کی سرشت کا سب سے بڑا امتیازی سرمایہ ہے' جو نہ گدھوں میں پایا ہے اور نہ گھوڑوں میں' آخر بھینسوں کو بین باجے پر سر دھنتے کس نے پایا ہے؟ کس بکرے کو دیکھا گیا ہے کہ کسی "پیکر جمیل" کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا ہو؟ لب جو سبزہ زاروں کے کنارے پہنچ کر اس کے دل میں گدگدی پیدا ہوتی ہو۔ اجر کے ساتھ "حسن" کے لفظ نے ذہن کو تو ان ہی "جمالی مظاہر" کی طرف منتقل کر دیا' جن کی قرآنی تعبیر "الجنۃ" سے کی گئی ہے۔

قرآن کی وہی "الـجـنـۃ" جس میں فطرت انسانی کے سارے مطالبات کی تکمیل کی پوری پوری ضمانت کی گئی ہے' مگر کیا کیجئے کہ "دجالیت" کے اس عہد میں قرآن کی اس "انسانی جمعیت" کے متعلق پھیلا دیا گیا ہے کہ حیوانی مطالبات کی تشفی کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہے' یہ عیسائیوں نے پھیلایا ہے' جن کا عقیدہ ہے کہ جو آدمی بن کر پیدا ہوا ہے' ایمان و عمل صالح کی زندگی اسی آدمی کو سارے انسانی احساسات سے معرا کر کے فرشتہ بنا دیتی ہے۔ سچ پوچھئے تو عیسائیوں کی یہ "روحانی

جنت" فطرت انسانی کے لئے جزا کی نہیں سزا ہی کا قالب ہو سکتی ہے۔ ❶

قرآنی دھمکی کے مخاطب:

بہرحال "باس شدید" کی دھمکی کے بعد یہ بتاتے ہوئے کہ ایمان و عمل صالح کی زندگی گزارنے والوں کی طرف اس دھمکی کا رخ نہیں ہے' آئندہ جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس ترتیب کے ساتھ اُسے پڑھئے:

۱۔ "تا کہ دھمکائے ان لوگوں کو جنہوں نے کہا کہ اللہ نے صاجزادہ بنالیا"۔

۲۔ "نہیں ہے اس کا علم ان کو کچھ بھی' نہ ان کو ہے' اور نہ ان کے باپ دادوں کو ہے"۔

۳۔ "بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے"۔

۴۔ "نہیں بول رہے ہیں وہ مگر صرف جھوٹ"

۵۔ "تقریباً یہ لفظی ترجمہ ہے' قرآن کی ان آیتوں کا"۔

۱۔ وَيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا

۲۔ مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ

۳۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ

۴۔ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا۔

اور اب آپ کے سامنے سورۂ کہف کے ان ہی چار فقروں پر بحث کی جائے گی۔ عرض کر چکا ہوں کہ "من لدنی' باس شدید" (خود حضوری' سخت جنگ) جس دھمکی سے اس سورۃ کی گویا

---

❶ اسی کا نام ان لوگوں نے "روحانی جنت" رکھ دیا ہے' حالانکہ جنت کا مطلب یہی ہے کہ اپنے سارے فطری احساسات سے آدمی محروم ہو کر فرشتہ بن جاتا ہے' یعنی نہ کھانے کی لذت باقی رہے گی' نہ پینے کی' نہ جنسی میلانات ہی اس میں زندہ رہیں گے اور حسن و جمال سے سرور و نشاط کی کیفیت اس میں پیدا ہو گی' تو سوچنا چاہئے کہ آدمی کی سزا کی شکل آخر کیا ہو گی' میں تو نہیں سمجھتا کہ کوئی عیسائی بھی باوجود عیسائی ہونے کے اس سزا کو برداشت کرنے کے لئے آج بھی تیار ہو سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جنات و انہار اور اسی قسم کے مظاہر حسن و جمال سے اثر پذیری انسانی فطرت کی خصوصیت ہے۔ لہلہاتے ہوئے کھیتوں' بہتے ہوئے چشموں کو دیکھ کر مسرور ہوتے ہوئے کیا گدھوں یا بیلوں کو کسی نے کبھی دیکھا ہے؟

ابتداء کی گئی ہے' اس دھمکی کے متعلق یہ سوال کہ اس کا رخ آیا ساری انسانیت کی طرف ہے یا بنی آدم کے کسی خاص طبقہ کو اس دھمکی کا قرآن نے اپنا نشانہ ٹھہرایا ہے؟ دراصل اسی سوال کا جواب مندرجہ بالا آیات میں دیا گیا ہے جیسا کہ ظاہر ہے کہ خالق عالم کی طرف ولدیت کے عقیدے کا انتساب' یہ عیسائیوں کا صرف عقیدہ ہی نہیں ہے' بلکہ اسی ''اعتقاد'' پر عیسائیت یا کرسچینٹی کی بنیاد قائم ہے۔ عیسائیت کا اول بھی یہی ہے اور آخر بھی یہی ہے۔

اور آج عیسائیوں کی بڑی اکثریت یورپ وامریکہ میں آباد ہے۔ جس کا حاصل دوسرے لفظوں میں یہی ہوا کہ براہ راست رخ اس ''من لدنی ' باس شدید'' کا ان ہی ممالک اور ان کے آباد کاروں کی طرف ہے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ کسی مختصر لفظ مثلاً ''نصاریٰ'' یا اسی قسم کے الفاظ سے بھی اسی مفہوم کو قرآن ادا کر دیتا۔ مثلاً کہہ دیا جاتا کہ دھمکایا جاتا ہے نصاریٰ کو یا عیسائیوں کو' مگر باوجود شدید اختصار پسندی کے ان ہی عیسائیوں کی تعبیر مذکورہ الفاظ سے اس موقعہ پر جو کی گئی ہے' اور ساتھ ہی ان کے اس عقیدے کی تنقید میں ایک سے زیادہ فقرے جو قرآن نے یہاں استعمال کئے ہیں' کیا صرف یہ زور خطابت ہے؟ ایسے الفاظ ہیں کہ ان پر غور کئے بغیر صرف کہتے ہوئے کہ مراد ان الفاظ سے عیسائی ہیں' کیا یہ مناسب ہے کہ ہم بھی اسی طرح گزر جائیں جیسے عموماً لوگ گزر رہے ہیں؟

کسی آدمی کی کتاب کے ساتھ تو اس قسم کا سلوک شاید قابل برداشت بھی ہوسکتا ہے' مگر علام الغیوب' الحکیم الخبیر کے کلام کے ساتھ اس کی جسارت دلوں میں کیسے پیدا ہوتی ہے؟ میں تو اس کو سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں۔ یہ خالق عالم کا کلام' اسی خالق عالم کا کلام ہے جس کا کام عالم کا موجودہ نظام ہے۔ جب اس کے کام کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہی ہے کہ بظاہر دیکھنے میں خواہ وہ جتنا بھی مختصر اور چھوٹا نظر آئے' ایٹم کے حقیر ذرات ہی کیوں نہ ہوں؟ لیکن ان ہی ذرات میں سے کسی ذرے کو لے کر لوگوں نے جب سوچا' اور سوچنے کا جو حق تھا اسے ادا کیا' تو کون نہیں جانتا کہ اسی ایک ذرے سے قوت کا طوفان ابل پڑا' کیسا طوفان؟ جس قدرت کے کام کا یہ حال ہو انصاف شرط ہے' اسی عجیب وغریب نرالے کام والے کا کلام جب ہمارے سامنے آئے تو کیا اس کے ساتھ یہ انصاف ہوگا کہ جس مطلب کو چار مستقل فقروں

میں اس نے ادا کیا ہے' اسی مطلب کو ایک لفظ ''عیسائیوں'' یا ''نصاریٰ'' یا اسی قسم کے لفظ دو لفظ سے ادا کر کے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ خدا کے کلام کو ہم نے سمجھ لیا' اور اس کے سمجھنے کا جو حق تھا اسے ادا کر دیا مالکم کیف تحکمون۔

بہر حال اسی نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کی مندرجہ بالا ان چار آیتوں اور جن الفاظ پر یہ آیتیں مشتمل ہیں ان پر غور کیجئے۔

عیسائی عقیدہ اور لفظ ''ولد'':

وَيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا○

(اور دھمکائے ان لوگوں کو جنہوں نے کہا کہ اللہ نے ولد بنا لیا)

یہی پہلا فقرہ ہے' جن الفاظ میں عیسائیوں کے بنیادی عقیدے کی تعبیر قرآن نے اس مقام پر کی ہے' ان میں سب سے زیادہ کا مستحق میرے نزدیک ''ولد'' کا لفظ ہے' اردو میں عموماً لڑکا' بیٹا' بچہ وغیرہ کے الفاظ سے ''ولد'' کے لفظ کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے۔ شاید کچھ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ عربی ہی میں ابـــن کا دوسرا لفظ ہے۔ اس میں اور ولد کے اس لفظ میں معنی کے اعتبار سے کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے' گویا دونوں ہم معنی' مرادف الفاظ ہیں۔

مگر بادنی تامل واضح ہو سکتا ہے کہ ''ولد'' کا لفظ ولادت سے ماخوذ ہے' فارسی میں ''زادن'' اور اردو میں ''جننا'' جس کے معنی ہیں' جس کا مطلب یہی ہوا کہ جب کسی کو کسی کا ولد ہم ٹھہراتے ہیں' تو گویا ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ولد اس شخص سے جس کا ولد ٹھہرایا گیا ہے' ولادت اور زائیدگی' یعنی جننے کا تعلق رکھتا ہے' اب ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ زادن' یا جننے' یعنی ولادت کے اس لفظ کا اطلاق حال کی جس صورت پر کیا جاتا ہے اس کی واقعی حقیقت کیا ہوتی ہے؟

فرض کیجئے کہ زید ولد ہے' اور عمرو مثلاً زید کا والد ہے' ان دونوں کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ کیا عمرو والد اپنے ولد زید کا خالق ہوتا ہے یعنی زید کو کتم عدم' اور مطلق نیستی کے پردے سے نکال کر عمرو اس کو وجود عطا کرتا ہے؟ یقیناً واقعہ کی یہ قطعاً غلط تعبیر ہوگی۔ زید حوینہ کی شکل میں والد کے اندر نمودار ہوتا ہے اور عمرو جو والد ہے صرف اسی حوینہ یا نطفہ کو زید کی ماں کے رحم میں

منتقل کر دیتا ہے۔ ولد یعنی زید کی ذات اس کا وجود' وجود کے سارے لوازم وصفات' صفات کے ثمرات و نتائج' ان میں سے کسی چیز کو اپنے والد عمرو سے زید نہیں پاتا' بلکہ بقول شخصے والد کی حیثیت ولد کے حساب سے صرف ایک گزرگاہ کی ہوتی ہے' جس سے اپنی ہستی کی ایک خاص منزل (یعنی عالم حوینیت یا نطفیت) میں ولد کو گزرنا پڑتا ہے۔ نیست کو ہست کرنا اگر خلق کے یہی معنی ہیں تو اس معنی کی رو سے قطعاً اپنے ولد کا کوئی والد خالق نہیں ہوتا۔ اور خلق کا ترجمہ اگر گھڑنا کیا جائے' جیسے سنار سونے چاندی سے زیور گھڑتا ہے' یا پتھر پر تراش خراش کا عمل کر کے بت تراش مجسمہ یا بت وغیرہ بناتا ہے تو اس معنی کی رو سے بھی ولد اپنے والد کی مخلوق نہیں ہوتا کیونکہ ولد میں صفات و کمالات کا جو سرمایہ پایا جاتا ہے اس میں والد کو جیسا کہ سب جانتے ہیں قطعاً دخل نہیں ہوتا' ۔ والد بے چارہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ جس نطفہ کو اس نے منتقل کیا وہ مرد بن کر پیدا ہوگا یا عورت بن کر' اس کی ظاہری شکل وصورت کیا ہوگی اور باطنی صفات اس کے کیا ہوں گے؟ ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو وہ جانتا ہی نہیں ان ہی کو وہ غریب بنائے گا کیا؟

اور یہ پہلی قابل غور بات ہے جو ولد کے اس خاص لفظ سے سمجھ میں آتی ہے' حاصل جس کا یہی ہوا کہ ولد ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ ولد اپنے والد کا مخلوق نہیں ہے' کسی معنی اور کسی حیثیت سے مخلوق نہیں ہے۔

اب دوسری بات جو اسی ولد کے لفظ کا قدرتی اقتضاء ہے' اسے بھی سوچئے۔ آپ جانتے ہیں کہ گھوڑے سے جو چیز قانون ولادت کے تحت پیدا ہوگی وہ گھوڑا ہی ہوگی' اور جیسے گھوڑے سے ہاتھی نہیں گھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے' یہی حال ہر اس چیز کا ہے جس میں والد ولد ہونے کا تعلق پایا جاتا ہو۔ آخر بطخ سے چھچھوندر اور چوہے سے چیل' گدھے سے لومڑی کی ولادت کا تماشا کس نے دیکھا؟

یہ دونوں مقدمات جو بداہتۂ بغیر کسی تاویل وتوجیہ کے لفظ ولد سے سمجھ میں آتے ہیں' ان کو سامنے رکھ لیجئے اور اب سوچئے کہ اللہ یا خالق عالم "تَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا" کے لئے ولد ٹھہرانے والوں نے ولدیت کے اس دعویٰ کو اپنا عقیدہ بنا کر درحقیقت کیا مانا ہے اور اپنے دین و ایمان کی بنیاد انہوں نے کس چیز پر قائم کر رکھی ہے؟ یقیناً یہی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی

دوسری ہستی بھی ایسی ہے جو خدا کی مخلوق نہیں ہے' نہ خود خدا کی مخلوق ہے اور نہ اس کے صفات و کمالات خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں یہ توعقیدہ توحید کا سلبی پہلو ہوا یعنی ولد' ولد کی ذات' اس کی صفات وکمالات' اللہ تعالیٰ کے عمل تخلیق کے رہین منت نہیں ہیں یعنی خدا کے وہ مخلوق نہیں ہیں یہ تو پہلے مقدمہ کا اقتضا ہوا۔

اور دوسرا مقدمہ یعنی وہی بات کہ ہاتھی سے ہاتھی' اونٹ سے اونٹ ہی پیدا ہوتا ہے تو قانون ولادت کے تحت خدا سے (العیاذ باللہ) پیدا ہونے والا ولد بجز خدا ہونے کے اور کیا ہوگا؟ گھوڑے سے گھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے' اس کا مطلب جیسے یہ ہے اور اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے کہ پیدا ہونے والے ولد گھوڑے میں گھوڑا اپنے (فـــرسیة) کے ان سارے صفات ولوازم کا ظہور ضروری اور ناگزیر ہے جو اس کے والد گھوڑے میں پائے جاتے ہیں' پھر خدا کے لئے عقیدے کو منسوب کرنے کے کیا یہی معنی نہ ہوئے کہ خدائی کے سارے کمالات کے متعلق ہم یہ مان رہے ہیں کہ خدا کے اس ولد میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اور یہ ہے وہ مہیب و مدہش شکل اس عقیدے کی جس پر عیسائیت کی بنیاد قائم ہے' اس حقیقت سے سچ پوچھئے تو ولد ہی کا یہ لفظ پردہ ہٹا سکتا ہے' ورنہ ابن کا لفظ جسے عموماً ولد کا مرادف سمجھا جاتا ہے خود اس لفظ کی ساخت میں ایسی کوئی چیز شریک نہیں ہے' جس کے سوراخ سے عیسائیت کی اس بھیانک اور مکروہ ترین شکل کو ہم جھانک سکتے تھے۔

بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اپنے والد یعنی زائیدہ اولاد سے محبت وشفقت وغیرہ کے جس تعلق کو آدمی فطرتاً رکھتا ہے یہی تعلق کسی ایسی ہستی سے اگر پیدا ہو جائے جو ولد نہ ہو تو ابـــن کے لفظ سے اس کو مخاطب کرنے کا عربی میں معلوم ہوتا ہے کہ عام رواج تھا خود قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ:

نحن ابناء الله۔ ''ہم لوگ خدا کے بیٹے ہیں''

یہود بھی اس کا دعویٰ کیا کرتے تھے۔ مطلب ان کا یہ ہوتا تھا کہ دوسری نسلوں کے مقابلے میں اسرائیل کی اولاد' یعنی بنی اسرائیل سے خدا اسی قسم کا ربط وتعلق رکھتا ہے جو کسی بیٹے کے ساتھ باپ کا ہوتا ہے' دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اپنے آپ کو یہودی ''خدا زادہ یا ولد اللہ

(العیاذ باللہ) نہیں سمجھتے تھے بلکہ بارگاہ رب العزت میں غیر معمولی امتیازی مقام ہم رکھتے ہیں وہ اس کے مدعی تھے اور اسی کی تعبیر نحن ابناء اللہ سے کرتے تھے۔قرآن میں صرف یہ فرماتے ہوئے کہ:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ۔

''کہہ دو کہ پھر تمہارے گناہوں کی وجہ سے خدا تمہیں سزا کیوں دیتا ہے بلکہ تم آدمی ہو' ان ہی چیزوں میں سے ایک چیز ہو جنہیں خدا نے پیدا کیا۔''

ان کے اس دعویٰ پر اور کوئی تنقید نہیں کی ہے۔

آخر ''ابن اللہ'' کا دعویٰ اور ''ولد اللہ'' کا دعویٰ دونوں کا مآل ایک ہی قرار دیا جائے تو پھر عیسائیوں کی اس عقیدے کے ساتھ خصوصیت ہی کیا باقی رہتی ہے' ابنآء اللّٰہ کے مدعی تو قرآن ہی کے رو سے خود یہودی بھی تھے۔ ❶

کچھ بھی ہو ولد کا قرآنی لفظ جس کا بار بار اعادہ تقریباً ہر اس موقع پر کیا گیا ہے جہاں جہاں عیسائیوں کے اس عقیدے کا ذکر اس کتاب میں پایا جاتا ہے میرے نزدیک براہ راست قرآن کا یہی ایک لفظ سمجھا رہا ہے کہ درحقیقت عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خالق عالم کے سوا ایک اور ہستی بھی ہے جو خدا کی مخلوق بھی نہیں ہے اور سارے خدائی صفات وکمالات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اگرچہ عیسائی اس کو اللہ نہیں بلکہ ''ولد اللہ'' کہتے ہیں' مگر ''ولد اللہ'' ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ بھی اللہ ہے۔

---

❶ بلکہ بائبل کی پہلی کتاب پیدائش کے شروع میں جو یہ الفاظ پائے جاتے ہیں ''جب خدا کے بیٹے انسان کی بیٹیوں کے پاس گئے تو ان کے لئے ان سے اولاد ہوئی' یہی قدیم زمانہ کے سورما ہیں جو بڑے نامور پیدا ہوئے پیدائش باب ۶ درس ۴۔'' اگر یہ کوئی الحاقی خارجی فقرہ نہیں ہے یا ترجمہ میں تحریف سے کام نہیں لیا گیا تو شاید یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ملائکہ کو بھی یہود ابناء اللہ کہنے سے پرہیز نہیں کرتے تھے شاید یہ اسی قسم کی بات ہو کہ بخاری کی اس مشہور حدیث کی بنیاد پر جس میں ہے کہ ''ماں سے بھی زیادہ حق تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہیں'' کوئی مسلمان بھی اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہنے لگے مگر بحمد اللہ مسلمانوں کی تربیت ابتدا ہی سے کچھ ایسے طریقہ سے کی گئی ہے کہ اس قسم کی بے احتیاطیوں کے ہونے کے حادثے ان میں کم پیش آئے ہیں ۱۲۔

مجوسی عقیدہ کی حقیقت:

اس میں شک نہیں کہ الٰہیات یا دوسرے الفاظ میں چاہئے تو کہئے کہ حق تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے مسائل میں طرح طرح کے شاخسانے مختلف زمانوں میں نکالے گئے' شرک و بت پرستی اور ان کی بے شمار گوناگوں پیچیدہ شکلوں میں قومیں ان ہی شاخسانوں کی راہ سے الجھتی رہی ہیں' مگر تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ شرک کی بدترین شکلوں میں بھی اس کا یقین کہ اس عالم کا پیدا کرنے والا صرف ایک ہی ہے' دلوں سے کبھی نہیں نکلا' تاریخ مذاہب کا جو طومار آج دنیا میں موجود ہے اس میں صرف ایران کا ایک فرقہ مجوسی نامی کے متعلق اہرمن و یزداں' یا نور و ظلمت کے عقیدے کو منسوب کر کے کہنے والے کہتے ہیں کہ بجائے ایک کے دو ہستیاں مجوسیوں کے نزدیک ایسی مانی جاتی ہیں جن میں کوئی ایک دوسرے کا خالق نہیں بلکہ کائنات کی بعض چیزوں کو کہتے ہیں کہ یزداں نے پیدا کیا ہے اور بعضوں کو اہرمن نے یا ان میں بعض نور سے پیدا ہوئی ہیں اور بعض ظلمت سے' اگرچہ مجوسیوں کی طرف اس عقیدے کے انتساب کو تحقیق نے افترا قرار دیا ہے' لیکن مان بھی لیا جائے کہ مجوسی کسی زمانے میں اس کے قائل بھی رہے ہوں تاکہ ان کی بات اتنی بودی پھسپھسی تھی کہ ہلکی سی ذہنی چوٹ چونکانے کیلئے کافی ہو سکتی تھی۔

ان کی طرف اس عقیدے کی توجیہ میں بڑی سے بڑی بات جو منسوب کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ عالم کا موجودہ نظام خیر و شر یا بھلائیوں اور برائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ پس خدا یا یزدان جو خیر مطلق ہے اس کی طرف کیسے منسوب کیا جائے کہ تمام شر اور برائیوں کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے؟ کہتے ہیں کہ ان ہی شر اور برائیوں کی پیدائش کی تصحیح کے لئے اہرمن کے وجود کا یزدان کے ساتھ اضافہ کیا گیا تھا' مگر ذرا سوچئے بھلائی اور برائی کے جن صفات کو ہم دنیا کی چیزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان کی واقعی حالت کیا ہے؟ دراصل ایک ہی چیز ہوتی ہے مثلاً آگ ہے جب تک ہمارا کھانا پکاتی ہے' ہمیں روشنی بخشتی ہے تو ہم اس کو خیر ٹھہراتے ہیں' مگر اسی آگ سے جب ہمیں کبھی نقصان پہنچتا ہے' گھر جل اٹھتے ہیں' جانور یا آدمی بھننے لگتے ہیں' تو اسی آگ کو ہم بدترین چیز ٹھہرانے لگتے ہیں۔ الغرض استعمال کے اختلاف سے ایک ہی چیز ہوتی ہے جو

کبھی خیر' اور کبھی شر بنتی رہتی ہے۔ غریب مجوسیوں نے خیال کرلیا کہ شر و خیر کے الفاظ جیسے الگ الگ ہیں اسی طرح واقع میں بھی شر کا وجود خیر سے اور خیر کا وجود شر سے الگ ہو کر اس عالم میں پایا جاتا ہے مگر اس لفظی مغالطہ پر متنبہ ہو جانے کے بعد کہ عالم کی ایک ہی چیز شر بھی بنتی رہتی ہے اور خیر بھی' کیا ایک مخلوق کے لئے دو خالق کی تلاش کا جذبہ ان میں زندہ رہ سکتا ہے؟

خیر یہ قصہ تو بہت طویل ہے میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ لے دے کر خیر و شر کا یہی لفظی صرف لفظی مغالطہ کچھ سہارا دے سکتا تھا' لیکن اس سہارے کے ختم ہو جانے کے بعد آپ خود سوچئے کہ عالم کی پیدائش کے لئے ایک خالق کے مان لینے کے بعد عقل کے لئے ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے کہ خواہ مخواہ بلا کسی وجہ دوسرے فالتو خدا کو بھی تلاش کرے۔ ہاں! خدا کا وجود پیدائش عالم کی توجیہ کے لئے کسی حیثیت سے بھی اگر ناکافی ہو خیر اس وقت دوسرے خدا کی جستجو کا جواز بھی ذہن انسانی کے لئے کسی حد تک درست ہو سکتا تھا۔ مگر یہ بات کہ خدا کا وجود توجیہ عالم کے لئے ناکافی ہے' آج تک نہ کسی نے ایسا دعویٰ کیا اور نہ کر سکتا ہے اور کوئی کر بھی گزرے تو اس دعویٰ کے لئے اسے قطعاً کوئی چھوٹی شکستہ و برشتہ دلیل بھی نہیں مل سکتی۔ توحید کے مسئلہ میں قرآن کو عموماً جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہمیشہ دلیل کا مطالبہ مشرکین سے کرتا ہے۔ مثلاً ''**ھاتوا برھانکم**'' یا ''**فاتوا بسلطن مبین**'' تو اس کا مطلب یہی ہے کہ مشرک کے مقابلہ میں موحد کی حیثیت منکر کی ہے۔ مشرک خدا کے وجود کو گویا ناکافی ٹھہرا کر خدا کے ساتھ غیر خدائی قوتوں کا اضافہ کرتا ہے اس لئے وہ مدعی ہے اور قاعدہ ہے کہ بار ثبوت منکر پر نہیں' ہمیشہ مدعی پر ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو قرآن نے یہی سکھایا ہے کہ مشرکوں کے مقابلہ میں تم ہمیشہ یہی کہا کرو کہ ہمیں تو خدا کے ساتھ دوسرے خدا کے اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

دراصل یہی وجہ ہے کہ ''شرک'' کی پوری تاریخ ایک سے زائد خالق کے ذکر سے خالی نظر آتی ہے۔ بر و بحر کے کونے کونے کو لوگوں نے چھان مارا مگر جہاں کہیں انسانی آبادی ملی' وہاں خالق عالم کی توحید کا عقیدہ بھی ملا' اور خالق کے سوا جن چیزوں کو بھی بنی آدم نے مختلف زمانوں میں پوجا یا اپنی امیدوں کا ماویٰ و ملجا اور ٹھکانہ ان کو ٹھہرایا' تو یہ مانتے ہوئے ٹھہرایا کہ باوجود مخلوق ہونے کے زندگی کے مشکلات کے حل میں ان سے مدد ملتی ہے' مگر اس مغالطہ کی بنیاد بھی صرف

ایک لفظ کے نہ سمجھنے پر موقوف ہے یعنی خود ''مخلوق'' کا لفظ۔

ربط خالق ومخلوق:

ایسی ہستی جو مخلوق ہو' اس کے تعلق کی نوعیت اپنے خالق کے ساتھ کیا ہوتی ہے؟ یا اس تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہئے؟ لوگوں نے سامنے کی مثالوں کو دیکھ کر ایک رائے قائم کر لی اور یہی بے بنیاد رائے سارے مغالطوں کی بنیاد بنی ہوئی ہے' یعنی ان کے سامنے یا تو ایسی چیزیں ہیں' جن میں کوئی دوسرے کی مخلوق نہیں ہے' مثلاً زید اور عمرو دو آدمی ہیں' ظاہر ہے کہ نہ زید ہی عمرو کی مخلوق ہے اور عمرو زید کا خالق۔ ہم اسی قسم کی چیزوں کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ زید وعمرو دو ہستیوں کے تعلق کی جو نوعیت ہے کچھ یہی نوعیت یا اسی قسم کی نوعیت خالق ومخلوق کے تعلق کی بھی ہوگی' یا زیادہ سے زیادہ ہم یہ سوچتے ہیں کہ اسی قسم کی چیزیں جن میں کوئی دوسرے کا خالق تو نہیں ہے' لیکن ان میں صنعتی تعلق کبھی جو پیدا ہو جاتا ہے پتھر کو صنعتی کاریگری سے بت تراش مجسمہ بنالیتا ہے' یا اینٹ' چونے' گچ کو جوڑ کر معمار مکان تیار کر لیتا ہے۔ لکڑی کے ٹکڑوں کو خراش وتراش کے عمل سے بڑھئی کرسی کی شکل میں ڈھال دیتا ہے' دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ صانع اور مصنوع میں جو تعلق اور رشتہ پایا جاتا ہے سمجھ لیا جاتا ہے کہ خالق ومخلوق کے رشتہ اور تعلق کی نوعیت بھی کچھ یہی ہوگی' حالانکہ پہلی صورت ہو یا دوسری' خالق ومخلوق کے تعلق کے سمجھنے میں جب بھی ان سے مدد لی جائے گی تو حقیقت سامنے سے اوجھل ہو کر رہ جائے گی' طرح طرح کی الجھنوں میں آدمی کا ذہن مبتلا پھنس کر رہ جاتا ہے' جس کی وجہ کھلی ہوئی ہے کہ دنیا کی جن چیزوں میں صانع ومصنوع کا رشتہ ہو یا نہ ہو کسی حال میں بھی ایک وجود دوسرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ جن چیزوں میں صانع ومصنوع کا تعلق نہیں ہے ان کا حال تو ظاہر ہی ہے' باقی خود صانع ومصنوع ہی میں دیکھئے پتھر یا لکڑی یا اینٹ چونا وغیرہ جن پر صانع صنعتی عمل کرتا ہے ان میں کوئی بھی ایسا ہے جسے صانع اور کاریگر وجود اور ہستی عطا کرتا ہو' یعنی نیست سے ہست یا جو چیز معدوم اور نیست مطلق تھی اس کا وجود اور ہستی کا لباس پہناتا ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی چیزوں میں جو قدرتی صلاحیتیں پہلے سے پائی جاتی ہیں صانع اور کاریگر ان ہی صلاحیتوں کو اپنے صنعتی عمل سے ظاہر کر

دیتا ہے، پتھر میں بت بننے کی صلاحیت پہلے سے موجود تھی، بت تراش اسی صلاحیت کو فعلیت کا رنگ عطا کر دیتا ہے۔ آخر اپنے صنعتی عمل سے ہوا کے کسی ٹکڑے سے بت تراش، بت بنا کر کیا دکھا سکتا ہے؟ وجہ وہی ہے کہ ہوا میں بت بننے کی صلاحیت ہی نہیں پائی جاتی، اسی لئے غلط مثالوں کا سہارا لے کر شعوری یا غیر شعوری فیصلہ ہر شخص خالق و مخلوق یا خدا اور عالم کے متعلق اپنے اندر رکھتا ہے، حالانکہ مثل نہ سہی، مثال اس کی آدمی کے باہر میں نہ سہی، اندر میں خود پائی جاتی ہے، یعنی خیالی قوت سے بحالت بیداری یا خواب جن خیالی چیزوں کو آدمی اپنے اندر پیدا کرتا رہتا ہے کچھ ہلکی سی جھلک خالق و مخلوق کے تعلق کی اگر پائی جاتی ہے تو اسی خیالی مثال میں پائی جاتی ہے، تخیل کی قوت سے بغیر کسی مادہ کے جس وقت ہم کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو پیدا کرنے کا صرف ارادہ اس خیالی مخلوق کی پیدائش کے لئے کافی ہوتا ہے۔ بڑی سے بڑی عمارت، پہاڑ، سمندر، آفتاب و ماہتاب کو عالم خیال میں آدمی پیدا کرتا رہتا ہے، گو یہ بھی ایک ہلکی سی نامکمل مثال ہے مگر ذرا سوچئے کہ ان خیالی مخلوقات کا تعلق ان کے خالق سے کیا ہوتا ہے؟ اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ مخلوق بنا کر ہم جن چیزوں کو اپنے خیال میں پیدا کرتے ہیں، مثلاً دہلی کی جامع مسجد کا خیال کیجئے یعنی اپنے تخیل کی قوت سے اس کو پیدا کیجئے اور دیکھئے آپ کی یہ خیالی مخلوق اپنی ذات، اپنے صفات اور حالات ہر اعتبار سے اپنی پیدائش میں بھی آپ کے تخلیقی ارادے کی محتاج نظر آئے گی اور پیدا ہونے کے بعد بھی مسلسل اپنے قیام و بقا میں اس کی ذات بھی، اس کے صفات بھی، حالات بھی آپ کی تخلیقی توجہ اور التفات کے دست نگر دکھائی دیں گے، جب تک اپنے تخیل کی قوت سے آپ اس کے قیوم بنے ہوئے اور اسے تھامے ہوئے ہیں وہ موجود رہے گی اور جوں ہی توجہ والتفات کے اس سہارے سے وہ محروم ہوئی اسی وقت ناپید ہو کر رہ جائے گی۔

آدمی کی مخلوق کا حال جب یہ ہے تو اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ قادر و مقتدر واقعی عالم کا خالق حقیقی ہے اس کی مخلوقات کے احتیاجی تعلق کی نوعیت یقیناً اس سے بھی کہیں زیادہ شدید ہو گی۔ اس کی مخلوقات میں خود مخلوقات کا کچھ نہیں ہوتا سب کچھ خالق کا ہوتا ہے ان کا وجود بھی، ان کی ذات بھی، ان کے صفات بھی، ان کے افعال بھی، ہر لمحہ، ہر لحظہ مسلسل صرف خالق کے فیض توجہ کے ساتھ بندھے رہتے ہیں۔ "مخلوقیت" کا حقیقی ترجمہ یہی احتیاج مطلق ہے جس پر "مخلوقات" کی

یہ حقیقت کھل جاتی ہے' وہ ان سے اسی حد تک بے نیازی اپنے اندر پانے لگتا ہے کہ ان سے لین دین کے مراسم تو بڑی بات ہے ان مخلوقات کے وجود تک میں اس کو شبہ ہونے لگتا ہے اور شبہ کیا بعض تو اسی یافت کے بعد چیخ اٹھے ہیں کہ ؎

گر او ہست حقا کہ من نیستم ❶

باوجود اجمال کے پھر بھی یہ ذیلی گفتگو کچھ زیادہ طویل ہو گئی۔ ورنہ یہ عرض کر رہا تھا کہ ''مخلوق'' کو مخلوق مان کر اس کو 'معبود' بنانے کی غلطی میں آدمی اسی وقت تک شاید مبتلا رہ سکتا ہے جب تک کہ اس پر ''مخلوقیت'' کی اصل حقیقت صحیح معنوں میں واشگاف نہ ہوئی ہو مگر ''خالق و مخلوق'' کے باہمی تعلق کو سمجھ لینے کے بعد جب اس پر واضح ہو جاتا ہے کہ ''مخلوقیت'' دراصل خالص بے چارگی اور حد سے گزری ہوئی بے بسی کا نام ہے تو جن مثالی مغالطوں سے پھسل کر شرک کی اندھیری گھاٹی میں آدمی گر پڑا تھا اس سے اچانک باہر نکل آتا ہے۔ آخر ایسے ''معبود'' کو آدمی کب تک پوجتا چلا جائے گا جس کے متعلق جانتا ہو کہ وہ خود اپنے وجود' اپنی ذات' اپنے صفات' اپنے افعال' سب میں ہر پہلو اور ہر اعتبار سے دوسرے کا دست نگر اور دوسرے کے ارادے کے ساتھ جکڑا ہوا ہے۔

نظریہ ''ولدیت'' کی تنقیح:

اسی لئے شرک اور مشرکیت کے وہ سارے قصے جن میں خالق کے سوا ہر معبود کو مخلوق مان کر معبود بنالیا جاتا ہے' ان کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہے کم از کم اتنا دشوار تو نہیں ہے جتنی دشواری ''شرک'' کی اس عجیب و غریب قسم کے وجہ سے پیش آ گئی جس کی بنیاد ''ولدیت'' کے عقیدے پر قائم ہے کہ اس میں خالق کے سوا ایک ایسی ہستی کو معبود بنالینے کی کوشش کی گئی ہے جو مخلوق نہیں بلکہ (العیاذ باللہ) خدا کا مولود ہے اور تماشا یہ کہ ''مولود'' مان کر یہ بھی باور کرایا جاتا ہے کہ عیسائیت کا بھی بنیادی عقیدہ ''شرک'' نہیں بلکہ خالص توحید ہی ہے۔ حالانکہ آپ دیکھ چکے ہیں

❶ یہ بڑا تفصیل طلب مسئلہ ہے ''مخلوقیت'' کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے مسئلہ کے صرف ایک پہلو کا اجمالی تذکرہ کر دیا گیا۔ زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو خاکسار کی کتاب ''الدین القیم'' مطالعہ فرمائیے۔

کہ "ولد اللہ" اللہ کی مخلوقیت سے بھی باہر ہو جاتا ہے اور ولدیت کا لازمی اقتضا یہی ہے کہ اللہ کا ولد بھی (العیاذ باللہ) اللہ ہی ہو۔

اور قصہ کچھ اسی نقطہ پر ختم نہیں ہو جاتا' اب تک تو اس پر بحث کی گئی کہ "نظریہ ولدیت" کی بنیاد پر ولد کے متعلق ماننے والوں کو کن کن باتوں کے ماننے پر مجبور ہونا پڑا' مگر دوسرا پہلو یعنی اسی "نظریہ ولدیت" کے لحاظ سے خود والد کی طرف کن ناگفتہ بہ امور کے منسوب کرنے پر اس کے قائل بے بس ہیں اب اسے ملاحظہ فرمایئے۔

ظاہر ہے کہ ولد کا لفظ والد کے ساتھ قدرتاً والدہ کے مسئلہ کو بھی ذہن کے سامنے لے آتا ہے جس کے بعد اب آگے میں کیا عرض کروں؟ ہم جن کے ذکر سے کیا معنی! خیال سے بھی کانپ اٹھتے ہیں مگر ولدیت کے اسی حیرت انگیز بدترین گھناؤنے نظریہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ماننے والوں نے ولد کے ساتھ والد کو مانا اور والد کے ساتھ والدہ کو اور والدہ کے ساتھ (العیاذ باللہ) والدین کے سارے فرائض کو اپنے ایمان کو جز بنانے پر وہ مجبور ہوئے۔

یہاں تک تو مطلب ہوا پہلی آیت یعنی

"وَيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا" کا اب آگے چلئے ارشاد ہوتا ہے۔

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ۔

"نہیں ہے ان کو اس کا کچھ بھی علم' نہ ان کے باپ دادوں کو"۔

سوچئے قرآن کیا کہہ رہا ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی چیز کے علم اور جاننے کی دو ہی صورتیں ہیں' یعنی جاننے والوں کو براہ راست اس کا علم حاصل ہوا ہو یا براہ راست نہیں' بلکہ بالواسطہ یعنی براہ راست جاننے والوں سے اس کی خبر پہنچی ہو۔ بالواسطہ بلاواسطہ علم کی یہی دو قسمیں ہیں۔ اب غور فرمایئے کہ "نظریہ ولدیت" یعنی بجائے مخلوق قرار دینے کے کسی شخص کو خالق عالم جل مجدہ کا "مولود" ٹھہرالینا اور مولود ٹھہرانے کے بعد انسانیت کے اس متفقہ کلی فیصلے کے خلاف کہ خدا کے سوا' جو کچھ بھی ہے سب مخلوق ہے' بجائے اس کے ایک خاص ذات کو خدا کی "مخلوقیت" کے دائرے سے خارج کر دینا اور اللہ کے ساتھ ولد اللہ کا اضافہ کر کے درحقیقت ایک اور اللہ کو مان لینا' پھر والد کے ساتھ والدہ بنانے کے لئے انسانی گھرانے کی ایک عورت

کے متعلق یہ تسلیم کر لینا کہ والدہ ہونے کے فرائض اسی نے انجام دیئے اور اس سلسلہ میں جن ناگفتہ بہ تصورات سے دل ودماغ کو گزرنا پڑتا ہے' ان کو دینی عقیدے کی حیثیت دینی' ایک پورا فلسفہ اسی ولدیت کا بنا لینا' ہزاروں لاکھوں کتابوں کے سوا اسی عقیدے کی خیالی صورتوں کو معابد اور گرجوں کے در و دیوار پر تصویری لباس بھی عطا کرنا اور جہاں جہاں موقع ملتا چلا گیا وہاں مجسموں اور سنگی و برنجی پیکروں میں بھی ان کو ڈھالنا۔

سوال یہی ہے کہ ان سارے اعتقادی طوفانوں کے نیچے کسی حیثیت سے' کسی جگہ کسی منزل میں کوئی ایسی بات بھی نظر آتی ہے جس کے متعلق اعتقاد رکھنے والوں کا یہ گروہ اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ براہ راست اس کا علم اسے حاصل ہوا' یا اسے نہیں تو اس کے باپ دادوں میں کوئی ایسا گزرا ہے جسے اس سلسلہ میں کسی قسم کے مشاہدے یا تجربے کا کسی حیثیت سے کبھی موقع میسر آیا تھا؟

کتنے مہیب' کتنے دہشت ناک' کتنے مکروہ اور گھناؤنے' ناگفتہ بہ دعوؤں پر ''ولدیت'' کا یہ عقیدہ مشتمل ہے' لیکن عقیدہ رکھنے والے انصاف سے بتائیں کہ ان میں سے کُل نہیں' کسی ایک ہی جزو کے جاننے کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دعویٰ وہ کر سکتے ہیں؟ انہوں نے اپنے اوپر کتنی بڑی بڑی ذمہ داریاں لادی ہیں! خدا کی مخلوقیت سے ایک شخص کے خارج ہونے کے مدعی ہیں۔ اللہ کے ساتھ معناً ایک نئے اللہ کا اضافہ کر رہے ہیں **الملك القدوس** کی طرف وہ ایسی باتیں منسوب کر رہے ہیں جنہیں صحیح معنوں میں شاید وہ خود بھی سوچ نہیں سکتے مگر ان ذمہ داریوں کی بنیاد کس چیز پر قائم ہے' آپ دیکھ رہے ہیں'' کچھ نہیں'' کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

زیادہ سے زیادہ کچھ کہنے کی یہ جرات اگر کر سکتے ہیں تو یہی کہ حضرت مسیح علیہ السلام جب بغیر ''والد'' کے ''والدہ'' مریم (علیہا الصلوٰۃ والسلام) سے پیدا ہوئے تو آخر ان کا والد کس کو ٹھہرایا جائے؟ سوال تو خیر ایک حد تک پیدا ہو سکتا ہے مگر ابھی سوال سے نہیں' بحث جواب سے ہے یعنی یہ کہہ دینا کہ جب انسانوں میں ان کا کوئی والد نہ تھا تو ہم نے اللہ تعالیٰ ہی کو ان کا والد مان لیا۔ اسی جواب کے متعلق میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس دعویٰ کی بنیاد کیا ہے؟ کیا زید کا باپ اگر عمرو نہ ہو تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ زید کا باپ بکر ہے' خود سوچئے کہ ایسا دعویٰ علم پر مبنی ہو گا؟ پھر اتنی بات کہ کوئی آدمی حضرت مسیح علیہ السلام کا باپ نہ تھا محض اس سے یہ منطقی نتیجہ کیسے نکل آیا کہ آدمی

جس کا باپ نہ ہو اس کا باپ یقیناً خدا ہی ہے' ایک بے بنیاد جاہلانہ وسوسہ کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

اور اب اس کے بعد اندازہ کیجئے اس تیسری آیت کے صحیح وزن کا جو مذکورہ بالا دو آیتوں کے بعد' یعنی نظریہ ''ولدیت'' کے متعلق یہ بتانے کے بعد کہ

''كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا''

کسی قسم کے علم پر اس کی بنیاد قائم نہیں ہے' قرآن نے بہت بڑی بات کی ہے جو ان کے (عیسائیوں کے) منہ سے نکل رہی ہے' نہیں بول رہے ہیں یہ' مگر صرف جھوٹ۔

کے پرزور الفاظ میں جو تنقید کی ہے کیا واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے اس سے بڑا دعویٰ خود سوچئے اور کیا ہوگا کہ ایک ایسی پادر ہوا بات جس کی قطعاً کسی قسم کی کوئی علمی بنیاد نہ تھی اور انسانیت کی ساری تاریخ میں جو کبھی سوچی نہیں گئی تھی' اسی کو مان کر الٰہیات کے سارے نظام ہی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا گیا۔

یقیناً حق تعالیٰ کے متعلق جتنی غلط سے غلط' مہمل سے مہمل باتیں اب تک منسوب کی گئی ہیں ان میں سب سے بڑی بات وہ ہے جو نظریہ ولدیت کے معتقدوں کے منہ سے نکل رہی ہے اور کمال یہ ہے کہ حقیقت سے ذرہ برابر بھی لگاؤ ان کے اس ادعائی عقیدے کو نہیں ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ علم کی کسی قسم کی تائید اس خیال کی یہ حاصل نہیں کر سکتے نہ خود اپنے خواص کی شہادت کو دلیل میں وہ پیش کر سکتے ہیں اور نہ اپنے باپ دادوں کی شہادت کو۔ اور عقل سے تائید تو خیر بڑی بات ہے' واقعہ یہ ہے کہ جس طریقے سے بھی سوچا جائے بجز تردید کے عقل کی راہ میں بھی ان کو اور کچھ نہیں مل سکتا۔ اسی ''نظریہ ولدیت'' کا ذکر کرتے ہوئے قرآن ہی میں دوسری جگہ جو یہ ارشاد ہوا ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّاo

(مریم: ۹۰)

''قریب ہے کہ اس سے (یعنی عقیدہ ولدیت کی وجہ سے) پھٹ پڑیں آسمان اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے زمین اور گر پڑیں پہاڑ کانپ کر۔''

تو جو نہیں سوچتے' انہیں حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑھے چڑھے الفاظ میں جن سے زمین و

آسمان بھی کانپ اٹھیں آخر قرآن نے اس عقیدے کی تنقید کیوں کی ہے؟ بظاہر اسی قسم کے مقامات میں بداندیشوں کو شاعرانہ مبالغوں یا خطیبانہ اغراق کا دھوکہ عموماً ہوا کرتا ہے حالانکہ میرا تجربہ یہ ہے کہ خواہ الفاظ جتنے بھی بلند و بالا ہوں بال برابر بھی ''قرآن'' حقیقت سے کبھی نہیں ہٹتا' الفاظ کی بلندی خبر دیتی ہے کہ حقیقت جس کی تعبیر الفاظ سے کی گئی وہ خود بھی اپنے اندر غیر معمولی بلندی رکھتی ہے۔

آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ چکرا کر گر پڑیں۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ ''نظریہ ولدیت'' کے متعلق آپ ابھی سن چکے کہ درحقیقت خدا کے ساتھ دوسرے خدا کے اضافہ کی یہ ایک مخفی تدبیر اور تعبیری چال ہے اور کون نہیں جانتا کہ خدا کے ساتھ خدا کے اضافہ کا مطلب جیسا کہ خود قرآن میں بھی اعلان کیا گیا ہے کہ آسمان و زمین کے فساد اور بگاڑ کے نتیجہ کو یہ صورت حال پیدا کر دیتی ہے۔

پھر مندرجہ بالا الفاظ میں بجز اس کے کہ اسی لزومی منطقی نتیجہ کو دہرایا گیا ہے اور بھی کچھ کیا گیا ہے؟ یعنی خدا کے ساتھ دوسرے خدا کا وجود نظام عالم کی تباہی کو مقتضی ہے' اس الٰہیاتی دعویٰ کے فنی حکیمانہ دلائل تک عوام کی رسائی ذرا دشوار ہے' مگر ایک سیدھی سادی بات کہتا ہوں' ابھی آپ کے سامنے خالق و مخلوق کے تعلق کو مثال سے سمجھاتے ہوئے عرض کیا گیا تھا کہ تخیل کی قوت سے مخلوقات کو ہم اپنے خیال میں جو پیدا کرتے ہیں' منجملہ دوسری باتوں کے دیکھئے' کسی کرسی پر آپ بیٹھے ہوں اور اسی حال میں اپنی خیالی مخلوق کو پیدا کیجئے' آپ پائیں گے کہ آپ کی خیالی مخلوق کا وجود اور آپ کا وجود دونوں ایک ہی کرسی یا مکان میں سما گئے' مگر اسی کرسی میں ایسی چیز جو آپ کی مخلوق نہ ہو' مثلاً زید بھی اسی حال میں بیٹھنا چاہے جب آپ اس پر بیٹھے ہیں تو یقیناً ایک مکان میں ایسے دو مکینوں کا جمع ہونا ناممکن ہے۔ دونوں صورتوں میں فرق کیا ہوا؟ یہی تو کہ ثانی الذکر شکل میں دونوں میں کوئی کسی سے مخلوقیت کا تعلق نہیں رکھتا تھا۔ برخلاف اول الذکر صورت کے کہ آپ کی حیثیت خالق کی تھی اور خیالی مخلوق جسے تخیل کی قوت سے آپ نے پیدا کیا تھا آپ کے مخلوق ہونے کی حیثیت رکھتی تھی' خواہ اب آپ کی یہ مخلوق جتنی بھی عریض و طویل ہو' ہمالیہ کا پہاڑ کیوں نہ ہو' لیکن مخلوق بن کر اسی کرسی میں اس کی گنجائش نکل آئی جس پر آپ بیٹھے تھے اب اسی

مثال کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچئے کہ خالق کے ساتھ ایسی ہستی کا تصور جو اس کی مخلوق نہ ہو دونوں اکٹھے پائے جانے کی شکل ہی کیا ہو سکتی ہے؟ اپنے مخلوقات کے ساتھ اس وقت خالق کا وجود تو اس لئے جمع ہو رہا ہے کہ دونوں میں ایک کی حیثیت خالق کی ہے اور دوسری کی مخلوق کی' لیکن جب ایک دوسرے کی مخلوق نہ ہو تو جیسے کرسی میں بیٹھنے والے کی مثال سے سمجھایا گیا تھا کہ زید کے ساتھ کرسی کی اسی جگہ کو جسے زید کا وجود بھرے ہوئے ہے عمرو کا وجود اسے نہیں بھر سکتا اور اگر بھرنے کی کوشش کرے گا تو کرسی پاش پاش ہو جائے گی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے گی۔ ❶

نظریہ ولدیت کا لازمی نتیجہ:

بس اس طرح سمجھنا چاہئے کہ بجائے مخلوقات کے خالق کے ساتھ کسی ایسے وجود کو اگر مانا جائے گا جو اس کی مخلوقیت کے دائرے سے خارج ہو' تو اس کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا جو قرآن نے بیان کیا یعنی عالم کا سارا نظام الٹ پلٹ اور ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا۔

اسی سورۂ مریم میں ''نظریہ ولدیت'' کے اس لازمی نتیجہ کو بیان کرتے ہوئے اس عقیدے

---

❶ ایک اور طریقے سے بھی سوچئے۔ کسی انجن کو پوری رفتار میں لانے کے لئے فرض کیجئے سو گھوڑوں کی بھاری طاقت کی اگر ضرورت ہو اور اس طاقت کو لگا کر انجن چالو کر دیا گیا ہو' اب اسی انجن کے ساتھ مزید گھوڑوں کی بھاری طاقت کا اضافہ اگر کر دیا جائے گا تو نتیجہ کیا ہو گا؟ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے۔ انجن پھٹ پڑے گا اس کا ایک ایک پرزہ دوسرے سے جدا ہو کر بکھر جائے گا۔ معلول واحد پر دو تامہ علتوں کے تاثیری عمل کا یہ نتیجہ کچھ انجن ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اب ملاحظہ کیجئے عالم کا موجودہ نظام جس قوت سے چل رہا ہے قرآن نے اس کا نام ''الرحمن'' رکھا ہے۔ یہ حق تعالیٰ کی ذات کی صفاتی تعبیر ہے۔ کائنات کا مرکز جس کا قرآنی نام ''العرش'' ہے اور عالم کے قالب کے ساتھ اس کی حیثیت ''قلب'' کی ہے۔ عالم کے اسی قلب کو مرکز بنا کر ''الرحمن'' دنیا کے نظام کو چلا رہا ہے۔ اب ''الرحمن'' کے ساتھ دوسرے ''الرحمن'' کا اگر اضافہ کیا جائے تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ سو گھوڑوں کی قوت سے پوری رفتار پر چلنے والے انجن کے ساتھ مزید سو گھوڑوں کی اسٹیم کی قوت کا اضافہ کر دیا گیا۔ ''عقیدہ ولدیت'' اسی نتیجہ کو مستلزم ہے تو آسمان پھٹ پڑیں' پہاڑ گر جائیں' زمین ریزہ ریزہ ہو جائے ''عقیدہ ولدیت'' کا نتیجہ قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے تو بجز اظہار واقعہ کے یہ اور کیا ہے؟

کے ماننے والوں کو خطاب کر کے یہ جو فرمایا گیا ہے کہ:

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا۔ (سورۃ مریم)

''یعنی بڑی اچھنبے کی بات تم پیش کر رہے ہو۔''

یہ ''اِدًّا'' کا عربی لفظ اگرچہ ایک ہی ہے لیکن لغت میں جن معانی کو اس کے نیچے درج کیا گیا ہے' ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی عجیب و غریب بات جو کبھی سنی اور دیکھی گئی نہ ہو اور فطرت انسانی جسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔ ان ساری باتوں کو ''اِدًّا'' کا یہ عربی لفظ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور ''ولدیت'' کے جن لوازم و آثار و نتائج کو اب تک آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے ان کو دیکھتے ہوئے بتایا جائے کہ اس سے بہتر تعبیر اس گھناؤنے عقیدے کی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اور اس وقت تک تو اس مسئلہ کے صرف ان پہلوؤں کی حد تک بحث کو محدود رکھا گیا ہے جن کا آدمی کے عقلی اور نظری احساسات سے تعلق ہے' مگر عقلی احساسات کے ساتھ جذباتی تاثرات کو بھی اگر شریک کر لیا جائے تو میں کیا عرض کروں کہ بات کہاں کہاں پہنچ جاتی ہے۔

جذبات کو متاثر کرنے والی چیزوں میں ایک بڑی ''موثر'' چیز وہ بھی جس کی تعبیر زبانوں میں مختلف الفاظ سے کی گئی ہے اردو یا ہندی میں ہم اس کی تعبیر ''گالی'' سے کرتے ہیں' فارسی والے ''دشنام'' عربی میں ''سب و شتم'' اور اسی طرح مختلف زبانوں میں مختلف الفاظ مروج ہیں۔

ظاہر ہے کہ جسے گالی دی جاتی ہے اگر واقعہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کے جسم یا روح کو کوئی مادی نقصان نہیں پہنچایا جاتا' گالی دینے والے کی زبان کی حرکت سے ہوا کے اندر کچھ ارتعاشی تموجات پیدا ہوتے ہیں اگر زبان کچھ ہلتی ہے تو گالی دینے والوں ہی کی ہلتی ہے' لیکن سننے والے کا تو بال بھی بیکا نہیں ہوتا' جن الفاظ یا فقروں کی تعبیر ہم گالی سے کرتے ہیں' ان کی صحیح عقلی نوعیت یقیناً یہی ہے' مگر کون نہیں جانتا کہ عقل کے نزدیک جس کی قطعاً کسی قسم کی کوئی اہمیت نہیں ہے' اسی گالی اور دشنام' سب و شتم سے جذبات میں کتنا شدید ہیجان پیدا ہوتا ہے' آدمی ان ہی جذباتی تاثرات کے طوفان سے اتنا بے قابو اور آپے سے باہر ہو جاتا ہے کہ بسا اوقات وہ

سب کچھ کر گزرتا ہے یا کر گزرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جو مادی ضرر سے متاثر ہونے کے بعد بھی شاید نہیں کرتا۔

اس جذباتی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے میں دریافت کرتا ہوں کہ زید کا واقع میں مثلاً جو شخص باپ نہیں ہے اس کو زید کا باپ قرار دے کر دیکھئے' آپ کو زید کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے؟ فرض کیجئے کہ جسے زید کا باپ آپ نے قرار دیا ہو' وقت کا کوئی بادشاہ یا کوئی بڑا جلیل القدر بزرگ ہی کیوں نہ ہو' مگر ان باتوں سے کیا جس ردعمل کی توقع زید کی طرف سے کی جاتی ہے' اس میں کچھ بھی کمی ہو سکتی ہے؟ صرف اس لئے کہ زید کی ماں کو جس شخص کے ساتھ آپ نے بلاوجہ متہم کیا ہے وہ کوئی بڑا آدمی ہے' کسی ملک کا حکمران ہے یا خدارسیدہ ہے' بزرگ ہے' کیا زید آپ کو بخش دے گا؟ اس کے ہاتھ کا چلا ہوا جوتا کیا درمیان ہی میں اس توجیہ کی وجہ سے رک جائے گا؟

پھر ذرا سوچنا چاہئے ان لوگوں کو جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کو جو قطعاً خدازادے نہ تھے' منسوب کرنے والے جب ان کی ولدیت کو خدا کی طرف (العیاذ باللہ) منسوب کرتے ہیں کیا وہ نہیں سوچتے کہ وہ مسیح (علیہ السلام) کو بھی گالی دے رہے ہیں اور وہ اگر سوچیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ درحقیقت حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کر رہے ہیں جسے خدا تو شاید' ایک شائستہ آدمی بھی اپنی طرف اس کے انتساب کو برداشت نہیں کر سکتا۔

آخر ایسی عورت جو آپ کی بیوی نہ ہو' اس کے ساتھ آپ کو اگر متہم کیا جائے تو یہ تہمت آپ کے لئے کیا قابل برداشت ہو سکتی ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ ولدیت کے اس عقیدہ کو ماننے والے دراصل حضرت مسیح (علیہ السلام) کو بھی گالیاں دے رہے ہیں' ان کی پاک' طاہرہ ومطہرہ والدہ معصومہ عفیفہ کو بھی بے آبرو کر رہے ہیں۔

اور کاش ان میں کچھ سمجھ ہوتی تو خیال کر سکتے تھے کہ اپنے ارحم الراحمین' مالک وخالق (تعالیٰ اللہ عما یفترون) کے ساتھ بھی سب وشتم کی گستاخیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اور کیسی گستاخیاں؟ کیسی شوخ چشمیاں! جنہیں خود برداشت نہیں کر سکتے' توقع رکھتے ہیں کہ خدا اسے برداشت کرے گا۔ آسمان وزمین' پہاڑ کے پھٹنے کا بعض لوگوں نے یہ مطلب جو بیان کیا ہے کہ یہ عربی زبان کا ایک پیرایہ بیان ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ ان چیزوں میں اگر احساس ہوتا

توان گالیوں سے وہ درہم برہم ہو جائیں۔

بہر حال عقلی احساسات اور جذباتی تاثرات پر یہ سارا زور و ظلم محض اس لئے کیا گیا کہ حضرت مسیح کا انسانوں میں جب کوئی شخص باپ نہ تھا تو آخر کسی نہ کسی کو چاہئے کہ آپ کا باپ ٹھہرایا جائے' حالانکہ خود یہی ایک غیر عقلی تقاضا ہے۔ کائنات کی ساری چیزیں جنہیں خالق عالم پیدا فرما رہے ہیں' خواہ بالواسطہ پیدا ہو رہی ہوں یا بلاواسطہ' ادیان و ملل کا اس پر اتفاق ہے کہ ان میں ہر چیز درحقیقت حق تعالیٰ کے کلمہ کــن سے پیدا ہو رہی ہیں' یعنی حق تعالیٰ کا تخلیقی ارادہ اور حکم پیدائش صرف وہی ہر چیز کے پیدا ہونے کی واحد ضمانت ہے' بلاواسطہ پیدا ہونے والی چیزیں جن کا تعلق ''عالم امر'' سے ہے ان کا بھی یہی حال ہے' اور چیز سے چیزوں کی پیدائش کا جو سلسلہ عالم میں نظر آتا ہے' گو بظاہر یہاں وسائط نظر آتے ہیں' لیکن وسائط کو کسی چیز کی پیدائش سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تخلیق و آفرینش یہ کام براہ راست خالق تعالیٰ کا ہے اور کوئی مانے یا نہ مانے مگر عیسائی جو بہر حال ایک دینی اور مذہبی امت ہے' اس کا دینی عقیدہ بھی یقیناً یہی ہے پھر ان گنت چیزیں جب کلمہ کــن سے پیدا ہو رہی ہیں' کونسی دشواری تھی اگر ایک مسیح (علیہ السلام) کی پیدائش کو بھی حق تعالیٰ کے اسی تخلیقی ارادے اور کلمہ کـــن کا نتیجہ مان لینے (1) سے عقل ہی پر کسی قسم کا بار

(1) قرآن مجید میں اس کو سمجھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ کم از کم ''انسان اول'' یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق تو بہر حال یہی مانا جاتا ہے اور اس کے سوا اور یہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ والدین کے توسط کے بغیر بنی نوع انسانی کا پہلا فرد پیدا ہوا۔ انسانی عقل جب اس ناگزیر واقعہ کو تسلیم کر چکی ہے تو والدین نہیں بلکہ صرف والد کے توسط کے بغیر کسی انسان ہی کی پیدائش کے تصور سے وہی عقل اپنے آپ کو درماندہ اور عاجز کیسے ٹھہرا سکتی ہے۔ خالق تعالیٰ جل مجدہ کا کـــن یعنی ہو جانے کا حکم جب آدم کی آفرینش کے لئے کافی ہوا تو مسیح (علیہ السلام) کی پیدائش کے لئے کــن کے اسی کلمہ کو ناکافی قرار دے کر پہلے تو ان کے والد ہی کی لاحاصل جستجو میں مبتلا ہونے کی ضرورت عقل کو کیا پڑی ہے۔ اور طرفہ ماجرا اس کے بعد یہ ہے کہ اس حاصل جستجو کے تقاضے کو خواہ مخواہ دل میں پیدا کر کے عیسائیوں کا یہ کتنا احمقانہ اور گستاخانہ فیصلہ ہے کہ جب انسانوں میں کسی کو مسیح کا باپ نہیں مانا جاتا تو ضروری ہوا (العیاذ باللہ) کہ خدا ہی کو ان کا والد مان لیا جائے۔ ان مقامات میں خود سوچئے کسی قسم کا کوئی منطقی ربط ہے؟ اور میں تو کہتا ہوں کہ انسانوں میں مسیح (علیہ السلام) کا کوئی باپ اگر عیسائیوں کو نہیں ملا تھا' اور خواہ مخواہ والدہ کے ساتھ ان کی پیدائش کے سلسلے میں والد اور باپ کا توسط ان کے نزدیک کسی وجہ سے ناگزیر ہی تھا تو صرف توسط کے لئے انجیل کا یہ فقرہ یعنی:

(بقیہ آئندہ صفحہ پر)

پڑتا تھا اور نہ جذبات ہی کو ٹھیس لگتی تھی' مگر انہوں نے نہ عقلی احساسات ہی کی پروا کی اور نہ جذباتی تاثرات کا خیال ان کے آڑے آیا' اور ایک ایسا دعویٰ کر بیٹھے جس سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیسے عجیب وغریب تماشے پیدا ہوئے۔ پیش ہونے کے ساتھ ہی عقل جس خیال کو قے کر دیتی ہو' جذبات میں جس سے طوفانی ہیجان پیدا ہو جائے اسی کو وہ خود بھی نگلنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو نگلوانا چاہتے ہیں۔ پھر قرآن اگر یہ کہتا ہے کہ بہت بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے کَبُرَتْ کَلِمَۃً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ یا ایسی بھاری بات جو نہ کبھی سنی گئی اور نہ دیکھی گئی' یعنی لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْئًا اِدًّا تو انصاف شرط ہے کہ جس چیز کو انہوں نے مانا ہے اس کی صحیح تعبیر کے لئے اور کیا کہا جاتا؟ اور یہ تو خیر ''نظریہ ولدیت'' کی وہ باتیں ہیں جو ''ولدیت'' کے اس لفظ سے

(گزشتہ سے پیوستہ) ''مریم نے فرشتہ سے کہا کہ یہ کیونکر ہوگا کہ جب کہ میں مرد کو نہیں جانتی؟ اور فرشتہ نے جواب میں اس سے کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور خدا کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی'' لوقا: ۴۴/۱

یہی فقرہ جس کا حاصل قرآن میں بھی پایا جاتا ہے' اسی سے توسط کی تلاش کی جھوٹی پیاس کو عیسائی چاہتے تو بجھا سکتے تھے یعنی والدہ تو ان کی مریم (علیہا السلام) موجود ہی تھیں' اور روح القدس جس کے نزول کا ذکر انجیل میں کیا گیا ہے' اس کا نفخ جو ایک ملکوتی عمل ہے اسی میں ان کو وہ چیز مل سکتی ہے جسے چاہیں تو والدیت کا قائم مقامی عطا کر سکتے تھے بلکہ اسلامی صوفیوں نے جو یہ لکھا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کا وجود بشریت و ملکوتیت کا ایک برزخی قالب تھا' اماں کی طرف سے وہ بشر تھے اور فرشتہ یا روح القدس یا جبرائیل اور ان کے عمل نفخ نے حضرت مسیح (علیہ السلام) میں ملکوتی شان پیدا کر دی تھی' انہوں نے لکھا ہے کہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی فہم وادراک' عقل وتمیز کی قوت جو مسیح (علیہ السلام) میں پیدا ہو گئی تھی اور انی عبداللہ اتنی الکتب و جعلنی نبیا کے الفاظ گہوارے ہی میں ان کی زبان پر جاری ہوئے تو اسی برزخیت کا نتیجہ ہے۔ برخلاف ان بچوں کے جو بشری والدین کے توسط سے پیدا ہوتے ہیں ان کی روح ماں باپ دونوں کی طرف سے مادی پردوں میں دبی ہوتی ہے۔ اسی لئے روحانی قوتوں کی بیداری کے لئے کچھ مدت درکار ہوتی ہے' مگر مسیح (علیہ السلام) پر صرف ماں کی طرف سے ہلکا سا مادی پردہ چڑھا ہوا تھا' اسی لیے اس مدت کی ضرورت ان روحانی قوتوں کی بیداری کے لیے پیش نہ آئی بلکہ بشری والدین سے پیدا ہونے والے انسانوں کی بقا کا جو عام قدرتی قانون ہے اس سے بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کو جو ہم باہر دیکھتے ہیں تو اس کی توجیہ بھی یہی ہے کہ وہ پورے آدمی ہی کب تھے بلکہ جیسے بے شمار فرشتے' جبرائیل' میکائیل' وغیرہ جس طرح زندہ ہیں۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت مسیح (علیہ السلام) کی زندگی کی بھی ہے' مگر تھوڑا سا بشری حصہ ان کی طرف سے بھی ان کے اندر چونکہ شریک تھا اس لئے بالآخر بشری موت کا قانون آخر میں ان پر نافذ ہوگا۔

پیدا ہو رہی ہیں' باقی اس عقیدے سے خود اس عقیدے کے ماننے والوں کی آئندہ تاریخ کو اور ان کی وجہ سے دنیا کی قوموں کو جن روح گداز' جان فرسا حوادث و واقعات سے گزرنا پڑا اور گزرنا پڑے گا' اس کی تفصیل اس اشارے میں ملے گی جو اسی کے بعد والی آیت میں کیا گیا ہے۔

نظریہ ولدیت سے متعلق عجیب و غریب قرآنی اشارات:

''تو کیا ایسا ہو گا کہ تم اپنی جان کھو دینے والے بن جاؤ گے ان کے (یعنی عقیدہ ولدیت کے ماننے والوں کے) آثار پر اگر نہ ایمان لائے وہ اس بات پر (قرآن پر) مارے غم واندوہ کے''

سورۂ کہف اٹھالیجئے آگے آپ کو یہ آیت ملے گی:

''فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا''

پیشانی کی عبارت اس قرآنی آیت کا حاصل اور ترجمہ ہے۔ یوں تو سورۂ کہف اول سے آخر تک عجیب و غریب اشارات پر مشتمل ہے لیکن کم از کم میرا اپنا ذاتی خیال یہی ہے کہ اس سورۂ میں بھی یہ آیت اور آیت میں بھی ''اثارھم'' کا جز و غیر معمولی توجہ کا مستحق ہے۔ آثار کا لفظ اثر کی جمع ہے' جو اردو میں بھی مستعمل ہے' جس سے شاید وہ صحیح مفہوم دماغوں میں نہ آئے جو خالص عربی زبان میں اثر کے اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے۔ لغت میں اس کی تشریح فارسی کے ان الفاظ سے کی گئی ہے' منتہی الارب میں ہے ''اثر بقیہ چیزے ونشان''

آگے بیان کیا گیا ہے کہ نقش قدم کو بھی اسی لئے اثر کہتے ہیں' پھر عربی کا ایک محاورہ نقل کیا ہے' کہتے ہیں اثر ابعد عین ''درحق کسے گویند کہ حاصل از دست دادہ وآثار ونشان اوطلب نماید'' یعنی اپنی چیز کوئی کھو بیٹھا ہو اور اس کے بعد اس چیز کے آثار اور نشانیوں کو تلاش کرتا ہو۔

حاصل یہی ہے کہ اپنے بعد جن نتائج اور نشانیوں کو چیز چھوڑتی ہے۔ ان ہی کی تعبیر عربی زبان میں آثار کے لفظ سے کرتے ہیں' یہ لغوی تشریح تو آثار کے لفظ کی ہوئی۔

دوسرا لفظ آیت میں باخع کا ہے جس کا مادہ بخع ہے' عام طور پر بخع کا ترجمہ ہلاک کرنا' کر دیا جاتا ہے' مگر عربی زبان کے ایسے محاورے اور زبان زد فقرے مثلاً بخع الارض بالزراعۃ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زمین پر اتنی کاشت کی گئی کی روئیدگی کی صلاحیت جاتی رہی'

اس طرح ''بخع الرکیۃ'' اس وقت بولتے ہیں جب کھودتے ہوئے زمین کے اس طبقہ تک آدمی پہنچ جائے جہاں سے کنویں کا پانی ابلنے لگے۔ بہرحال کسی معاملہ میں جدوجہد کو اس کے آخری حدود تک پہنچا دینا بخع کا عربی لفظ اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

تیسرا لفظ اسف کا ہے، غم واندوہ اس کا ترجمہ کردیا جاتا ہے، مگر سچی بات یہ ہے کہ غم واندوہ حزن وملال کی ایک تو عام کیفیت ہوتی ہے لیکن یہی کیفیت جب شدت اور تیزی میں آخری شکل اختیار کرلیتی ہے جس کے بعد قلبی کلفت اور بےچینی کا کوئی درجہ سوچا نہیں جاسکتا، تب اسف کے لفظ سے قلب کی اس کیفیت کا اظہار کیا جاتا ہے، اسی لئے ایسی زمین جس میں روئیدگی کی صلاحیت قطعی طور پر باقی نہ رہی ہو، ایسی زمین کو ارض اسفتہ کہتے ہیں۔

ان لغوی تشریحات کو سامنے رکھتے ہوئے سیدھے اور سادہ الفاظ میں مندرجہ بالا آیت کا خلاصہ یہی ہوسکتا ہے کہ قرآن پر ایمان لاکر قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے علم وعمل کی تصحیح سے عیسائی قوم اگر محروم رہ گئی ہے تو قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ ان عیسائیوں پر افسوس کرتے ہوئے تم اپنے آپ کو ہلاک کردو گے بلکہ جن آثار ونتائج اور عواقب کو ولدیت کا عقیدہ رکھنے والی یہ قوم دنیا میں چھوڑ کر جانے والی ہے، ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ کو مخاطب بنا کر یہ پوچھا جارہا ہے کہ ان کو سوچ سوچ کر کیا اپنے آپ کو ہلاک کردو گے؟

یہ ہے حاصل اور خلاصہ قرآنی الفاظ کا، اب ظاہر ہے کہ قرآن میں العیاذ باللہ شاعری تو نہیں کی گئی ہے بلکہ جو حقیقت تھی صحیح صحیح جچے تلے الفاظ میں اسی کا اظہار کیا گیا ہے، اور اسی واقعہ سے آگاہی بخشی گئی ہے۔

پس آنحضرت ﷺ کی یہ نفسیاتی کیفیت، یعنی غم والم کا ایسا طوفان آپ کے اندر امنڈتا تھا کہ اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی زندگی تک کو قربان کرنے کے لئے آپ آمادہ تھے، اگر یہ واقعہ تھا، اور واقعہ کے سوا کسی دوسرے پہلو کا احتمال ہی کیا ہے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ ''عقیدہ ولدیت'' کے وہ مہیب روح فرسا، جان گداز نتائج کیا تھے، جن سے رسول اللہ ﷺ اس حد تک متاثر تھے، یقیناً وہ چلتی پھرتی کوئی معمولی بات نہیں ہوسکتی اور اسی لئے میں نے عرض کیا کہ اس آیت میں سب سے زیادہ توجہ وتامل کا مستحق ''اثارھم'' کا جزو ہے، اور اب میں اسی ''اثارھم'' کی تھوڑی بہت تفصیل

کرنا چاہتا ہوں، جس سے معلوم ہوگا کہ اثار اور ھم ان ہی دولفظوں میں درحقیقت نسل انسانی کے ایک خاص طبقہ کی کتنی طویل و عریض تاریخ بند ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ''عقیدہ ولدیت'' یا کسی مخلوق کا بیٹا ٹھہرانا' خواہ آدمی کے عقلی اور جذباتی اقتضاؤں کے لئے جس حد تک نا قابل برداشت ہو دماغ سے بھی ٹکرا کر یہ خیال واپس ہو جاتا ہو اور دل بھی اسے اگل دیتا ہو''کلمة تخرج من افواههم ''ایک بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے'اس میں ''افـــواہ'' یعنی منہ کی طرف سے اس عقیدے کو جو منسوب کیا گیا ہے'اس میں بھی بظاہر اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اس عجیب وغریب دعویٰ کا رشتہ نہ دل سے ہے اور نہ دماغ سے' بلکہ دعویٰ کرنے والوں کے منہ' صرف منہ سے ایک بات نکلتی ہے'ابتداء بھی اس کی منہ سے ہے اور انتہا بھی منہ سے آگے اس کی نہیں ڈھونڈھی جا سکتی۔

مگر کیا کیجئے جب آدمی طے ہی کر لیتا ہے کہ ہم کسی چیز کو بہر حال مان ہی کر رہیں گے تو کوئی نہ کوئی راہ دل کی تسلی کے لئے نکال ہی لیتا ہے۔ مذہب کے متعلق اتنی بات تو بہر حال مسلّم ہے کہ حواس وعقل کے حدود جہاں ختم ہو جاتے ہیں' وہیں سے رہنمائی کا فرض مذہب ادا کرتا ہے' یا یوں کہئے کہ فطرت انسانی کے جن بنیادی سوالوں کے جواب عقلی دسترس سے باہر ہیں' ان کے حل کا ذمہ دار مذہب ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے اور مذہب کی ضرورت اس کے اسی فرض کی بجا آوری میں پوشیدہ ہے' اسی واقعہ کی تعبیر میں عموماً کہنے والے اسی قسم کی باتیں کہہ دیتے ہیں کہ ''مذہب اور دین وراء عقل ہے'' یعنی عقل سے بالاتر حدود کے سوالوں کے جواب سے اس کا تعلق ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا اور نہ ہے کہ بشری جبلت کی بے چینیوں کی تسکین کا جو سامان اپنے پیش کردہ جوابوں سے مذہب مہیا کرتا ہے یہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کے ماننے کی گنجائش آدمی کی عقل اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتی' دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ جبلت کی جس پیاس کا پانی' یا جس بھوک کی غذا فراہم کرتا ہے' یہ ایسا پانی یا ایسی غذا ہوتی ہے جس کے تصور ہی سے عقل اور جذبات میں غثیان اور ابکائی کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے' یہ صحیح نہیں ہے۔

بہر حال زندگی کے جن بنیادی سوالوں کو ہم مذہب کی روشنی میں حل کرتے ہیں واقعہ یہ ہے

کہ ان سوالوں کے جوابوں کے علم یا جاننے کا ذریعہ نہ ہم اپنے حواس کو بنا سکتے ہیں اور نہ اپنی عقل کو' لیکن ایمان یعنی ان جوابوں کو ماننے کی صلاحیت بہر حال ہم میں ہونی چاہئے' ورنہ جن باتوں کے ماننے کی بھی صلاحیت ہم میں نہ ہوگی تو ان ہی پر ایمان لانے یا ماننے کا مطالبہ مذہب کی طرف سے کیسے پیش ہوسکتا ہے' کیا آنکھ کو سننے کا اور کان کو دیکھنے کا مکلّف بنایا جا سکتا ہے۔

ہمارے ہاں کی قدیم کلامی کتابوں میں مذہبی حقائق کے متعلق عموماً ان کے امکان پر جو زور دیا جاتا ہے اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ مذہب اپنے پیش کردہ جوابوں کے متعلق براہ راست جاننے کا نہیں بلکہ صرف ماننے کا مطالبہ کرتا ہے اور اس مطالبہ کی تصحیح کے لئے ضروری ہے کہ فطرت انسانی میں ان امور کے ماننے کی صلاحیت موجود ہو۔ ایسا مذہب جس کی تعلیمات کے ماننے کی بھی گنجائش آدمی کی فطرت میں نہ ہو' کھلی ہوئی بات ہے کہ جنوں یا فرشتوں کا تو وہ شاید ہوسکتا ہے مگر آدمی کا مذہب وہ نہیں بن سکتا۔

بہر حال یہ بڑا طویل افسانہ ہے' خاکسار کی کتاب ''الدین القیم'' کا مطالعہ ان لوگوں کو کرنا چاہئے جن کے لئے میرا یہ مختصر بیان تشفی بخش ثابت نہ ہوا ہو۔

اس وقت میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مذہب اور مذہبی حقائق و امور کے متعلق مذکورہ بالا اصول ایک ایسی جانی پہچانی بات ہے کہ مختلف مذاہب کے مقابلہ وموازنہ میں عموماً دنیا اسی اصول سے کام لیتی رہی ہے۔ پچھلے دنوں یورپ کے ارباب فکر ونظر نے اسی سلسلے میں ''غلو'' سے کام لیتے ہوئے مذہبی حلقوں میں کچھ ایسی باتیں پھیلا دیں کہ ''جاننے'' اور ''ماننے'' کا فرق خام کاروں کے سامنے سے کچھ ہٹ سا گیا اور مذہب جس کی طرف سے ہمیشہ امنوا یعنی ماننے کا مطالبہ پیش ہوتا رہا یعنی دنیا سے کہا جاتا تھا کہ مانو' لیکن سننے والے کہنے لگے کہ ہم تو ان چیزوں کو نہیں جانتے' گویا گلاب کے پھول کو پیش کر کے کہا جائے کہ اس کو سونگھو! اور جواب میں کہہ دیا جائے کہ گلاب کی خوشبو کو ہم سن نہیں رہے ہیں۔

پچھلے دنوں مغربی خیالات سے متاثر ذہنیتوں میں الملائکہ' الجنہ' النار' البرزخ یہ اور اسی قسم کے مذہبی حقائق کے متعلق تذبذب اور شک کی کیفیت جو پیدا کی گئی' اس کی بنیاد ''جاننے'' اور ''ماننے'' کے اس خلط مبحث ہی پر قائم تھی' مذہب تو کہتا تھا کہ فرشتوں کو مانو! لیکن خواہ مخواہ کی

عقلیت کے مدعیوں کی طرف سے کچھ ایسی باتیں پیش ہونے لگیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم فرشتوں کو دیکھ نہیں رہے ہیں حالانکہ ان سے دیکھنے کا مطالبہ ہی کب کیا گیا تھا۔ گویا باور کرایا گیا تھا کہ عقل وحواس کی راہ سے جانی ہوئی باتوں کو مذہب پیش کرتا ہے' تب تو خیر ان کو مان لیا جا سکتا ہے لیکن عقل وحواس کی معلومات میں مذہب اضافہ بھی کر سکتا ہے اس حق سے اس کو محروم کر دیا گیا تھا۔ متعقلوں (زبردستی بہ تکلف عقل کے مدعی۱۲) ایک بڑا طبقہ اسی مغالطہ کے جال میں اب تک پھڑ پھڑا رہا ہے۔ خیر یہ قصہ تو اگلے زمانہ کا ہے لیکن کچھ دنوں سے اسی یورپ میں ایک نئی تحریک مذہبی دائروں میں چل پڑی ہے یعنی اسی مسئلہ کا سہارا لے کر کہ مذہب وراء عقل ہے' اب یہ نیا شگوفہ کھلایا جا رہا ہے کہ عقلی منطق سے جس حد تک جو مذہب جتنا زیادہ دور ہوگا اسی حد تک سمجھا جائے گا کہ سچائی سے وہ زیادہ قریب ہے ایسا مذہب جس کا ہر عقیدہ عقلی معیار پر کھرا ثابت ہو کر نکلے اعلان کر دیا گیا کہ وہ مذہب نہیں بلکہ ایک قسم کا عقلی گورکھ دھندا ہے۔

عیسائی مذہب کا بنیادی عقیدہ یعنی خدا کے متعلق ولدیت کا عقیدہ جس میں ایک کو تین اور تین کو ایک تسلیم کرنے پر آدمی مجبور ہے۔ یہی عیسائی مذہب کی صداقت کی دلیل ہے۔ نہ عقل ہی میں اس کے ماننے کی گنجائش ہے اور نہ انسانی فطرت ہی اس کو قبول کر سکتی ہے۔

بہر حال اسی کا نتیجہ یہ ہوا اور اس کے سوا دوسرا نتیجہ اس کا اور ہو ہی کیا سکتا تھا کہ ایسا مسئلہ جو دماغ کے لئے بھی ٹھیس اور دل کے لئے بھی صرف ٹھوکر ہے وہ ماننے والوں کے افواہ یا ذہنی دائرے ہی میں گھومتا رہا۔ افواہ سے آگے دل ہو یا دماغ کسی سے کسی قسم کا کوئی رشتہ یہ عقیدہ قائم نہ کر سکا۔

''کلیسا'' کا ظہور:

مگر یہ عجیب بات ہے کہ گو بذات خود یہ افواہی مسئلہ زبان اور تالو سے نہ خود آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور نہ اس کے ماننے والے اس کو آگے بڑھانا چاہتے تھے لیکن جس قسم کی گرویدگی عیسائیوں میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کے متعلق پائی گئی ہے' مذاہب عالم کی تاریخ

میں اس گرویدگی اور شیفتگی کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

اس غیر معمولی گرویدگی اور وارفتگی کے اسباب خواہ کچھ ہی ہوں' خدا کو ''صورت انسانی'' میں لانے کا یہ نتیجہ ہو یا ''نظریہ ولدیت'' کے پیش کرنے والوں نے کفارے ❶ کے غلاف میں لپیٹ کر جو اس کو پیش کیا تھا اس چیز نے مذہب کے بازار کا سب سے چلتا ہوا سودا اس کو بنا دیا ہو' یا اس کے سوا دوسرے اسباب و وجوہ ہوں' مگر ہوا یہی کہ خود یہ مسئلہ تو ''افواہ'' کے چکروں میں گھومتا رہا' لیکن اسی سے پھٹ پھوٹ کر جڑوں اور جڑوں کے باریک باریک ریشوں اور رگوں کا ایک طویل سلسلہ اندر ہی اندر ماننے والوں میں بڑھتا اور پھیلتا رہا' اور جوں ہی ساز گار حالات میسر آئے ان ہی جڑوں سے شاخیں نکلیں' برگ و بار آئے' آخر میں ''کلیسا'' کے نام سے مذہبی دنیا میں ایک ایسے تناور بلند و بالا گھنے درخت کی شکل اس نے اختیار کر لی' جس کی نظیر مذاہب و ادیان کی تاریخ میں نہ پہلے ملتی ہے اور شاید اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے بعد کو بھی اس کی مثال مشکل ہی سے ڈھونڈھی جا سکتی ہے۔

❶ مطلب یہ ہے کہ مذاہب و ادیان میں کچھ چیزیں تو منوائی جاتی ہیں اور جن باتوں کے منوانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے ان کی بنیاد پر عملی مطالبات کی بھی ایک فہرست ماننے والوں کے سامنے رکھی جاتی ہے اسی لئے ایمان و عمل پر ہر مذہب کی بنیاد قائم ہے۔ بنیادی تعلیم میں تو تقریباً ہر مذہب میں ایمان و عمل دونوں پر زور دیا جاتا ہے' لیکن آگے قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں (یعنی ایمان و عمل) میں سے کسی ایک چیز کی پابندی میں قصور کا کیا نتیجہ ہوگا؟ اسی سوال کے جواب میں اپنے طبعی رجحانوں کی بنیاد پر بعضوں نے ایمان پر اور بعضوں نے عمل پر زور دے دیا۔ ہندو مذہب میں گیان کانڈ' کرم کانڈ کے قصوں کی بنیاد نقطہ نظر کے اسی اختلاف پر قائم ہے' مسلمانوں میں بھی مرجیہ اور معتزلہ و خوارج وغیرہ اسی سلسلہ کی شاخیں ہیں۔ مرجیہ کے نزدیک ایمان ہی سب کچھ ہے' ایمان ہو مگر عمل نہ ہو تو نجات سے مؤمن محروم نہ رہے گا ان کے مقابلہ میں معتزلہ و خوارج کے نزدیک اس ایمان کی کوئی قیمت نہیں جس سے صحیح عمل پیدا نہ ہو۔ مذہب یہود کا عمومی رجحان بھی عملیت کی طرف تھا جس کی تعبیر وہ شریعت سے کرتے تھے۔ سینٹ پال نے ولدیت کا نظریہ جب عیسائیوں میں پیش کیا تو اسی کے ساتھ وہ اس کی منادی بھی کرتا جاتا کہ:

''اب شریعت کے بغیر خدا کی راست بازی ظاہر ہوئی ہے''

یہ شریعت کے بغیر خدا کی راست بازی کیا تھی؟

''یعنی وہ راست بازی جو مسیح پر ایمان لانے سے سب ایمان والوں کو حاصل ہوئی ہے'' (بقیہ آئندہ)

بہ ظاہر عیسائی دنیا کلیسا کی اس چھاؤں کے نیچے سمٹی ہوئی سمجھی جاتی تھی، لیکن درحقیقت وہ ان جڑوں میں جکڑی ہوئی تھی جو اندر ہی اندر پھوٹتی اور بڑھتی ہوئی زنجیروں، لوہے کی زنجیروں کی طرح سر سے پاؤں تک عیسائیوں کے ظاہر و باطن کے ساتھ چمٹ گئی تھی۔

''کلیسا'' کا نظام کیسے قائم ہوا، ابتداء اس کی کس شکل میں ہوئی، یہودیوں یا اولاد اسرائیل کے محدود دائرے سے نکال کر عیسائیت کے پیغام کو یورپ کی غیر مختون غیر اسرائیلی قوموں میں پہنچانے میں تدبیر کرنے والوں نے کن کن گفتہ و ناگفتہ بہ تدبیروں سے کام لیا؟

شاول جس کا نام بعد کو پولس اور آج کل سینٹ پال ہے یہ شخص کون تھا؟ ایشیا کوچک کے صوبہ کلکیہ کے شہر ترسیس اپنے مولد سے یہ فلسطین کیسے پہنچا اور وہاں یہودی علماء کے وفادار شاگرد کی صورت اختیار کرکے مسیح کے ماننے والوں پر مظالم کے پہاڑ پہلے جو اس نے توڑے اور آخر میں عیسائیوں کو ستانے کے لئے ہیکل کے یہودی علماء کے تصدیقی خطوط لے کر جب وہ دمشق جا رہا تھا تو اچانک اس کا یہ دعویٰ کہ مسیح علیہ السلام کی روح اس پر متجلی ہوئی اور غیبی آواز آئی۔

''اے شاول، اے شاول تو مجھے کیوں ستاتا ہے''

پھر جیسا کہ اس کا بیان ہے اس کے یہ پوچھنے پر اے خداوند تو کون ہے؟ یہ جواب ملا کہ:

''میں یسوع ہوں، جسے تو ستاتا ہے، مگر اٹھ شہر میں جا اور تجھے جو کرنا چاہئے وہ تجھ سے کہا

گزشتہ سے پیوستہ) راست بازی کے حاصل کرنے کے اس طریقہ کا نام ''مفت کی راست بازی'' رکھا گیا۔ سینٹ پال کے اس خط میں ہے۔

''اس مخلصی کے وسیلہ سے جو یسوع مسیح میں ''مفت راست باز'' ٹھہرائے جاتے ہیں'' توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ:

''اسے (یعنی یسوع مسیح) کو خدا نے اس (یسوع مسیح) کے خون کے باعث ایسا کفارہ ٹھہرایا ہے جو ایمان لانے سے فائدہ مند ہوتا'' (رومیوں کے نام سینٹ پال کا خط، باب ۳)

کہا جاتا تھا کہ ایک گناہ کی دو سزائیں خدا کی طرف سے نہیں مل سکتیں اپنے ماننے والوں کے گناہ کی سزا میں مسیح جب ایک دفعہ صلیب پا کر سزا جھیل چکا تو ماننے والوں اور مسیح پر ایمان لانے والوں کو ان کے انہیں گناہوں کی سزا دوبارہ کیسے دی جا سکتی ہے یہی کفارہ کا مسئلہ ہے۔ مسیحی دنیا میں یہ سوال وجواب یعنی میں کیا کروں کہ نجات پاؤں: مسیح یسوع پر ایمان لا تو بچ جائے گا'' ایک عام زبان زد فقرے کی حیثیت سے مشہور ہے۔

جائے گا۔(اعمال ۴۔۵/۹)

پھر بجائے دشمن کے مسیحیت کا مبشر اور منادی کرنے والا وہ کیسے بن گیا؟ کہاں کہاں پھرا' اورآخر میں بہ عہد شاہ نیرو رومیوں کے دارالسلطنت ''رومۃ الکبریٰ'' میں قیدیوں کی شکل میں وہ کیسے پہنچا؟ وہیں وہ مارا گیا' دفن ہوا' پھر اس کے مدفن اور اس کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری پطرس [1] کی جعلی قبر کا دعویٰ کر کے رومہ میں عیسائیت کا مرکز کیسے قائم کیا گیا' جس نے آخر میں ''کلیسائے رومہ'' کا نام پایا۔ اور اسی رومی کلیسا کی اجتماعی طاقت کا شخصی مظہر یا اقتدار اعلیٰ پوپ کے نام سے گدی پر کیسے آ گیا؟ پھر ایک کے بعد ایک اسی طرح پوپوں کا جانشینی کا سلسلہ شروع ہوا' رفتہ رفتہ بالآخر کلیسائے روم کے پوپ کا اقتدار مطلق' اور اس کے غیر محدود اختیارات عروج کے اس نقطہ تک پہنچ گئے کہ ان کے آگے عوام تو عوام سلاطین اور بادشاہوں کی بھی نہیں چلتی تھی' یورپ کے عیسائیوں کی جان و مال' عزت و آبرو کے مالک پوپ اور پوپ کے وہ نمائندے تھے جو اس ملک کے طول و عرض میں گرجے بنا بنا کر کیڑوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ سب کماتے تھے اور وہ کھاتے تھے۔

یہ سارے سوالات ایسے ہیں جن کے جواب کے لئے ہزار ہا ہزار صفحات کی ضرورت ہے' تفصیل کے لئے تو یورپ کی عام تاریخ اور کلیسائے رومہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہئے لیکن بطور نمونہ چند تاریخی شواہد کا پیش کر دینا غالباً ان لوگوں کے لئے مناسب ہو گا جنہوں نے ''دین صلیبی'' اور یورپ جس صورت حال سے اس دین میں داخل ہونے کے بعد دوچار ہوا' ان باتوں کی تاریخی تفصیلات کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔

---

[1] کلیسائے رومہ کی عظمت کا زیادہ تر دارومدار مدت تک پطرس کا مصنوعی مدفن تھا' لیکن حال میں اس خیال کو غلط ٹھہرایا گیا ہے اب سمجھا جاتا ہے کہ پطرس عراق اور ایران کے درمیانی علاقوں میں عیسائیت کا پرچار کرتے ہوئے کہیں مر گیا' سینٹ پال اور پطرس میں اختلافی نقطہ نظر یہ تھا کہ پال کے نزدیک ''صرف مسیح کو خدا کا بیٹا مان لینا'' محض یہی نجات کے لئے کافی ہے لیکن پطرس موسوی شریعت کے احکام کی تعمیل کو بھی ضروری قرار دیتا تھا۔ جرمنی کے ارباب تحقیق کچھ دن ہوئے اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ سینٹ پال کی ساختہ پرداختہ عیسائیت حضرت مسیح علیہ السلام کی پیش کردہ عیسائیت سے مختلف تھی اور یہ اختلاف شروع ہی سے چلا آ رہا تھا۔ (دیکھو تاریخ بائبل بلیکی' ترجمہ طالب الدین ص: ۵۱۸)

مختصر یہ ہے کہ تقریباً تین سو سال تک تو سینٹ پال کا پھیلا ہوا ''صلیبی دین'' اور نظریہ ولدیت کے ساتھ کفارہ کا مسئلہ اندر ہی اندر یورپ کے باشندوں میں پھیلتا رہا۔ بت پرست رومی حکومت نے اس جدید دینی تحریک کی مخالفت میں اپنا آخری زور صرف کر دیا مگر جتنا اس کو دبایا جاتا تھا اسی قوت کے ساتھ یہ تحریک آگے بڑھتی چلی جاتی تھی۔ تا ایں کہ تین سو سال بعد کہتے ہیں کہ بت پرست رومی بادشاہ قسطنطین نے بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ خود وہ اس دین کو قبول کر لے گویا یوں رومی حکومت بجائے دشمن کے صلیبی دین کی دوست اور پشت پناہ بن گئی۔ حکومت کی اسی پشت پناہی کے زیر اثر رومہ کے کلیسا کا اقتدار غیر معمولی طور پر بڑھنے لگا' یورپ کی مستند تاریخ جس کے مصنف گرانٹ صاحب ہیں اپنی کتاب میں انہوں نے چند وثایق کا تذکرہ کیا ہے جن کے متعلق کلیسائے رومہ کا دعویٰ تھا کہ وقتاً فوقتاً رومی حکومت کی طرف سے اسے عطا ہوئے' جن میں ایک مشہور قدیم وثیقہ وہی ہے جس کا نام ''عطیہ قسطنطین'' تھا' گرانٹ صاحب نے اس کا ترجمہ یہ درج کیا ہے۔

''شاہنشاہ کانسٹن ٹائن (قسطنطین) وفادار' رحم دل' قادر و نیک منش بادشاہ اقوام المانی و سریانی و جرمانی و برطانی و ہونی' پارسا' وخوش نصیب فاتح و غازی و ذی شان' مرض جذام میں مبتلا تھا اور بت پرست پجاریوں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ معصوم بچوں کے خون میں نہائے بغیر اسے صحت نہیں ہوسکتی مگر سینٹ پال اور سینٹ پیٹر کی دعاؤں سے اسے صحت حاصل ہوئی اور صحت یابی کے شکریہ میں اس نے حکم دیا کہ کلیسائے رومہ کا ''قسیس اعلیٰ'' تمام دنیا کے قسیسوں کا سردار ہوگا اور پوپ سلوسٹر ہمارے محلات رومہ اور خود شہر رومہ اور اطالیہ کے تمام اضلاع اور صوبوں اور ممالک غرب (یورپ) پر قابض رہے گا۔''

گرانٹ صاحب نے لکھا ہے کہ اسی عطیہ قسطنطین کے آخر میں یہ الفاظ بھی تھے۔

''ان احکام میں ختم عالم تک کسی قسم کی ترمیم یا تغیر نہ کیا جائے''

(دیکھو گرانٹ کی تاریخ پوپ ص: ۲۰۲' ترجمہ اردو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ)

مطلب یہ تھا کہ رومہ جہاں دعویٰ کیا جاتا تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے براہ راست صحابی

یا حواری پطرس جن کا اصلی نام شمعون تھا' ان کا درگاہ ہے اور اسی کے ساتھ پولس یعنی سینٹ پال کا مدفن بھی وہیں بتایا جاتا تھا گویا دونوں درگاہوں کے مجاوروں کی طرف سے بادشاہ کو خوش خبری صحت کی سنائی گئی۔ صحت کے بعد یہ صلہ شاہی دربار سے ملا۔ گرانٹ صاحب نے لکھا ہے کہ:

''پندرہویں صدی عیسوی تک جس میں یورپ میں پھر علوم کا دور دورہ نہ ہوا' کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس تحریر کو جعلی قرار دے یا اس کی صحت میں شک و شبہ کرے''
(ص:۲۵۱ کتاب مذکور)

بعد کو جو کچھ ہوا اس کا قصہ تو آگے آ رہا ہے اتنی بات تو عرض بھی کر چکا ہوں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواری پطرس کی درگاہ ہی کو اس زمانہ میں فرضی قرار دیا گیا ہے لیکن بقول گرانٹ صاحب ۸۲۰ء جس میں مذکورہ بالا وثیقہ کا اعلان کلیسا کی طرف سے کیا گیا تھا اس وقت سے ہزار بارہ سو سال تک اس کے متعلق شک کا خیال بھی ارتداد و کفر کے ہم معنی تھا۔

اور ایک یہی کیا' اسی قسم کے بیسیوں ذرائع مسلسل اختیار کئے گئے تا ایں کہ بقول گرانٹ صاحب گیارہویں صدی عیسوی کے مشہور پوپ گری ہفتم کے زمانہ میں کلیسا کی طرف سے یورپ کے حکمرانوں اور سلاطین و امراء اور عام باشندوں کو خطاب کر کے یہ اعلان شائع کر دیا گیا' کہ:

''پاپائے رومہ کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں' اس کے افعال پر حرف گیری کرنے والا کوئی نہیں کلیسا رومہ کو نہ کبھی دھوکا ہوا ہے اور نہ ہوگا''۔

اسی میں یہ بھی تھا کہ:

پوپ کو شہنشاہوں کے معزول کرنے کا اختیار ہے۔ انسانی نخوت نے بادشاہوں کی قوت پیدا کی اور خدا کے رحم نے بشپوں کی قوت پیدا کی۔

آخر میں تھا کہ:

''پوپ شہنشاہوں کا آقا ہے''۔ (کتاب مذکور ص ۲۶۸)

اور یہ صرف دعویٰ ہی نہ تھا جنہوں نے یورپ کی قرون متوسط کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہی واقعہ بھی تھا۔ اس قسم کی تحریریں جیسا کہ گرانٹ ہی نے لکھا ہے' عموماً پوپوں کی

طرف سے بادشاہوں کو دھمکانے کے لئے شائع ہوتی رہتی تھیں کہ:

''خدا نے ہمیں (یعنی پوپ اور پوپ کے چیلے چانٹوں کو) بادشاہوں اور شہنشاہوں کا سرتاج بنایا ہے' تاکہ ہم اس کے نام سے جسے چاہیں اکھاڑ پھینکیں' تباہ کر دیں اور اگر چاہیں تو تخم ریزی کریں اور نئی عمارت بنائیں۔''

یہ دعویٰ بھی کیا جاتا تھا کہ:

''اگر دنیاوی حکومت سے غلطی ہو جائے تو روحانی حکومت اس کی اصلاح کر سکتی ہے' اور اگر روحانی حکومت سے کوئی غلطی سرزد ہو تو اس کا انصاف کرنے والا خدا ہے''

اور یوں یورپ کی ساری دنیاوی حکومتوں کے حکمران' روحانی حکمران یعنی پوپ اور پوپ کے نمائندوں کے آہنی پنجوں میں اس طرح دبے ہوئے تھے کہ بلا چون و چرا پوپ کے احکام کی تعمیل کرتے چلے جائیں' اس کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ باقی نہ رہا تھا۔

عام رعایا برایا ان ہی حکمرانوں کے قبضے میں تھی' اس لئے نتیجتاً یورپ کے عام باشندے کلیسا کے احکام سے سرتابی کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔

ماسوا اس کے ''اعتراف گناہ'' کا ایک طریقہ بھی کلیسا کی طرف سے عوام میں جاری کیا گیا تھا' پوپ کے نمائندے ملک کے طول و عرض میں میل دو میل کے فاصلوں سے اپنے تھانے ''چرچ'' بنائے بیٹھے رہتے تھے' ان کا کام یہی تھا کہ توبہ کرنے والوں کے گناہوں کی فہرست کی خلوت میں سماعت کریں اور جو معاوضہ طے ہو جاتا تھا اس کو لے لے کر مغفرت اور بخشش کا لائسنس توبہ کرنے والوں کو عطا کیا جاتا تھا۔ اس مغفرت نامہ کو تاریخوں میں آج بھی لوگ نقل کرتے ہیں جس سے توبہ کرنے والوں کو کلیسا کے نمائندے سرفراز کرتے تھے۔ ابتداء اس مغفرت نامہ کی ان الفاظ سے ہوتی تھی:

''ہمارا رب مسیح تجھ پر رحم کرے' اور جن مقدس تکلیفوں کو اٹھا کر مسیح کو جو حقوق حاصل ہوئے ہیں ان کے معاوضہ میں تیرے گناہ معاف ہوں''

مغفرت نامہ کی پیشانی کی اس عبارت کے بعد آگے یہ ہوتا تھا:

''پس معلوم ہوا کہ مسیح کے رسولوں پطرس و پولس اور جلیل القدر پوپ کی حکومت نے اس

خاص علاقے میں جو یہ اقتدار مجھے بخشا ہے کہ تمہارے ان گناہوں کو میں معاف کر دوں جو تم سے صادر ہو چکے ہیں' یا کلیسا کی طرف سے تم پر عائد ہوتے ہیں خواہ وہ جیسے کچھ ہوں اور جو کچھ بھی ہوں' نیز ایسے سارے گناہ جن کے بخشنے اور جن کی بندش سے کھولنے کا اختیار پوپ صاحب کو ہے' وہ سب تیرے بخشے گئے۔ اسی طرح ''کلیسائے رومہ'' کی کنجی جتنی دراز ہے' اسی کی نسبت سے تیرے ایسے گناہ بھی معاف کئے گئے جو آئندہ تجھ سے سرزد ہوں۔ اب میں تجھے کلیسا کے رموز اور اسرار میں شریک کرتا ہوں اور جس وحدت کو کلیسا نے پیدا کیا ہے وحدت کے اسی دائرے میں تجھے داخل کرتا ہوں۔

آخر میں لکھا ہوتا تھا' کہ:

اب جو تو مرے گا تو عذاب کے دروازوں کو اپنے اوپر بند پائے گا اور فردوس بریں کے دروازوں کو اپنے اوپر کھلا پائے گا۔ بہرحال جس زمانہ میں بھی تو مرے گا تو اس ''مغفرت نامہ'' کی تاثیری قوت سے تو ہمیشہ باپ بیٹے اور روح القدس کے نام سے مستفید ہوتا رہے گا''
(آمین) (منقول از اظہار الحق' عربی ص ۳۷ ج ۲۰)

مغفرت ناموں پر باضابطہ فیس کی ابتداء اگرچہ صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں کہتے ہیں کہ ہوئی' لیکن جب رواج پڑ گیا تو اس کی تجارت نے رفتہ رفتہ سارے یورپ میں غیر معمولی فروغ حاصل کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ سلاطین کے عزل ونصب کے مسئلہ کو قابو میں لانے کے ساتھ ''اعتراف جرم'' کے پردے میں لوگوں کی شخصی زندگی کی کمزوریوں کا علم کلیسا کے پاس ایک ایسا شکنجہ تھا کہ پادری سب کچھ کر رہے تھے جسے اس شکنجے میں جکڑے ہوئے عوام دیکھتے تھے مگر کچھ بول نہیں سکتے تھے' عوام کا مال' ان کی جان اور آخر میں عزت و ناموس سب پر اطلاقی تصرفات کا اقتدار پادریوں کو حاصل تھا۔

کلیسا کی آڑ میں:

کلیسائی رہبانیت کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں وکثیر منھم فاسقون ان راہبوں

کی اکثریت فاسق بن گئی کا جو اعلان کیا گیا ہے' اس قرآنی آیت کی تفسیر سے یورپ کی تاریخیں معمور ہیں' موشم نے تاریخ کلیسا میں لکھا ہے کہ:

''متاہل اور شادی شدہ لوگوں پر مانا جاتا تھا کہ شیطان کا اثر ہے' اس لئے جو لوگ کلیسا میں عہدہ حاصل کرتے تھے' وہ شیطانی اثر سے محفوظ رہنے کے لئے شادی نہ کرتے تھے' اسی طرح عورتیں بھی تجرد کی زندگی اختیار کرتی تھیں''۔

مگر اس ابتداء کی انتہا کیا ہوئی؟ موشم ہی کا بیان ہے کہ:

''لیکن یہ ساری باتیں صرف دکھاوے کی تھیں' مجرد مردوں کے بستر رات کو مجرد عورتوں سے آباد نظر آتے تھے' یہ عورتیں مردوں کی ناجائز خواہشوں کو پورا کرتی تھیں''

اس نے لکھا ہے کہ:

''ایک عورت معمولاً ایک مرد کے تصرف میں نہیں رہتی تھی' آج ایک عورت آئی تو کل دوسری' اسی طرح در پردہ یہ سلسلہ قائم رہتا' مگر بہ ظاہر یہی کہا جاتا تھا کہ مجرد مرد اور مجرد عورتیں اپنی رسائی اور عفت کو قائم رکھتی ہیں''۔

''مقدس کلیسا'' کی ان اندرونی غلاظتوں اور گندگیوں کا مشاہدہ اور تجربہ کبھی کبھی بعض نیک دل پادریوں کو بھی بے چین کر دیتا تھا۔ برنردوس نامی اسقف کی ایک نظم اس سلسلہ میں خاص طور پر مشہور ہے' جس کے ایک شعر کا ترجمہ ہے:

> ''نکاح کے معزز اور پاک آئینی طریقہ کو کلیسا سے خارج کر دیا گیا' جس سے پاک خواب گاہ وہ آدمی کو میسر آتی تھی' اور بجائے اس کے کلیسا کی خواب گاہوں کو عیاشی کا چکلہ بنا دیا گیا ہے' جن چکلوں میں مرد اور عورتیں جو ماں اور بہنیں ہیں' ہر قسم کے گندہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں''۔

ایک پرتگالی پادری الفاروس بلاحیوس نامی نے مغربی ممالک کے عام کلیساؤں کی ان ہی اخلاقی زبوں حالیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے خصوصاً اسپین کے متعلق لکھا ہے کہ:

''کاش ایسا ہوتا کہ کنوارے رہنے کا جو عہد کلیسا میں شریک ہونے والوں سے لیا جاتا ہے یہ عہد نہ لیا جاتا۔ آج اسی عہد کا نتیجہ یہ ہے کہ اسپین کے عام باشندوں کے بچوں میں زیادہ اکثریت

کلیسا کے مذہبی خدام کے بچوں کی ہے"(اظہار الحق' ج ۲۔عربی)

الغرض کلیسا کی "رہبانیت" باہر سے جیسی کچھ نظر آتی ہو لیکن بتدریج اندر ہی اندر یہی "رہبانیت" فسق کی "اکثریت" کے قالب میں ڈھل گئی۔قرآن کا یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تائید سے کلیسا کی تاریخیں لبریز ہیں۔ان اندرونی گندگیوں اور غلاظتوں کے ساتھ ساتھ اسی کلیسا کی قوت کے بدولت باہر میں "پوپ" کالاہوتی' اقتدار بڑھتے بڑھتے اس نقطہ تک پہنچ گیا تھا کہ کلیسا کی طرف سے فرنسیس زابادلا جو پوپ کے مجلس خاص (ڈیکن) کارڈ نیال تھا ❶ اسی نے یہ اعلان عام کر دیا تھا کہ:

"پوپ کو حق حاصل ہے کہ جو کچھ اس کے جی میں آئے کرے تا ایں کہ خدا نے جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے' پوپ چاہے تو ان کو حلال قرار دے سکتا ہے"

آخر کے الفاظ (العیاذ باللہ) اس "اعلان عام" کے یہ تھے:

"پوپ (اقتدار) خدا سے بھی بڑھا ہوا ہے"(اظہار الحق عربی' ج ۱۲۲)

اور آئے دن پوپ اپنے اس فرعونی اقتدار سے عموماً کام لیا کرتا تھا

پروفیسر میکائیل (میخائیل) کی عربی کتاب جو بیروت میں ۱۸۵۲ء چھپی ہے' اس میں آپ کو طویل فہرست ان چیزوں کی ملے گی' جن میں پوپ نے اپنے اقتدار سے ردو بدل کیا تھا۔ میخائیل نے لکھا ہے:

"روپیہ لے کر حرام کو حلال' حلال کو حرام کر دینا یہ پوپ کا عام دستور تھا"

مغفرت نامہ کی تجارت' یا حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرانے کا مقدس معاوضہ اور عام نذرو نیاز اور اوقاف ❷ وغیرہ وغیرہ کی آمدنی کے بے شمار ذرائع کے سوا' یہ شاعری نہیں واقعہ ہے

---

❶ کلیسائی نظام میں مختلف عہدوں کے مختلف نام تھے۔اسقف جو یونانی لفظ کا معرب ہے یہ سب سے بڑا عہدہ تھا' انگریزی میں اس کو "بشپ" کہتے ہیں۔اسقفوں کے بعد قسیس' قسیس کے بعد بشپ اور پریلیٹ کا درجہ تھا۔ پوپ کی کونسل اعلیٰ کا نام ڈیکن تھا جس کے ارکان کی تعداد ستر تھی' اس کونسل اعلیٰ کے ہر رکن کو "کارڈینال" کہتے تھے۔۱۲

❷ چرچ کے ساتھ کسی سینٹ (ولی) یا شہیدوں کی قبروں کا جال ملک کے طول وعرض میں پھیلا ہوا تھا' اور یہ عجیب بات تھی کہ ہر تازہ مردہ بہ نسبت پرانے مرنے والوں کے عقیدت و نیاز کی مرکزیت (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

کہ خدا کی رحمت سیر اور پاؤ سیر کے حساب سے کلیسا اور کلیسا کے نمائندوں کی طرف سے عموماً بکتی تھی۔ عام قاعدہ تھا کہ سکرات موت کے وقت علاقہ کے پادری کا مرنے والے کے سرہانے رہنا ضروری تھا کوئی جاگیردار مر رہا ہے' پادری صاحب بلائے گئے' مراقبہ میں ان کو محسوس ہوا کہ مرنے والے کی روح کو لینے کے لئے سیاہ سیاہ آتشین آنکھوں والی خبیث روحیں اتر رہی ہیں پادری اس حال سے لوگوں کو مطلع کرتا ہے پھر کیا کیا جائے کلیسا کے نام سے جائداد وقف کی جائے اور منت مانی جائے' یہ کیا جائے وہ کیا جائے' جب سارے مراحل طے ہو جاتے تب پادری سر بگریباں ہو جاتا اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ بشارت سناتا کہ خبیث روحیں واپس ہو گئیں اور مجھے دکھایا گیا کہ نورانی ہستیاں پاک روحیں اب اتر رہی ہیں۔

الغرض گوناگوں نت نئے طریقے کلیسا کی طرف سے اس لئے تراشے جاتے تھے کہ ملک کے باشندوں کی کمائی ہوئی آمدنی کسی نہ کسی طرح کلیسا کے حکام اور خدام کے پیٹ میں اترتی چلی جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غریب عوام کی مذہبی زود اعتقادیوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے دنیا کے اکثر مذاہب و ادیان میں پیدا ہوتے رہے ہیں' اور کسی نہ کسی شکل میں آج تک ابلہ فریبیوں کا یہ سلسلہ دنیا میں جاری ہے لیکن دین صلیبی میں کلیسا اور پوپ کے نام سے جو نظام قائم

(گزشتہ سے پیوستہ) میں آگے بڑھ جاتا تھا۔ انگلستان کی تاریخ میں لکھا ہے کہ صلیبی لڑائیوں کے بھگوڑوں نے ''خیر سے بدھو گھر آئے'' اس کی خوشی میں انگلستان کی قربان گاہوں اور چلوں میں جو نذریں چڑھائیں تو ملا مس بکٹ اسقف جو تازہ مردہ تھا' اس کی قبر پر تو اسی ہزار تین سو چھتیس (۸۰۳۳۶) روپے چڑھاوے کی آمدنی ہوئی' لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت مریم علیہ السلام کی قربان گاہ کے چڑھاوے کی میزان کل تین سو بتیس (۳۳۲) روپے تھی' اور اس سے بھی طرفہ ماجرا یہ تھا کہ خود خدا کے بیٹے مسیح کی قربان گاہ پر اکتیس (۳۱) روپیہ کی آمدنی ہوئی' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کے باپ کے نام سے ایک پیسہ بھی نہ آیا۔

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ان ہی بھگوڑوں میں جو دینی زندگی میں ایک گونہ امتیاز کے مدعی تھے اپنے ساتھ کچھ تبرکات یروشلم سے لائے تھے جن میں مسیح کی صلیب کا ایک ٹکڑا' مسیح کا خرقہ اور وہ پتھر بھی تھا جس نے مسیح کو دکھ دیا تھا اور سب سے دلچسپ وہ کرن تھی جس کے متعلق ان کا دعویٰ تھا کہ اس ستارے کی یہ کرن ہے جسے مجوسیوں نے مسیح کا ستارہ قرار دے کر سجدہ کیا تھا۔

ہوا تھا اس کی نوعیت ''ابلہ فریبیوں'' کے عام قصے سے قطعاً الگ تھلگ تھی' اسی لئے باوجود اہتمام اختصار کے مجھے کچھ تفصیل سے کام لینا پڑا جس سے کلیسا اور پوپ کے غیر معمولی اقتدار کا کچھ اندازہ پڑھنے والوں کو ہوسکتا ہے۔

دوسرے مذاہب وادیان میں زیادہ سے زیادہ یہ دیکھا گیا ہے کہ وقت کے حکمرانوں پر کسی ''مذہبی شخصیت'' کا اثر قائم ہوا اور اس ''اثر'' سے اچھا یا برا کام اپنے اپنے وقت پر لینے والے لیتے رہے' لیکن پوپ کے ''دین صلیبی'' کا کلیسائی نظام شخصی نظام نہ تھا' بلکہ وہ باضابطہ ایک ایسا مستقل نظام تھا کہ ہزار بارہ سو سال تک بقول جوک

''شہنشاہی اور پاپائی کی مثال علی الترتیب ''چاند اور سورج'' سے دی گئی ہے''

(کتاب ارتقائے نظم حکومت ج ا ص ۴۶۲)

جس کا مطلب یہ تھا کہ یورپ کے عام سلاطین وملوک ہی بلکہ شہنشاہی کے اقتدار رکھنے والی ہستیوں کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کی قوت کا نور کلیسائے روم کے پوپ کے نور اقتدار کا عکس ہے جیسے چاند کا نور آفتاب کے نور کے ساتھ وابستہ ہے۔

''سیاسی حکمرانوں کو کلیسا کے مذہبی حکمران کے ماتحت رکھنے کے لئے یہ طے کر دیا گیا تھا کہ اس کا فریضہ نائب عیسیٰ (پوپ) کے ہاتھ میں ہونا چاہئے کیونکہ وہی تنہا بادشاہوں اور حکمرانوں سے بالاتر تھا''

کہا جاتا تھا کہ پوپ حضرت مسیح کے حواری کا جانشین ہے۔ اور پطرس حضرت مسیح کا جانشین تھا' بقول جوک:

''اس سے یہ دعویٰ نکلا کہ جو حکمراں (اور بادشاہ) مقدس پطرس کے جانشین کے احکام کی خلاف ورزی کرے پوپ اسے معزول کردے' اور اس سے مزید یہ ادعا پیدا ہوا کہ جو صاحب اقتدار معزول کرسکتا ہے وہ نصب اور تقرر سے انکار بھی کرسکتا ہے۔''

یہی ایک ایسی صورت حال ہے جس کی نظیر یورپ کے ''دین صلیبی'' کے سوا کسی دین میں نہیں مل سکتی۔ اگر کلیسا کے اس اقتدار سے کام لینے والے صحیح کام لیتے تو اس میں شک نہیں کہ جیسا کہ جوک نے لکھا ہے:

''اس بے لگام' خودغرض (یعنی شاہی اقتدار کے مطلق العنان حکام) کے لئے کسی نہ کسی تدارک کا ہونا ضرور تھا اور اس کا صاف وسہل علاج یہی معلوم ہوتا تھا کہ قسیسوں (حکام کلیسا) کی طرف سے زجر وتوبیخ ہوتی رہے''۔

مگر آپ دیکھ چکے ہیں کہ ''کلیسا'' کیا آڑ لے کر صلیبی دین کے نمائندوں نے کتنی گھناؤنی قسم کی بے دینیوں سے یورپ کو بھر دیا' جان و مال' عزت و ناموس اس ملک کے ہر باشندے کا مذہب کے ان نمائندوں کی حیوانی اور نفسانی خواہشوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔

سال دو سال نہیں بلکہ چوتھی صدی عیسوی سے مذہبی غارت گریوں کا یہ سلسلہ شروع ہوا' اور ہزار سال سے زیادہ مدت تک دن دونی ترقیوں کے ساتھ اس کے ظلم وتعدی کا دائرہ بڑھتا ہی چلا گیا۔

فطرت انسانی قدرتاً ان حالات سے جس حد تک بے چین اور مضطرب ہو سکتی ہے اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو انسانی احساسات لے کر پیدا ہوا ہے۔

دباؤ کی انتہا اور پروٹسٹنٹ فرقہ کا خروج:

یورپ کے یہ باشندے جنہوں نے صلیبی دین قبول کر لیا تھا' وہ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے دیکھتے رہتے تھے' تڑپتے تھے' تڑپنا چاہتے تھے' لیکن تڑپنے کی بھی گنجائش ان کے لئے باقی نہیں چھوڑی گئی تھی۔ ایک طرف سلاطین وملوک کی فوجی قوتوں کا دباؤ ان کو ہلنے نہیں دیتا تھا' جس کی وجہ ظاہر تھی کہ فوج کی قوت ہو یا پولیس کی قوت' حکمران اقتدار کے منشاء کی تعمیل کرتی ہے اور حکمرانی کے اقتدار رکھنے والی طاقتیں چونکہ پوپ یا کلیسا کے غیر مسؤل اقتدار کی چٹان کے نیچے ہر جگہ دبی ہوئی تھیں اس کا لازمی منطقی نتیجہ تھا کہ کلیسا یا پوپ یا پوپی نظام کے تحت کام کرنے والوں کے متعلق لب ہلانے کی جرات خود اپنے خون اور اپنی جان کے ساتھ بازی گری بن جاتی تھی۔

ایک طرف کلیسا کے ہاتھ اس طریقہ سے ملک کی سیاسی باگ آ گئی تھی اور دوسری طرف ''اعتراف جرم'' کے قصے کی بدولت ہر پادری انفرادی شخصیتوں کی کمزوریوں' جرائم اور لغزشوں کا محرم اسرار بنا ہوتا' کلیسا کے خلاف کچھ بولنے کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ اپنے پوشیدہ جرائم کا راز

فاش ہو جائے۔ افراد واشخاص کی گرفت کا یہ ایک ایسا جال تھا جس میں لوگ اپنے آپ کو جکڑا ہوا پاتے تھے۔

پھر رسم ورواج وعادات اس قسم کے عام قوانین کا اقتضا یہ بھی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دو' عمومیت میں اسی نوعیت کے اثرات بتدریج پیدا ہو جاتے ہیں' یونہی کلیسا کو اپنی من مانی کارروائیوں کے جاری رکھنے کا موقع قرنہا قرن تک ملتا رہا۔

لیکن آخر ہر چیز کی ایک حد بلکہ یوں سمجھئے کہ عمر ہوتی ہے' قدرت جو تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے نشیب وفراز سے گزارتے ہوئے نسل انسانی کو آگے کی طرف بڑھاتی چلی آ رہی ہے' وہی قدرت ہر عمل کے اور ردعمل کے اسباب ووجوہ کو پیدا کرتی رہتی ہے۔

کلیسا کے بڑھتے ہوئے مذکورہ بالا غیر معمولی اقتدار کے مقابلہ میں ردعمل کا اسباب وعلل کے کن کن قالبوں میں قدرت کی طرف سے نشوونما ہونے لگا' اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے تاہم اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ مظالم اور چیرہ دستیوں کا جو سلسلہ ڈاکوؤں اور چوروں' رہزنوں اور غارت گروں کی طرف سے نہیں بلکہ دین اور مذہب کے مدعیوں کی طرف سے شروع ہوا تھا' خود اس کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی۔ آدمی چوروں اور ڈاکوؤں سے بھی نفرت کرتا ہے اور ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے لیکن شیطان شیطان کے لباس میں نہیں بلکہ فرشتوں کے جبوں میں جب سامنے آئے اور معلوم ہو جائے کہ ان ملکوتی جبوں کے نیچے ابلیسی روحیں پوشیدہ ہیں' تو یہ واقعہ ہے کہ جرم وطغیان کے خلاف انسانی فطرت کی برہمی کا پارہ غیر معمولی طور پر زیادہ بہت زیادہ چڑھ جاتا ہے۔ جیسے جیسے کلیسا کے بھیس میں شیطان اپنے پروگرام کو آگے بڑھا رہا تھا' اندر ہی اندر عمومیت کی فطرت میں آتشیں لاوے تیار ہوتے چلے جاتے تھے مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا اندر میں تیار ہونے والے ان لاووں کو باہر نکلنے کے لئے کوئی دہانہ نہیں ملتا تھا' سوارخ پیدا ہوتے تھے لیکن ان کو فوراً جبر واستبداد کی قوتوں سے بند کر دیا جاتا تھا۔

اسی عرصہ میں ''کروسیڈ وار'' یعنی مولد مسیح علیہ السلام کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھڑانے کے لئے صلیبی لڑائیوں کا جو سلسلہ کلیسا کی طرف سے چھیڑا گیا' اور اس راہ میں کامیابیوں سے زیادہ ناکامیوں ہی سے پرستاران صلیب کو عموماً دوچار ہونا پڑا اور کلیسا کے نمائندوں کی طرف سے بعض

ایسی مذبوحی حرکتیں بھی سرزد ہوئیں جن سے عوام کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ❶ کہتے ہیں کہ ان ہی صلیبی لڑائیوں میں ایک نئے دین اسلام کے نظام کا تجربہ کرنے کا بلاواسطہ موقع یورپ کے کلیسائی باشندوں کو ملا۔ اسی کے ساتھ یورپ کے بعض قوی پنجہ' قوی العزم والا رادہ سلاطین سے کلیسا اور یورپ میں مزاحمت بھی شروع ہوئی اور یہ مزاحمت آگے بڑھتے ہوئے اپنی آخری شکل تک پہنچ گئی جس نے کلیسائی کے استحکام کو ایک گونہ متاثر کیا۔ ❷

الغرض یہ اور اسی قسم کے گوناگوں پیچیدہ اسباب پے در پے یکے بعد دیگرے مسلسل پیدا ہوتے چلے گئے کہ اندر اندر کلیسا کے خلاف جو آگ عوام کے سینوں میں سلگ رہی تھی اور جو آتشیں لاوے پیدا ہو رہے تھے ان کو منہ بنانے کا موقع مل گیا۔

پروٹسٹ یعنی احتجاج کی طرف منسوب کر کے صلیبی دین کی تاریخ میں پروٹسٹنٹ فرقہ کا جو ذکر آتا ہے دراصل یہی اندرونی آگ اور لاوے کے ان دہانوں کی تعبیر ہے' جن کی راہ سے کلیسا

---

❶ مطلب یہ ہے کہ گو پوپ اور اس کے جانشین مسیح کے نام پر یوں تو ورغلا ورغلا کر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں عیسائیوں کو کٹوا ہی رہے تھے' اس سلسلہ میں اسٹیفن نامی گڈریے کے ایک لڑکے نے بعض پادریوں کے مخفی اشاروں سے دعویٰ کیا کہ خدا کا دیدار اس کو نصیب ہوا اور روٹی ملی اور حکم دیا گیا کہ کمسن لڑکوں کی فوج تیار کر کے مولد مسیح کی تطہیر کی کوشش کرے یہ ۱۲۱۲ء کا واقعہ ہے بیان کیا جاتا ہے کہ یورپ کے علاقے کے خاندانوں سے لڑکے اور لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی چنی گئیں جن کو مردانہ لباس پہنایا گیا اور جہاد کا اعلان کر کے لڑکیوں کی یہ فوج یورپ سے روانہ ہوئی۔ باور کرایا گیا تھا کہ راستہ میں جو سمندر بھی ملے گا خود بخود خشک ہو جائے گا۔ بہر حال مارسیلز میں عیسائی سوداگروں نے لڑکوں کی اس فوج کو جہازوں پر لاد دیا اور بے ضمیر تاجروں نے ان غریب بچوں کو مصر میں لے جا کر بیچ دیا۔ دو جہاز نذر طوفان ہوئے۔ لکھا ہے کہ لڑکوں کے ماں باپ روتے تھے مگر ان کی کوئی کچھ نہیں سنتا تھا۔ لڑکوں کی یہ فوج ایک سے زیادہ مرتبہ تیار کی گئی جو راستہ ہی میں تباہ ہوتی رہی۔

❷ مثلاً جرمنی کے شاہنشاہ فریڈرک یا انگلستان کے بادشاہ ہنری چہارم اور اسی قسم کے مختلف سلاطین وملوک کے جن واقعات کا ذکر تاریخوں میں کیا گیا ہے ہنری چہارم کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ جب ہلڈی برانڈ نامی پوپ نے ہنری کو ملعون ٹھہرا کر کلیسا بدر ہونے کا حکم دیا تو ہنری نے بھی پوپ صاحب کو لکھا کہ تو بظاہر پوپ ہے لیکن درحقیقت ایک بدکردار راہب الخ (دیکھو گرانٹ کی تاریخ پوپ ص: ۲۷)

اسی طرح فرانس کے بادشاہ فلپ خوب رونے یا نیفسن ہشتم نامی پوپ کے اس فرمان کو جلا ڈالا کہ ''پوپ جسے چاہے اکھاڑے اور جس بادشاہ کو چاہے باقی رہنے دے'' (ارتقائے نظم حکومت پوپ ص ۳۱۲۱)

کی مخالفانہ آگ باہر نکلنے لگی۔

ایک ہی ملک میں نہیں بلکہ یورپ کے مختلف علاقوں میں آگے پیچھے مختلف شخصیتیں جرات سے کام لیکر کلیسا اور پوپ کے خلاف علانیہ اٹھ کھڑی ہوئیں جن میں جرمنی کے ''مارٹن لوتھر'' سوئٹزرلینڈ کے ''زونگ لی'' فرانس کے ''کالون نامی'' وغیرہ افراد نے غیر معمولی شہرت حاصل کی' جن کے تفصیلی حالات کا مطالعہ یورپ اور کلیسا کی تاریخوں میں کرنا چاہئے۔

حاصل ہر ایک کے احتجاج اور پروٹسٹ کا یہی تھا کہ صلیبی دین کی ٹھیکہ داری یا بائبل (تورات وانجیل وغیرہ) کی تشریح کا استحقاق کلیسا نے اپنے ساتھ جو مختص کر رکھا ہے' صحیح نہیں ہے اور نہ نجات کے لئے کلیسائے روم اس کے پوپ' پوپ کے نمائندوں کو واسطہ بنانے کی ضرورت ہے' یہ ہزار ہا ہزار صفحات کا خلاصہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ابتداً احتجاج اور پروٹسٹ کے اس قصے کا تعلق صرف کلیسا' پوپ' پوپ کے نمائندوں اور ان لوگوں کی پیش کردہ صلیبی دین کی شکل سے تھا۔ شروع میں یہی غنیمت تھا' مگر کلیسا کے لئے یہ مغتنم احتجاج بھی ظاہر ہے کہ کسی حیثیت سے بھی قابل برداشت کیسے ہوسکتا تھا۔ چاہا گیا کہ ''گربہ'' کے ساتھ کشتی کے فعل کو پہلے ہی شروع کر دیا جائے ورنہ ''فیل'' (ہاتھی) سے بھی اس سیلاب کا روکنا ممکن نہ ہوگا' جس کی روانی ابھی صرف میل یعنی سلائی سے روکی جاسکتی ہے۔

کلیسا اور عوام میں کشمکش کی ابتدا ہوگئی' پوپ کی تاریخوں میں عدالت ہائے تحقیق' مذہبی (INQUISTITION) اور ''لاشاروزنت'' یا ''ایوان آتشیں'' وغیرہ کی اصطلاحیں جو ملتی ہیں درحقیقت ان ہی الفاظ میں اس منحوس کشمکش کی خونیں اور آتشیں داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔

کلیسا کے خلاف صراحتاً ہی نہیں بلکہ اشارۃً وکنایۃً تحریراً وتقریراً کسی قسم کا کوئی لفظ زبان سے نکالنا جرم ٹھہرایا گیا۔ کلیسا نے فتویٰ صادر کیا اور سارے سلاطین وامراء جن کی سلطنت وامارات کی بنیاد صرف کلیسا کے رحم وکرم پر منحصر تھی' انہوں نے اس فتویٰ کی تعمیل کے لئے نیاموں سے تلواریں باہر نکال لیں' ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مجرموں کو زندہ درآتش کرنے کے لئے مقدس الاؤ جوڑ دیئے گئے۔

پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ سال دو سال کا قصہ ہو تو بیان کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ کشمکش کی یہ

کیفیت رومن کیتھولک یعنی حامیان کلیسا اور پروٹسٹنٹ' مخالفان کلیسا ان دونوں فرقوں کے درمیان پانچ چھ صدیوں تک انتہائی قساوت قلبی' سنگدلی کے ساتھ جاری رہی۔ قدرتاً پروٹسٹنٹ خیال کے حامیوں کی تعداد شروع میں کم تھی ہر علاقہ اور خطہ میں کیتھولک اکثریت غریب پروٹسٹنٹوں کی اقلیت کے ساتھ جو جی میں آیا کرتی رہی۔ عدالت ہائے مذہبی یا مجلسی تحقیقات ارتداد میں مقدمہ پیش ہوتا ہلکی سی رسمی کارروائی کے بعد قتل یا زندہ جلا دینے کا فیصلہ صادر کر دیا جاتا اور کیتھولک فرقہ کے عیسائی بڑی دلچسپیوں کے ساتھ خون اور آگ کی ان ہولیوں کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔

لکھا ہے کہ الحاد یا ارتداد کے فتویٰ کے بعد دیکھا جاتا تھا کہ مجرم کو پلنگ کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے' غریب چت لٹا دیا جاتا' چھت میں باڑھ ہتھیار لٹکا دیا جاتا جو آہستہ آہستہ کئی دن میں لیٹے ہوئے مجرم کے سینے پر ضرب لگاتا اور یوں اس غریب کی جان نکال لی جاتی یا گھٹ گھٹ کر نکل جاتی۔

اس سلسلے میں کن کن شہروں میں قتل عام کے واقعات کتنی دفعہ پیش آئے اور قتل عام کے ان واقعات میں کتنی جانیں کام آئیں ان کی فہرست یورپ کی تفصیلی تاریخوں میں مل سکتی ہے۔

فرانس کا مشہور ہنگامہ ''بارتھیلی'' کے ہنگامے کے نام سے جو مشہور ہے' کہتے ہیں کہ ۹ دن تک پروٹسٹنٹ فرقہ کے مردوں اور عورتوں کے قتل عام کا حکم نافذ رہا' لکھا ہے کہ حاملہ عورتوں کے پیٹوں کو چاک کر کے کلیسا کی کیتھولک بھیڑیں زندہ بچوں کو نکالتیں اور کتوں کے آگے ڈال کر پھاڑے اور کھائے جانے کا تماشا دیکھتیں۔ پیرس کے دریائے سین کا پانی مقتولوں کے خون سے سرخ ہو گیا تھا۔ [1]

خلاصہ یہ ہے کہ کشمکش کے اس سلسلہ میں تخمینہ کیا گیا ہے کہ جو مارے گئے' زندہ جلا دیئے گئے یا دوسرے طریقوں سے ان کو قتل یا ذبح کیا گیا' تخمیناً دس لاکھ افراد تک ان کی تعداد پہنچتی ہے۔

[1] انگریزی زبان جو نہیں جانتے وہ علامہ فریدی وجدی کی عربی کتاب ''کنز العلوم واللغۃ'' میں ان واقعات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔۱۲

اور یہ سب کس لئے ہوا؟ صرف اس لئے کہ خدا کے بیٹے مسیح اور ان کے حواری پطرس' پطرس کے جانشین پوپ کے ہاتھ میں ان ہی مذہبی ناموں کے وسیلہ سے سیاسی باگ جو آ گئی تھی یہ باگ ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔

پروٹسٹنٹ خیال کے حامیوں کی طرف سے جب پوپ اور پوپ کے نمائندوں پر اعتراض کیا جاتا تو کہنے والے پطرس کا نام لیتے کہ تم حواری مسیح کے جانشین پر زبان کھولتے ہو' تو جواب میں کہنے والے پطرس ہی پر اعتراض کرتے' بالآخر اسی اعتراض نے تحقیق کی وہ شکل اختیار کی جس کا پہلے ذکر آ چکا ہے یعنی ثابت کیا گیا کہ پطرس حواری کی قبر یا لاش رومہ میں ہے سرے سے یہ دعویٰ ہی غلط اور بے بنیاد جعلی ہے۔

بہر حال پطرس کے تقدس میں زور پہنچانے والے جب مسیح اور خدا کے بیٹے کے نام سے زور پہنچاتے تو جو ذرا زیادہ آزاد مزاج تھے۔ انہوں نے خود مسیح کی عظمت و جلالت میں اشتباہ ڈالنا شروع کیا' نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسیح کے وجود تک کو فرضی ثابت کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ مسیح کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے ''خدا'' کا نام لیا جاتا۔ لیکن جس پوپ' جس پطرس اور جس مسیح کے نام لینے والوں کے خونیں کارناموں سے یورپ کا چپہ چپہ رنگین ہو رہا تھا' اسی مسیح کے خدا پر بھی زبانیں اگر کھلنے لگی ہوں تو اس پر تعجب کیوں کیا جائے اور یہی مطلب ہے سجوک کے اس فقرے کا کہ:

''جس وقت نشاۃ جدیدہ کا (یورپ) میں زور و شور تھا' جس نے ان مذہبی عقائد ہی کو کمزور کر دیا تھا جن کے اوپر پاپائیت کا انحصار تھا''۔ (ارتقائے نظم حکومت پوپ ص ۲۲۶)

اب سوال یہی ہے کہ ''مذہبی عقائد کی اس کمزوری'' کی بنیاد کیا تھی؟

افسوس ہے کہ یورپ کی تاریخ لکھنے والوں نے نہ اس سوال ہی کو زیادہ اہمیت دی اور نہ سوال کے جواب ہی میں وہ صاف بیانی سے کام لیتے ہیں وہ کچھ ملی جلی باتیں کرتے ہیں جن میں کچھ تو وقت' وقت کے سیاسی حکمرانوں کے کارناموں اور حکومت کے متعلق دستوری خیالات کے پیش کرنے والے مصنفین کے نظریات و افکار کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی کچھ سائنس' کچھ فلسفہ اور ان فنون کی ترقیوں کا اظہار ایسے پیرایہ بیان میں کیا جاتا ہے کہ ''مذہبی عقائد کی کمزوری''

کے صحیح اسباب سامنے آنے نہیں پاتے اور ان کتابوں کے سطحی مطالعہ کرنے والے اس خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ شاید فلسفہ اور سائنس کے چرچوں نے مذہب کی بنیادوں کو یورپ میں سست کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ اپنی انہی تاریخوں میں وہ کلیسا اور پوپ کے طرز عمل اور اس طرز عمل سے عوام کی ذہنیت بہ تدریج جو متاثر ہوتی چلی جاتی تھی بیچ بیچ میں اس کے ذکر سے بھی کلی گریز کی راہ تو اختیار نہیں کرتے اور ایسا وہ کر بھی نہیں سکتے تھے' ورنہ ماضی و حال کے تعلقات کے زنجیر کی کڑیاں پڑھنے والوں کے سامنے سے اچانک غائب ہو جائیں۔

لیکن ''تاریخ نویسی'' میں جس صفائی اور بے لاگ بیان کی ضرورت ہے' اس سے ان کی کتابیں خالی ہیں۔ عموماً وہ باتیں بناتے ہیں۔ جس مذہب کی طرف ان کا ملک یا ان کی قوم منسوب ہے' چاہتے ہیں کہ کھلے بندوں اس کے پیدا کئے ہوئے نتائج لوگوں کے سامنے نہ آئیں۔

شاید اسی لئے ممکن ہے کہ جس نظریہ کو اس وقت میں پیش کر رہا ہوں' ان لوگوں کو بھی کچھ اجنبی معلوم ہو جنہوں نے یورپ کی تاریخ کا کافی اور گہرا مطالعہ کیا ہے کیونکہ عموماً اس راہ میں وہ ان ہی راہوں پر پڑ گئے ہیں جن پر یورپ کے شاطر مورخین ان کو چلانا چاہتے ہیں' تاہم شکر ہے کہ سلسلہ وار نہ سہی پراگندہ منتشر حالات میں یہ سارے معلومات یورپ ہی کی عام تاریخوں میں پائے جاتے ہیں' جن میں تسلسل پیدا کرنے کی کوشش قرآنی لفظ اثارھم کی تشریح و تفسیر میں کی گئی ہے۔

''عیسائیت'' کی ساری کمزوریاں نظریہ ''ولدیت'' کی پیداوار ہیں

واقعہ یہ ہے کہ مذہب اور مذہبی عقائد کی یہ ساری کمزوریاں جو یورپ میں پیدا ہوئیں' براہ راست نہ سائنس کے جدید انکشافات کی رہین منت ہیں اور نہ سیاسی و دستوری تبدیلیوں سے ان

کا براہ راست تعلق ہے، جن سے گزرتے ہوئے یورپ کی تاریخ موجودہ دور تک پہنچتی ہے۔

بلکہ مذہب کی ساری کمزوریاں خود اسی مذہب اور مذہب کی تاریخ سے پیدا ہوئی ہیں۔ جس کی طرف اپنے آپ کو اور اپنی دینی زندگی کو یورپ کے یہ باشندے منسوب کرتے رہے ہیں یا اس وقت تک کر رہے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ وہی عقیدہ ''ولدیت'' جس کی بدولت سمجھا جاتا تھا کہ مخلوق کے پیکر میں خالق ہمارے سامنے آ گیا۔ اسی کے ساتھ غیر معمولی شغف اور انہماک استغراق نے یورپ کو کلیسائے روم اور کلیسائے روم کے پاپاؤں کا غلام بنایا' پھر کلیسا اور کلیسا کے نمائندوں کی حد سے گزری ہوئی چیرہ دستیوں نے عوام کے قلب میں ردعمل کی کیفیت پیدا کی' جو ترقی کرتے ہوئے شروع شروع تو پروٹسٹنٹ فرقہ کے قالب میں نمایاں ہوئی اور جب ردعمل کی اس نہ رکنے والی تحریک کا مقابلہ آگ اور تلوار کی دھار سے کلیسا اور کلیسا کے رحم و کرم پر جینے والے حکمرانوں نے کرنا چاہا تو یہی پروٹسٹنٹی تحریک جس کے بانی لوتھر کی کرخت ترین تنقید یہ تھی جیسا کہ جانسن نے اس کے رسالہ ''اسیری بابل'' نامی کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

> ''اس نے (مارٹن لوتھر نے) نہ صرف پوپ کے اقتدار سے انکار کر دیا بلکہ مقدس ادارہ کہانت و سند روایات پر اور از منہ وسطیٰ کے اصول استحالہ ❶ و تبدیل لحم پر حملہ کرنے لگا''۔ (یورپ سولھویں صدی میں ص:۱۹۹)

لیکن جیسا کہ جانسن ہی نے لکھا ہے:

''اس نے (لوتھر نے) گو نہایت بے پروائی کے ساتھ کلیسا کی روایات کو ترک کر دیا''۔

مگر اسی کے ساتھ ''اس کو کامل اور پختہ یقین تھا کہ حصول نجات اور تنظیم کلیسا کے لئے جو کچھ درکار ہے وہ انجیل ہی میں مل سکتا ہے''۔ (یورپ سولھویں صدی میں: ۲۰۰)

بہرحال آخر وقت تک لوتھر خود بھی عیسائی رہا اور اس کے ماننے والے عیسائی انجیل ہی کو ذریعہ نجات یقین کرنے والے تھے۔

---

❶ یہ عشار ربانی کی تقریب کی ایک اصطلاح ہے' جو شراب اور گوشت اس تقریب میں عیسائی استعمال کرتے تھے اس کے متعلق یقین تھا کہ مسیح کا وہ خون اور گوشت ہے۔۱۲

لیکن ان پروٹسٹنٹ اور احتجاج کرنے والوں کا پیچھا کلیسا کے حامی عیسائیوں یعنی رومن کیتھولک فرقہ کی طرف سے حد سے گزرے ہوئے بہیمانہ تشدد کے ساتھ کیا گیا' جس کا ایک ہلکا سا نقشہ آپ کے سامنے گزر چکا' سوچئے کہ اس کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور بھی کچھ ہوسکتا جو ہوا۔

میں دوسروں کے متعلق کیا کہوں' خود اپنے متعلق سوچتا ہوں کہ مذہب کے نام سے میرے سامنے بھی وحشت و بربریت کے وہی مہیب و دردناک مناظر اگر پیش ہوتے جو کلیسا اور عیسائیت کے نام سے یورپ میں صدہا سال تک پیش آتے رہے' تو ایسے مذہب کے مقابلہ میں لامذہبیت اور دین کے مقابلہ میں لادینیت کے قبول کر لینے پر اپنے آپ کو مجبور اور شاید بے بس پاتا۔

پس سچی بات یہی ہے کہ یورپ کی موجودہ لامذہبیت یا بے دینی خود اسی مذہب اور دین کی پیداوار [1] ہے جسے یورپ نے قبول کیا تھا' اور یہ مذہب یا دین کیا تھا؟ وہی ''نظریہ'' ولدیت'' تھا جس کی تعبیر قرآن میں قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا (انہوں نے کہا کہ خدا نے (مسیح) کو بیٹا بنالیا) سے کی گئی ہے۔

اور اب آیئے قرآن میں ''اثارھم'' کا لفظ جو فرمایا گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ اس پر غور کیجئے جیسا کہ ظاہر ہے اثار' اثر کی جمع ہے۔ منتہی الارب میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' اس لفظ اثر کی تشریح فارسی کے ان لفظوں سے کی ہے:

''بقیہ چیزی ونشان قدم' ومنہ قطع اللہ اثرہ یعنی بہ بردخدائے نشان قدم اورا''

جس کا حاصل یہی ہوا کہ اپنے پیچھے کوئی چیز جن نشانیوں کو چھوڑ جائے ان ہی کو اس چیز کا اثر یا آثار عربی میں کہتے ہیں۔

---

[1] غریب سائنس یا سائنس کی راہ سے پیدا ہونے والے جدید انکشافات مثلاً طیارے' سیارے' فون' انجن یا سٹیم برق پٹرول وغیرہ کی قوتوں کو بدنام کرنا اور سمجھانا کہ ان جدید انکشافات نے مذہب کی بنیادوں کو کمزور کر دیا۔ اس قسم کا دعویٰ وہی کرسکتا ہے جو نہ مذہب کی اساسی بنیادوں سے صحیح واقفیت رکھتا ہے اور نہ یہ جانتا ہے کہ سائنس ہے کس علم کا نام اور اس کے مباحث کا تعلق کن امور سے ہے قطع نظر اس اصولی مسئلہ کے ایک عامی کو یوں بھی تو سوچنا چاہئے گراموفون جب بجنے لگا سکوت کا وجود ناممکن ہے۔

یہ تو ''آثار'' کے لفظ کی لغوی شرح ہوئی' آگے ھم کی ضمیر' سو ظاہر ہے کہ اس کا مرجع اور اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو ''عقیدہ ولدیت'' کے قائل تھے۔

اس کے بعد اب اجمالی تفصیلات کو اپنے سامنے لائیے جن سے گزرتے ہوئے ''عقیدہ ولدیت'' موجودہ دور تک پہنچا ہے۔

جن لوگوں نے شروع شروع میں خالق عالم کے متعلق ''ولدیت'' کے اس عقیدہ کو تراشا' دنیا سے وہ چلے گئے ان کے بعد کلیسا اور کلیسا سے پوپ کی ذریت پادری پیدا ہوئے۔ پھر اس نظام کے تحت جن ناگفتہ بہ حالات سے یورپ کے عوام کو گزرنا پڑا جس سے احتجاجی ذہنیت پیدا ہوئی اور وہی احتجاجیت آگے بڑھتے ہوئے یہی نہیں کہ صرف پوپ اور کلیسا کے اقتدار کی منکر ہوگئی بلکہ جوں جوں ایک فریق کا تشدد بڑھتا جاتا تھا فریق مقابل کی سختیاں اور منہ زوریاں بھی اسی نسبت سے ترقی پذیر ہوتی رہیں' تا ایں کہ مسیح کے حواری پطرس کے وجود کا بھی انکار کیا گیا۔ آخر میں مسیح کا وجود بھی مشکوک ٹھہرایا گیا اور بالآخر اس کی انتہاء العیاذ باللہ اس شک پر ہوئی جس کے بعد انسان کے لئے اپنی انسانیت کو باقی رکھنے کے لئے کوئی ٹیک ہی باقی نہیں رہتی یعنی خود مسیح کے باپ کا دوسرے لفظوں میں کہیئے کہ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود میں شک اندازیوں کی راہیں یورپ میں درست ہونے لگیں اور گو عمومیت کی زبان پر خدا بھی باقی رہا بلکہ خدا کا مسیح بھی' مسیح کی انجیل بھی لیکن اس طویل وعریض آبادی کے اکابر کے دل میں سچ پوچھیے تو کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

دل کی بات دل ہی تک محدود کب رہتی' آخر مشرقی یورپ میں شیوعی یا بالشویکی نظام نے سر اٹھایا' جس میں زبانوں سے بھی وہی کہلوایا جاتا ہے اور کہنے پر مجبور کیا جاتا ہے' جسے مغربی یورپ کے باشندے اب تک اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے' اور اس کے بعد قدرتاً انسانی نسلوں اور دوسرے حیوانی سلسلوں میں کسی فرق کا باقی رکھنا ناممکن ہوگیا۔ جیسے ایک مکھی پیدا ہوتی ہے' جان لے کر پیدا ہوتی ہے' احساس لے کر پیدا ہوتی ہے' اور اپنے جیسی ہی چند مکھیوں کو پیدا کر کے ناپید ہوجاتی ہے۔ آدمی کی قدر و قیمت کی کوئی وجہ باقی نہ رہی کہ اس سے زیادہ کسی امتیاز خاص کی مستحق قرار دی جائے۔

مکھیوں کی جتنی تعداد بھی مر جائے' مار ڈالی جائے جیسے یہ کوئی اہم واقعہ نہیں ہے' آج یہی تصور ان کے متعلق بھی دلوں میں جاگزیں ہو رہا ہے' جو آدمی بن کر دنیا میں پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن کا مسجود ملائکہ ''عقیدہ ولدیت'' کی چوٹ کھاتے ہوئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ذلت و خواری کے کتنے تاریک ومہیب خندق میں جا گرا۔

اور یہ ہے میرے نزدیک قرآنی لفظ اثـــارھـــم کا مطلب' جس کے لئے چاہئے تھا کہ کئی جلدیں لکھی جائیں' لیکن اس کام کو دوسروں کے لئے چھوڑ ❶ کر اپنے ٹوٹے پھوٹے پیش کردہ اشارات پر قناعت کرتے ہوئے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جس کی پیغمبرانہ بصیرت کے سامنے ''عقیدہ ولدیت'' کے ان جان گداز' روح فرسا آثار کا ہر پہلو نمایاں ہو' جس کا کچھ حصہ تو سامنے آچکا ہے' اور نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کیڑوں اور مکوڑوں' مکھیوں اور پتنگوں کی صفوں میں شریک ہونے والے اس انسان پر آئندہ ''ولدیت'' کا یہی عقیدہ اور کن آثار کو لانے والا ہے۔

الغرض جو کچھ گزر چکا یا گزر رہا ہے اور آئندہ گزرنے والا ہے ان سے آگاہی کے بعد اگر ''انسانیت'' کے سب سے بڑے غمخوار و بہی خواہ (ﷺ) پر یہ حال طاری ہو جائے کہ ان ''اثار'' سے بچانے کے لئے وہ اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی جان تک کی بازی لگانے کے لئے تیار تھے تو کس حیثیت سے یہ بات محل تعجب ہو سکتی ہے؟

''مِنْ لَّدُنِّيْ بَأْسٌ شَدِيْدٌ''

کی دھمکی جن لوگوں کو دی گئی' ان کا قصہ تو ختم ہوا' اب آگے کی آیتوں پر غور کیجئے۔

تخلیق کائنات کی قرآنی توجیہ:

۱۔ ہم نے بنایا (ان ساری چیزوں کو) جو زمین پر ہیں' زمین کے لئے زیب و زینت تا کہ ہم جانچیں کہ ان میں (یعنی انسانوں میں) عملاً سب سے اچھا کون ہے۔

۲۔ اور ہم بنا دینے والے ہیں (ان ساری چیزوں کو) جو زمین پر ہیں' میدان اجاڑ۔

❶ خاکسار کی تعلیم جیسا کہ معلوم ہے قدیم طرز کے مدارس میں ہوئی' نیز تاریخ میرا خاص مضمون مطالعہ بھی نہیں رہا اسی لئے چاہتا ہوں کہ یورپ کی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے کاش! میرے اجمالی اشاروں کو تفصیل کا قالب عطا کرتے۔ وعلی اللہ اجرہ۔

الحمدللہ کہ سورۂ کہف کا پہلا عشرہ کہیے یا رکوع کی آخری دو آیتوں پر ہم پہنچ گئے ہیں' ان ہی دو آیتوں کا حاصل اور ترجمہ آپ کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے اصل الفاظ قرآن مجید کے یہ ہیں:

(۱) اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا.
(الکہف: ۷)

(۲) وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا۔

ان میں پہلی آیت میں اگر چہ بظاہر تخلیق کائنات کی اسی عام توجیہ کا ذکر ہے جس کا قرآن میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مختلف الفاظ میں اعادہ کیا گیا ہے' اپنے الفاظ میں جس کا خلاصہ خاکسار نے یہ کر لیا ہے:

''یہاں جو کچھ ہے سب انسان کے لئے اور انسان اس کے لئے ہے جس کا سب کچھ ہے''

لیکن تخلیق کائنات کی اس عام توجیہ کی تعبیر جن خاص الفاظ میں یہاں کی گئی ہے اور جس موقع ومحل پر ہم اس کو پاتے ہیں ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچئے۔ ظاہر ہے کہ ماعلی الارض یعنی وہ ساری چیزیں جو زمین پر پائی جاتی ہیں' جن سے مٹی اور کیچڑ کے اس ڈھیر کو جس کا نام زمین ہے' زینت بخشی گئی ہے۔ ان میں جہاں اونچے اونچے پہاڑ' سرسبز وادیوں کے آغوش میں بہتی ندیاں' غاٹے بھرنے والے سمندر' لہلہاتے ہوئے پھول' پھلوں سے لدے ہوئے درخت' ہرے بھرے باغ' جنگل' کھلے پرفضا میدان' یہ اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں' ان ہی میں یقیناً گرد و غبار کے اس تودہ کی آرائش کی ضمانت خود انسانی وجود میں بھی مستور ہے۔ وہ خود بھی زمین کی زینت ہے' اور اس کے اندر قدرتی سلیقہ اس بات کا جو رکھا گیا ہے کہ معمولی معمولی چیزوں کو اپنی ذہانت اور صنعتی چابک دستیوں کی مدد سے حسن و جمال کے بہترین دل آویز سانچوں میں ڈھال کر رکھ دیتا ہے' بلاشبہ زمین کی سجاوٹ و بناوٹ و حسن و رعنائی کو انسان کے اس فطری سلیقہ سے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہمیں یہ ماننا چاہیے کہ ''ماعلی الارض'' یا پشت زمین کی دوسری چیزوں کے ساتھ خود انسانی وجود کے پہلو نے بھی جنت سے نکالے ہوئے یا جنت کے وارث انسان کے رہنے بسنے کے قابل زمین کے اس خاکی کُرے کو بنا دیا' گویا یوں سمجھئے کہ ایک گونہ اشک شوئی کی ایک صورت عارضی مستقر کی اس شکل

میں اس آدمی کے لئے نکل آئی جو بہشت بریں کا باشندہ و متوطن تھا۔

کچھ بھی ہو "ما علی الارض" یعنی زمین پر جو کچھ ہے اس کے جھمیلے میں شریک ہو کر آدمی کا وجود بھی زمین کی حسن افزائیوں اور جمال آرائیوں میں کافی حصہ لے رہا ہے مگر اپنے اس سلیقہ سے جیسا کہ قرآن توجہ دلا رہا ہے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کس چیز کے حسن و جمال میں وہ اضافہ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خود انسان نہیں بلکہ خاک اور دھول کا یہی مجموعہ زمین ہے یہی حاصل ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا کے الفاظ کا۔

اسی لئے آگے فرمایا گیا ہے کہ محاسن و کمالات کے جو لامحدود ذخیرے زمین میں نہیں بلکہ خود انسانی فطرت کے اندر دبے ہوئے ہیں۔ ان کو بروئے کار لانے کی تدبیر ہے کہ الانسان لامحدود کمالات والے خالق کائنات سے ربط پیدا کرے اور اعمال کے حسن و قبح ' بھلائی ' برائی کا واحد معیار اسی کی مرضی مبارک کو ٹھہرا لے اور یہی مطلب ہے۔

"لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا"

کا' یعنی'' تا کہ جانچیں (یا آزمائش کریں) ہم اس بات کو کہ ان میں (انسانوں میں) عملاً سب سے اچھا کون ہے''۔

بلکہ یوں تو مجموعی طور پر آیت کے ان دو ٹکڑوں سے ادھر بھی گویا اشارہ مل سکتا ہے کہ الانسان کی طرف منسوب ہو کر اور اس کے لئے وقتی مستقر یا قیام گاہ بننے کی نسبت نے جب زمین کو حسن و جمال سے مالا مال کر دیا اور اس کی بہت سی پوشیدہ صلاحیتیں انسانی وجود کے ساتھ مربوط ہو کر منصۂ شہود و ظہور پر جلوہ گر ہو رہی ہیں تو اسی سے اندازہ کرنا چاہیے کہ خالق کائنات کے ساتھ وابستگی اور ربط انسانی وجود کے کن مخفی ذخیروں کو باہر لا سکتا ہے' اسی سورۃ کے آخری عشرہ کے خاتمہ میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ بہشتی زندگی سے بازگشت کی خواہش دلوں میں پیدا نہ ہو گی چوں کہ ایک ہی قسم کی زندگی کے تسلسل سے انسانی فطرت کا قاعدہ ہے کہ اکتا جاتی ہے' بورڈنگ کے کھانے کی بدنامی کا راز اس کی ایک رنگی اور تسلسل ہی میں پوشیدہ ہے' اسی سوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے آگے حق تعالیٰ کے کلمات کی لامحدودیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں اشارہ اسی بات کا

ہے کہ انسان کی لامحدود طلب اور کسی نقطہ پر نہ ٹھہرنے والی پیاس کی تشفی و سیرابی کی صورت ہی اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے کہ کسی غیر محدود کو اپنی طلب و جستجو کا نشانہ بنالے۔

بقول ڈاکٹر اقبال مرحوم:

تپش است زندگانی' تپش است جاودانی   دل ماسافرما کہ خداش یار بادا

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے لکھا ہے کہ دنیا کے نت نئے حوادث وواقعات سے عوام گھبرا اٹھتے ہیں' حالانکہ اگر حوادث کی تجدید اس عالم میں نہ ہوتی رہے تو انسان کی جدت پسند فطرت کے لئے زندگی بدمزہ ہو کر رہ جائے' خیر اس کا تفصیلی تذکرہ تو ان شاء اللہ سورۂ کہف کے خاتمہ کی تفسیر میں کیا جائے گا' یہاں صرف اشارہ کر دیا گیا۔ اس وقت تو اس سورہ کے پہلے عشرہ کی دو آیتوں میں سے ایک آیت کے مفہوم کو واضح کرنا چاہتا تھا میں خیال کرتا ہوں کہ پڑھنے والوں کے ذہن میں اصل آیت کا مطلب انشاءاللہ جم چکا ہوگا۔

اب آیئے اور اس پر غور کیجئے کہ انسانی وجود کے ان دو پہلوؤں یعنی ایک پہلو تو وہ ہے جس سے زمین کے حسن و جمال کے اضافہ اور فروغ میں مدد مل رہی ہے' اور دوسرا پہلو وہ ہے جس کے ساتھ خود انسانی وجود کے باطنی محاسن اور معنوی کمالات کے ظہور و بروز کا مسئلہ وابستہ ہے' ان دونوں پہلوؤں کا تذکرہ عقیدہ ولدیت کے چھوڑے ہوئے آثار کے بعد کیوں کیا گیا ہے۔؟

عرض کر چکا ہوں کہ دین سے بے دینی کی پیدائش کا جو حادثہ عیسائی ممالک اور کلیسائی علاقوں میں پیش آیا کش مکش اور تصادم کے اس قصے میں بڑھتے ہوئے لوگوں کا جذبہ ضد و عداوت' بغض و نفرت صرف خدا انکار ذہنیت ہی تک پہنچ کر نہیں ٹھہرا' بلکہ مذہب اور دین کے نام سے لامذہبیت اور بے دینی کی فرعونی حرکتوں اور طاغوتی شرارتوں کی جو جہنم عوام پر بھڑکائی گئی اس نے لوگوں کو (یہ واقعہ ہے کہ) بالآخر ''خدا بےزاری'' کے حدود تک دھکیل کر پہنچا دیا۔ آج یورپ وامریکہ والے اپنے ''خدا بےزار تمدن'' کی توجیہ میں جو باتیں بھی بنائیں' فلسفہ کی پشت پناہی حاصل کریں غریب سائنس کے سر اس کا الزام تھوپیں یا تھپوائیں لیکن بصیرت کی آنکھوں سے جنہوں نے ان ممالک کے باشندوں کی دینی تاریخ اور مذہبی قلابازیوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ درحقیقت خود اس مذہب اور مذہبیت کے نمائندوں کے طرز عمل نے اس نتیجہ تک ان کو پہنچا

دیا جہاں یہ غریب آج کھڑے ہوئے ہیں' یہ صحیح ہے کہ پہنچ جانے کے بعد فلسفیانہ چرب زبانیوں اور مسائل سائنس کے غلط استعمال سے بھی بعد کو مدد حاصل کی گئی' مگر حقیقی اسباب بے دینی کی اس زندگی کے وہی ہیں جن کی طرف قرآن نے اثارھم کے دولفظوں سے اشارہ کیا ہے۔

بہرحال واقعہ ہو چکا ہے اور سب کے سامنے ہے اپنی اس ''خدا بے زاری'' کی خصوصیت کو عموماً اب وہ چھپاتے بھی نہیں' بلکہ اس تاریخی قلا بازی کی آخری شکل جس کا نام اشتراکیت یا بولشوازم وغیرہ ہے جیسا کہ کہنے والے کہتے ہیں' ان کے پرچم کا سب سے نمایاں امتیازی طغراہی یہ ہے کہ ''ہم خدا سے بے زار ہیں''

انصاف کی سچی بات یہی ہے کہ آج اشتراکیوں کی طرف خدا بے زاری کے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی منسوب کیا جارہا ہے اور بظاہر اسے نئی بات ٹھہرانے کی جتنی کوششیں بھی ہورہی ہوں لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ان کا قصور اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ان کے بدنام کرنے والوں کے دلوں میں جو کچھ تھا' جرات سے کام لے کر اسی کو بدنام کئے جانے والے اپنی زبانوں پر بھی لے آئے ہیں' گویا جو ''اندر'' تھا وہی ''باہر'' نکل آیا ہے۔

پس دل والے ہوں یا زبان والے' اندر والے ہوں یا باہر والے' یقیناً ان دونوں میں سے کسی کی سوسائٹی میں اس کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ انسانی وجود کے اس پہلو کو سوچیں بھی جس میں زمین کے حسن و جمال کے فروغ واضافہ کا نہیں بلکہ براہ راست خود اسی انسانی وجود کے معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے ظہور کا راز پوشیدہ ہے۔ آخر خدا بیزار ذہنیت میں خدا طلبی اور خدا کا خیال خود ہی بتایئے کہ کس راہ سے آئے۔ خدا کی مرضی کو انسانی اعمال وافعال کے حسن وقبح کا معیار بنانے کی صورت ہی کیا باقی رہی ہے جب سے خدا ہی کا وزن دلوں سے نکل چکا ہے تو خدا کی مرضی کی تلاش کا جذبہ آخر کس راہ سے ابھرے یا ابھارا جائے۔

سچ تو یہ ہے کہ تھانے میں رپٹ لکھوانے کا لطیفہ لطیفہ ہی ہو مگر خدا کا نام لینے والے مہذب و شائستہ مجالس کی شرکت کے استحقاق سے آج محروم ہو جاتا ہے کیا اس کی واقعیت کا بھی کوئی انکار کرسکتا ہے؟ پھر نتیجہ کیا ہوا؟ وہ آپ کے اور ہمارے سامنے ہے۔ انسانی وجود کا خدائی پہلو مفلوج ومردہ ہو کر رہ گیا۔ لے دے کر جو چیز باقی رہ گئی وہ اب صرف یہی ہے کہ اسی مٹی اور کیچڑ کے

تودے کے ساتھ انسانیت لپٹ پڑی ہے اس کے سوا اور کوئی دوسرا کام آدمی کے لئے نہیں رہ گیا ہے کہ زمین کی گری پڑی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر ان کے حسن میں حسن کا' قیمت میں قیمت کا اضافہ کرتا چلا جائے۔ لامحدود توانائیوں کا جو گراں قدر بیش قیمت ذخیرہ اس کے استعمال کا اول بھی یہی ہے اور آخر بھی یہی ہے' انجام یہ ہے کہ زمینی رعنائیوں کے بڑھانے میں خواہ اڈیسن ہی بن کر کوئی کیوں نہ مرتا ہو لیکن انسانی محاسن و کمال کے لحاظ سے ایک نومولود بچہ کی جو حالت ہوتی ہے وہی حال اس بڈھے کا اس وقت بھی ہوتا ہے جب زندگی کے تمام مرحلوں کو طے کر کے زمین سے وہ رخصت ہوتا ہے گویا اس لحاظ سے اسی حال میں وہ مرتا ہے جس حال میں پیدا ہوا تھا۔ خواہ زمینی حسن زیبائش اور سج دھج کے اضافہ میں کسی قسم کے غیر معمولی کارنامے اس سے کیوں نہ ظاہر ہوئے ہوں۔

عقیدہ ولدیت کے آثار نے دنیا میں جس حشر کو آج برپا کر رکھا ہے وہ یہی ہے۔ مٹی بڑھ رہی ہے' بڑھتی چلی جارہی ہے' چمک رہی ہے' چمکتی چلی جارہی ہے اس کے حسن و جمال پر اضافہ پر اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے مگر انسان گر رہا ہے گرتا چلا جاتا ہے' بجھ رہا ہے' بجھتا چلا جارہا ہے اور میں نے شاید غلط کہا کہ جس حال میں پیدا ہوا تھا اسی حال میں مرتا ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ پیدائش کے وقت کم از کم معصوم حیوان یا غیر مضر جانور تو وہ رہتا ہے لیکن اس ''خدا بے زار'' تمدن کے زیر اثر زندگی بسر کرنے والوں میں خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے مرنے والے مرنے کے وقت شیطان کی بھی ناک کاٹ کر مرتے ہیں' آج ان ہی شیطانی انسانوں نے اسی ''جنت نما'' زمین کو اذیت رسانی میں قریب قریب جہنم کے حدود تک پہنچا دیا ہے۔

لیکن یہ تو وہ ہے جو ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے' مگر آئندہ یہی صورت حال کس مہیب ڈراؤنے انجام کو آدمی کے سامنے لانے والی ہے جہاں تک میرا خیال ہے مذکورہ بالا دو آیتوں میں سے آخری آیت میں شاید اسی کا جواب تلاش کرنے والوں کو مل سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خالق کائنات سے قطعی بے تعلق و بے گانہ ہو کر اپنی خدا بے زار زندگی کے ساتھ جو راضی اور مطمئن ہو چکے ہیں۔ ان کے اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ توانائیوں کا وہ سارا سرمایہ' صلاحیتوں کا سارا ذخیرہ جو انسانی وجود میں بھرا گیا تھا خالق تعالیٰ سے ٹوٹ کر کلیتہً زمین

ہی کے بناؤ سنگار کی طرف اس کا رخ مڑ گیا۔ ایک طرف اس یکسوئی کے رخا پن کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ارضی بناؤ سنگار' آرائش وزیبائش کے نت نئے سامانوں سے دنیا جیسے اس عہد میں بھری اور بھرتی چلی جارہی ہے انسانیت کی تاریخ میں یا کم از کم تاریخ معلوم میں اس کی قطعاً کوئی نظیر نہیں ہے ہر نیا دن نئے انکشافات' جدید مصنوعات وایجادات کو اپنے جلو میں لا رہا ہے ابھی ایک تماشا ختم بھی نہیں ہو پاتا کہ دوسرا نظارہ دعوت نظر دینے لگتا ہے۔

اس سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہم بھی دیکھ رہے ہیں اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں' لیکن زمین کی زیب وزینت کے قصوں میں ڈوب کر خود اپنے اور اپنے محاسن و جمال کو فراموش قطعاً فراموش کر دینے والا انسان ایجادات و اختراعات کی ان راہوں سے زیب و زینت کے سازوسامان کے ساتھ ساتھ اسی زمین کی ویرانی و بربادی کے سامانوں کو بھی غیب سے گھسیٹ گھسیٹ کر دائرہ ظہور وجود میں جولا رہا ہے' دنیا کی آنکھوں سے کیا اوجھل ہیں؟ دیکھئے وہ ایٹم بم کے جہنمی ذرات ہیں اور یہ ہائیڈروجن کے ان دیکھے کرامات ہیں۔ یہ ان آتش بداماں ایجادات واختراعات کے سوا ہیں جن کی دنیا اب تک تجربہ کر چکی ہے' دیکھئے ان کو اور پڑھئے قرآن میں۔

وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا۔

''اور ہم بنا دینے والے ہیں (ان ساری چیزوں) کو جو زمین پر ہیں' میدان اجاڑ''

خود سمجھ میں آجائے گا کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ الانسان خالق سے ٹوٹ کر صرف زمین کے ساتھ لپٹ کر رہ گیا اور اپنا سب سے بڑا کمال یہی سمجھ بیٹھا کہ زمین کے زیوروں میں ایک زیور اور اس کے گلے کا ہار بن کر اسی کے سینے پر لوٹ پوٹ کر ختم ہو جائے' اپنے خیال میں ختم ہو جائے۔ جو خالق کے لئے تھا وہ ''گردن خر'' کا طوق بن کر بھی رہ جاتا تو کہا جا سکتا تھا کہ ایک زندہ جانور کی گردن کا تو ہار ہے مگر وہ تو اسی خیال سے مست ومسرور ہے کہ کیچڑ اور مٹی کے لئے زیور بن گیا ہوں۔ انفرادی ہستیوں کا حشر اسے نہیں چونکا سکا تھا کہ نسل کا تسلسل' تسلسل کا بھروسہ اس کے سینے کا مرہم' جھوٹا مرہم بنا ہوا تھا۔ لیکن ''ہم بنا دینے والے ہیں (ان سب چیزوں کو) جو زمین پر ہیں میدان اجاڑ'' یہ طفلی تسلی کے اس مرہم کو مجروح سینوں پر دیر تک باقی رہنے دیگا۔ پس

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

باب سوم

قصہ اصحاب کہف

جہاں تک میرا ناچیز خیال ہے ''اصحاب کہف'' کا قصہ اسی سوال کا جواب ہے جو پہلے رکوع کے ختم کرنے کے بعد دلوں میں پیدا ہوسکتا ہے لیکن اس پر بحث کرنے سے پہلے ایک بات سن لیجئے۔ اب تک جو کچھ آپ کے سامنے گزرا' یاد ہوگا اس میں ''من لدنی جنگ شدید'' کی دھمکی کے ساتھ ساتھ ایک بشارت بھی قرآن نے سنائی تھی' فرمایا گیا تھا:

وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًاo مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًاo (الکھف: ۲-۳)

''اور بشارت دیجئے ان ایمان لانے والوں کو جو اچھے کام کر رہے ہیں (اس بات کی) کہ ان کے لئے اچھا معاوضہ ہے' ٹھہرے رہیں گے اس میں ہمیشہ ہمیش۔''

جو ایمان اور عمل صالح کی زندگی گزار رہے ہیں اس آیت میں ان کی تسلی دے دی گئی ہے کہ ان کو ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ جیسے ولدیت کا عقیدہ اپنے آثار و نتائج کو پیدا کرتا چلا جائے گا تا ایں کہ ''صعید جرز'' (اجاڑ میدان) کے مہیب مستقبل کو زمین پر کھینچ کر وہ لے آئے' اسی طرح ایمان و عمل صالح کے نتائج ''اجر حسن'' اور اچھے اچھے معاوضہ کی صورت میں بھی مسلسل ان لوگوں کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے جنہوں نے عمل صالح پیدا کرنے والی ایمانی زندگی کے بسر کرنے کا قطعی فیصلہ کرلیا ہے ''ما کثین فیہ ابدا'' (یعنی ڈٹے رہیں گے اسی اجر حسن اور اچھے معاوضہ کا نشاط آفرینیوں اور نشاط انگیزیوں میں ہمیشہ ہمیش) اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مسرت و نشاط کی اس کیفیت میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوگا' خواہ ما علی الارض (زمین پر جو کچھ ہے) اس کے ساتھ جو صورت حال بھی پیش آجائے۔

مژدہ سنانے کو قرآن نے یہ مژدہ سنا تو دیا ہے اور ماحول کے حالات سے بے تعلق ہو کر پڑھنے والے جب خالص ایمانی احساسات کے تحت قرآن میں اس کو پڑھتے ہیں تو دل میں ایمان کی خنکی بھی پاتے ہیں اور جو مومن ہے چاہیے اس خنکی کو اپنے اندر پائے بلکہ قرآن کے

الفاظ چونکہ مطلق ہیں، یعنی اجر حسن کے ظہور کو موجودہ دنیاوی زندگی یا آخرت کی زندگی (جو دوبارہ بخشی جائے گی) کسی ایک کے ساتھ قرآن نے چونکہ اس اجر حسن کو محدود و مقید نہیں کیا ہے، اس نے بظاہر الاولیٰ والاخرۃ دونوں پر یہ قرآنی ضمانت اور بشارت چاہئے تو یہی کہ حاوی سمجھی جائے۔ واللہ اعلم بمرادہ۔

مگر ایمان کے ساتھ عقل ماحولی تقاضوں کے زیر اثر ہو کر جب سوچتی ہے تو اجر و معاوضہ تو بڑی بات ہے، خود ایمان ہی کے قیام و بقا کی طرف سے مایوسی کی کیفیت دلوں پر چھانے لگتی ہے۔ عقیدہ ولدیت کے آثار نے حالات ہی ایسے پیدا کر دیئے ہیں کہ ایمان کو دل میں دبائے رکھنا گویا انگاروں کو مٹھی میں بند کئے رہنا ہے۔

جہاں تک خاکسار کا ذاتی تاثر ہے اصحاب کہف کے قصے کی ابتدا کرتے ہوئے قرآن میں جو یہ سوالی فقرہ ہے:

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا۔

''کیا تم سوچتے ہو کہ اصحاب کہف اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں کوئی عجیب (نشانی) تھے۔''

اس میں مخاطب کو تعجب اور حیرانی کا شکار قرار دیتے ہوئے آگے قصے کو جو بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق کھلا ہوا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعجب کا اظہار کیا کس نے تھا؟ جو قرآن نے یہ پیرایہ بیان اختیار کیا ہے، کیا اس سوال کا جواب بیرونی روایات کی پشت پناہی کے بغیر ناممکن [1] ہے؟

[1] تفسیری روایات جو بقول امام احمد بن حنبل ''غیر معتبر کمزور روایتوں کا سب سے بڑا انبار ہے'' ان ہی میں آیا ہے کہ قریش نے مدینہ کے احبار یہود کے پاس نضر بن حارث کی سرکردگی میں ایک وفد بھیجا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی صداقت کی جانچ کے لئے کچھ باتیں بتائیں۔ کہتے ہیں کہ ان علمائے یہود نے منجملہ دوسرے سوالوں کے ایک سوال یہ بھی دیا تھا کہ کہف والوں کا قصہ محمد ﷺ سے پوچھنا! وفد نے واپس آ کر باتیں پوچھیں، جواب میں قرآن نازل ہوا۔ اسی لئے ابتداء جواب کی اس فقرہ سے کی گئی کہ ''کہف والوں کے قصے کو تم بہت عجیب بات سمجھتے ہو''۔ پھر قصہ بیان کر دیا گیا۔ میں کیا عرض کروں کہ ''عجبًا'' کے لفظ کے لئے یہ روایت کس حد تک مفید ہو سکتی ہے، جب دوسرے سوالوں کے جوابات جن کی یہی نوعیت تھی، ان میں تعجب کا ذکر نہیں کیا گیا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک عام مشہور قصے کو نبوت کے جانچنے کا معیار علماء یہود نے کس بنیاد پر ٹھہرایا تھا؟ اور فرض کیجئے کہ قصہ مشہور بھی نہ ہو پھر بھی کسی گزرے ہوئے تاریخی واقعہ کا علم نبوت کی دلیل کیسے بن سکتا ہے؟

میرا خیال تو یہی ہے کہ پہلے رکوع کی یہی تبشیری ضمانت آدمی کو حیرت اور تعجب میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ عقیدہ ولدیت کے آثار جن حالات کو دنیا میں کھینچ کر لانے والے تھے (جن میں ہم اس وقت مبتلا ہیں) بلاشبہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں آدمی اپنے ایمان کی اور ایمانی قوت سے عمل صالح کے حدود کی حفاظت میں کیا کامیاب ہوسکتا ہے؟ اسی سوال کے جواب میں قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم عقیدہ ولدیت کے آثار ہی کو دیکھ دیکھ کر خفقان میں مبتلا ہوئے چلے جارہے ہو، باہم ایک دوسرے سے گھبرا گھبرا کر پوچھتے ہو کہ متاع ایمانی کے بچا لینے کی کیا کوئی ممکن صورت رہ گئی ہے؟

عمل صالح کی زندگی گزارنے کی گنجائش کیا اس ماحول میں باقی رہی ہے، جسے بتدریج عقیدہ ولدیت کے آثار نے دنیا میں پیدا کر دیا ہے؟ جہاں تک میرا خیال ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک گزرے ہوئے واقعہ کو سنا کر قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ کتنی نازک ترین گھڑیوں میں بچانے والوں نے اپنے ایمان کو بھی بچا لیا تھا اور عمل صالح کی زندگی بھی ان کی بے داغ رہی اور اسی زندگی کے اجر حسن یا اچھے معاوضہ کو بھی مسلسل بغیر کسی انقطاع کے وہ اپنے سامنے پاتے رہے، گویا یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ جب سارا ماحول آدمی کا بے ایمانی اور بدعملی سے بھر جائے تو اس وقت بھی ایمان اور عمل صالح کی زندگی کے بچا لینے کا عملی طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟

یقیناً ''عقیدہ ولدیت'' کے آثار کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس اچھنبے کی سب سے بڑی بات اور تعجب کا سب سے بڑا اہم سوال یہی ہوسکتا تھا کہ اس زمانہ میں بھی کیا ایمان اور عمل صالح کو بچا لینے کا کوئی امکان باقی رہ گیا ہے؟ یہ ایک قدرتی سوال ہے جو دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور جواب بھی حیرت میں غوطہ دینے والے اسی سوال کا یہ دیا گیا ہے کہ ایمان اس قسم کی آزمائشوں سے گزرتا ہی رہا ہے۔ کہف والے بیچارے جن حالات سے دوچار ہوگئے تھے اور ان ہی حالات میں ایمان و عمل اور اس کے نتائج کے بچا لینے میں وہ کامیاب ہوئے۔ کیا تم اس کو کوئی ایسا عجیب وغریب اور شاذ و نادر واقعہ خیال کرتے ہو جو کسی اصول و قانون کے تحت نہیں بلکہ محض اتفاقاً پیش آ گیا تھا۔

اور یہ ہے میرے نزدیک اصحاب کہف کے قصہ کا اپنے ماقبل کے مضمون سے تعلق، اب اس

کے بعد میں اصحاب کہف کے قصہ اور جن الفاظ میں قرآن نے اس قصہ کو بیان کیا ہے نیز جو نتیجے ان الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں پھر یہ کہ ان نتیجوں سے اس تعجب کا ازالہ کیسے ہوتا ہے جس میں ہم اور آپ (جو ایسے ناسازگار ماحول میں ایمان و عمل صالح کی زندگی کے بچا لینے کو عجیب بات سمجھے ہوئے ہیں) مبتلا ہیں' بہرحال اب میں ان ہی باتوں کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ شارح الصدور سے دعا ہے کہ دلوں کو کھولے اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں دوسروں کی سمجھ میں بھی وہ آ جائے۔

وماتو فیقی الا باللہ ان ارید الاصلاح ما استطعت۔

قصہ کی تاریخی حیثیت:

الاِنْسَانُ حَرِیْصٌ عَلٰی مَا مُنِعَ مِنْہُ۔

''جس چیز سے آدمی روکا جاتا ہے اسی کا وہ حریص بن جاتا ہے''

یہ بات اور جہاں کہیں بھی صادق آتی ہو لیکن اصحاب کہف کے قصے میں اس مثالی فقرے کی تاثیری کیفیت واقعی حیرت انگیز ہے۔

کہف والوں کا یہ قصہ نزول قرآن سے پہلے عرب اور عرب کے گردونواح کے ممالک میں مشہور تھا بلکہ گبن نے ''تاریخ زوال رومہ'' میں لکھا ہے کہ سریانی زبان میں یہ قصہ لکھا ہوا بھی پایا جاتا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں پروفیسر گویدی اطالوی نے مصری یونیورسٹی میں ''محاضرات'' کے نام سے عربی زبان میں جو چند لیکچر دیئے ہیں جو مصر ہی سے شائع بھی ہو چکے ہیں' اس نے بھی براہ راست سریانی زبان سے جس کا وہ عالم تھا' اس قصے کو ان محاضرات میں بھی نقل کیا ہے اور اسماء و اعلام کے متعلق بعض دلچسپ باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

بہرحال مجھے کہنا یہ ہے کہ یہی واقعہ جو کسی زمانہ میں پیش آیا تھا' جیسا کہ قرآن کا دستور ہے اپنے مقصد کی حد تک اس سرگزشت کے خاص اجزا اور عناصر کا انتخاب کر کے صراحتہً اس کی ممانعت بھی کردی گئی تھی۔ قرآن ہی میں اس کی ممانعت کردی گئی تھی کہ جو کچھ سنا دیا گیا اس سے زیادہ خواہ مخواہ قصے کی دوسری تفصیلات کی جستجو اور تلاش میں مسلمانوں کو مبتلا نہ ہونا چاہیے۔

وَلَا تَسْتَفْتِ فِیْہِمْ مِنْہُمْ اَحَدًا۔

''اور نہ پوچھنا ان کے (یعنی اصحاب کے) متعلق ان سے (جو جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں) کسی سے بھی''

جس کا حاصل یہی ہوا کہ قصہ کے متعلق جتنی باتوں کا صراحۃً قرآن نے ذکر کیا ہے جس غرض کے لئے قصہ نقل کیا ہے اس کے لئے وہی باتیں کافی ہیں' مگر نہ اگلوں نے ممانعت کے اس قرآنی نص صریح کی پرواہ کی اور نہ پچھلوں نے۔ سرگزشت کس لئے قرآن میں پڑھنے والوں کے سامنے رکھی گئی؟ یہی بات نظروں سے اوجھل ہوگئی اور جس نے جاننے کا کچھ بھی دعویٰ کیا اس سے ہمارے اگلوں نے بھی ''استفتاء'' اور پوچھنے میں کمی نہیں کی اور پچھلوں نے بھی' حالانکہ یوں بھی قرآن کے عموم اور اطلاق کو مخصوص اور مقید کرنے میں ایسے غیر قرآنی وسائل سے کام لینے کی ممانعت کی گئی ہے جن میں قرآن ہی جیسی قطعیت نہ پائی جاتی ہو۔ حد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف بھی خبر آحاد کی راہ سے جو باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ خواہ محدثین کی اصطلاح ''صحیح حدیث'' ہی نام ان کا کیوں نہ ہو لیکن عربی مدارس کے ابتدائی طلبہ بھی جانتے ہیں کہ قرآنی نصوص پر اس قسم کی آحاد خبروں سے بھی اضافہ امام ابوحنیفہؒ جائز نہیں سمجھتے تھے۔ بعض اسرائیلی قصوں کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اعلان فرما دیا تھا' قاضی بیضاوی نے بھی نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ فرماتے تھے:

مايرويه القصاص جلدته مائة وستين۔

''عام قصہ خواں واعظوں میں سے اس اسرائیلی قصہ کو جو بیان کرے گا اسے ایک سو ساٹھ کوڑے لگا دوں گا۔''

مگر آج تک ہماری تفسیروں میں اس قصے [1] کو لوگ نقل ہی کرتے چلے آتے ہیں۔

بہرحال دوسرے قصوں میں لوگ خیال کرتے یا نہ کرتے لیکن اصحاب کہف کے ماجرے کو بیان کر کے براہ راست قرآن میں مزید پوچھ گچھ کی جب قطعی ممانعت کر دی گئی تھی تو کم از کم اس قصہ کی حد تک تو ''قصاصوں'' کا قرآنی فرض تھا کہ اپنی عادت سے وہ باز آجاتے مگر جیسا کہ میں

[1] حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف اوریا کی عورت کے جس قصہ کو منسوب کیا گیا ہے اسی کی طرف اشارہ ہے۔ تفصیل کے لئے تفسیری مطولات کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

نے عرض کیا قرآن نے جو کچھ کہا تھا' جن الفاظ میں کہا تھا جس لئے اس قصے کو آخری آسمانی کتاب کا جز خالق السمٰوٰت والارض نے بنادیا تھا' ان ساری باتوں سے لاپرواہی اختیار کی گئی جو اصل مطلب تھا وہ نگاہوں سے ہٹ گیا اور ایسی دوراز کار باتوں میں لوگ الجھ کر رہ گئے کہ ان کے ذکر سے آج بھی شرم آتی ہے۔ اصحاب کہف کے کتے کے نام کی' اس کے رنگ کی تلاش' وہ جنت جائے گا تو کس قالب میں جائے گا اور کہف والوں کے پاس دقیانوس بادشاہ کے عہد کے جو سکے برآمد ہوئے تھے وہ بچہ شتر کے کھر کے برابر تھے یا اس سے چھوٹے تھے' یہ اس قسم کے سوالوں جوابوں کا طویل سلسلہ ہے جو ہماری قدیم تفسیروں کے لذیذ مباحث ہیں۔

مگر پرانے زمانہ کے دقیانوسی قصاص کو تو میں معذور سمجھتا ہوں' جب دیکھتا ہوں کہ روشن خیالی کے اس عہد میں بھی بجائے اس دقیانوسی سوالوں کے اسی قصہ کے متعلق زمان و مکان کے سوالوں کو اٹھا کر ان ہی لوگوں سے دریافت کر کے جن سے پوچھنے کی قرآن نے ممانعت کر رکھی تھی' اپنے ریسرچ اور تحقیقات کی لوگ داد لے رہے ہیں۔ ❶

❶ اس سلسلہ میں مرزا صاحب قادیانی کے حلقہ بگوشوں نے سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ مرزا صاحب کے صاحب زادے اور قادیان والے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ان کے والد کے پہلے جانشین مولوی نور الدین صاحب کو کسی ذریعہ سے یہ خبر ملی کہ انگلستان میں بمقام گلوس ٹون بری (GLOSTONBARI) کے متعلق انگلستان میں مشہور ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری فلپ نامی کے نمائندہ یوسف آریتا نے اس مقام پر بنیاد رکھی تھی۔ بس اسی افسانہ کو بنیاد بنا کر مولوی نور الدین نے پورا طلسم کھڑا کر دیا اور مدعی ہو گئے کہ انگلستان کے باشندے دراصل اصحاب کہف کی اولاد ہیں اور قرآن میں ان ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ کچھ دن جہل و ناواقفیت کی نیند پڑے رہے اور اب خدا نے ان کو جگا دیا ہے سارے جہان پر حکومت ان کی قائم ہو گئی۔ پوچھا گیا کہ کہف سے ان کا کیا تعلق؟ تو مولوی نور الدین نے بتایا کہ گلوس ٹون بری کا قصبہ چونکہ سمندر کے کنارے ایک ایسے حصہ پر آباد ہے جسے جغرافیہ کی اصطلاح میں کیپ (CAPE) کہتے ہیں پس کیپ سے کیف بنا۔ کیف ہی کہف ہو گیا۔ حاجی بروزن جاجی کے اس قصہ کے متعلق میں خود کیا عرض کروں' مولوی نور الدین کے شاگرد مرزا بشیر الدین محمود بیچارے نے بھی لکھا ہے کہ دماغی فتور کے سوا اسے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ گلوس ٹون بری کے گرجا کا افسانہ بقول ان کے صرف گڑھا ہوا افسانہ ہے اور کیپ کے لفظ کو کہف بنا لینا' مرزا بشیر نے خود لکھا ہے کہف سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے' ص: ۹۱۷' مولوی نور الدین صاحب ہی کے لطیفہ کو ذرا پھیلا کر لاہوری پارٹی کے امیر مولوی محمد علی (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

کچھ بھی ہو اپنا مذاق تو یہی ہے کہ قرآن جن باتوں کو فالتو' دوراز کار قرار دیتا ہو' ان کی تلاش و جستجو میں اپنا یا دوسروں کا وقت بلا وجہ کیوں ضائع کیا جائے۔

بلکہ یہ مان لینے کے بعد کہ نزول قرآن سے پہلے دنیا کے کسی حصہ میں کسی زمانہ میں ایمانی آزمائش کا ایک واقعہ اس قسم کا پیش آیا تھا اور آج جیسے بدترین ناموافق ماحول میں اپنے آپ کو بنی آدم کا وہ طبقہ پا رہا ہے جو ایمان وعمل صالح کی زندگی گزارنا چاہتا ہے لیکن نہیں گزار سکتا۔ اسی قسم کے حالات سے اس زمانہ میں بھی ایمانیوں کی کوئی ٹولی دوچار ہوئی تھی' مگر ان ہی حالات میں مومن بن کر جینے اور مرنے کی راہ ان پر کھولی گئی' جسے قرآن نے بیان کیا ہے اور اسی لئے بیان کیا ہے کہ ہم ان کے طریقہ کار کے نمونوں سے اپنی ایمانی آزمائش کی ان گھڑیوں میں کس حد تک مستفید ہو سکتے ہیں۔ اور آج بھی ایمان وعمل صالح کی زندگی کا دنیا کے موجودہ الحادی

(گزشتہ سے پیوستہ) نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے جو ظاہر ہے کہ بناء الفاسد علی الفاسد کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علمی حیثیت سے اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی معلومات جنہیں اپنی تفسیر میں انہوں نے درج کیا ہے دوسرے اقاصیص وخریفات کے مقابلہ میں قابل توجہ ہو سکتے ہیں مگر خاکسار نے جیسا کہ عرض کیا جس مقصد کے پیش نظر قرآن میں اس قصہ کا ذکر ہے اس کے لئے ان معلومات کی ہمیں قطعاً ضرورت نہیں بلکہ مولانا ابوالکلام کے سوا معلومات کے سوا مرزا بشیر الدین محمود کے خسر ڈاکٹر رشید الدین کا اشارہ کہ ''کٹیا کومیز آف روم'' نامی کتاب کے معلومات بھی علمی حیثیت سے مستحق توجہ ہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود کا بیان ہے کہ اس کتاب میں دین عیسوی کے ان ماننے والوں کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر رومیوں کی بت پرست حکومت تقریباً تین صدی تک مظالم کے پہاڑ توڑتی رہی۔ کتاب میں لکھا ہے کہ ظالم رومیوں سے بچنے کے لئے زیر زمین ان عیسائیوں نے تہہ خانے بنا رکھے تھے ان ہی تہہ خانوں کو ''کٹیا کومیز'' کہتے تھے جن میں عموماً تین منزلیں زمین کے اندر بنائی جاتی تھیں۔ شہر روم کے نواح میں ان تہہ خانوں کا جال پھیلا ہوا ہے' لکھا ہے کہ بھول بھلیاں کی شکل میں زمین کے اندر اندر تقریباً پندرہ میل مربع یہ تہہ خانے پھیلے ہوئے ہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود نے ۱۹۲۴ء کے سفر یورپ میں خود بھی ان تہہ خانوں کا معائنہ کیا تھا بہر حال کچھ ہو یا نہ ہو اس سے اس کا تو پتہ چلا کہ تہہ خانوں میں جنہیں ان ہی کتابوں میں کیو (CAVE) کے لفظ سے بھی موسوم کیا ہے جو عربی کے لفظ کی بگڑی ہوئی یورپین شکل ہے۔ ان میں پناہ لینے کا رواج عیسائیت کے ابتدائی دور میں تھا جیسے روم کے نواح میں یہ کہف بنے ہوئے تھے۔ دوسری جگہوں میں بھی پناہ لینے کی غرض سے اگر بنتے ہوں تو اس پر تعجب کیوں کیا جائے افسوس ہے کہ مرزا بشیر نے بھی اس کے بعد انگریزوں کو اصحاب کہف کی اولاد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

ماحول میں عجیب واقعہ بن کر جورہ گیا ہے۔ قرآن کے اس مثالی قصہ کو سن کر ہمیں سوچنا چاہیے کہ واقعی کیا وہ اسی قدر عجیب اور اتنا ہی حیرت انگیز ہے جتنا کہ اس زمانہ میں باور کرلیا گیا ہے یا باور کرایا جا رہا ہے۔ پھر اس قرآنی قصہ کی روشنی میں تعجب کا ازالہ جب ہو جائے تب اس پر غور کرنا چاہئے کہ جس ''من لدنی باس شدید'' کی دھمکی قرآن نے عقیدہ ولدیت والی قوموں کو دی ہے اور اس عقیدے کے آثار کے آخری انجام کا نقشہ صعید جرز (اجاڑ میدان) کی شکل میں جو اس نے پیش کیا ہے' کیا ان سے پیدا ہونے والے مصائب و آفات کا مقابلہ ایمان و عمل صالح کی اس زندگی سے کیا جا سکتا ہے جسے قرآن ہی نہ ختم ہونے والے اجر حسن یا اچھے معاوضہ کا سر چشمہ قرار دے رہا ہے۔ اور اس قید کے بغیر قرار رہا ہے کہ ایمان و عمل صالح کی زندگی کے ان نتائج کا ظہور اسی حیات ارضی میں ہوتا ہے یا مرنے والوں کے سامنے وہ آئیں گے۔

جیسا کہ میں عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ اصحاب کہف کے قصے کو میرا خیال یہی ہے کہ ان ہی سوالوں کے حل اور جواب کے لئے ہمیں نہیں پڑنا چاہئے۔ نہیں کہہ سکتا کہ جن الفاظ میں یہ قصہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے ان سے اور کتنی قیمتی نتائج نکل سکتے ہیں یا نکالے جا سکتے ہیں' لیکن اب تک جن چیزوں کی یافت سے سرفراز ہوا ہوں' انہیں پیش کر دیتا ہوں۔

قرآن اٹھا لیجئے' عربی سمجھ میں نہ آتی ہو تو کسی ترجمہ کو پڑھ لیجئے' اصحاب کہف کے قصے میں پہلی بات آپ کو یہ نظر آئے گی کہ بجائے ایک کے مجمل و مفصل دو مستقل تعبیروں میں قرآن نے اس قصہ کو بیان کیا ہے۔

> ''جب پناہ لی جوانوں نے کہف (کھوہ) میں' تو کہا انہوں نے اے ہمارے پروردگار عطا کر اپنے پاس سے ہمیں رحمت اور مہیا فرما ہمارے کام کے متعلق ہمیں سوجھ بوجھ تب تھپک دیا ہم نے ان کے کانوں پر کھوہ میں گنتی کے چند سال' پھر اٹھایا ہم نے ان کو تا کہ ہم یہ جانیں کہ دونوں جتھوں میں سے کس نے احصاء کیا اس مدت کا جس میں وہ ٹھہرے (اس کھوہ میں)''

یہ قریب قریب ترجمہ ہے ان قرآنی الفاظ کا یعنی:

اِذْاَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ

اَمْرِنَا رَشَدًاo فَضَرَبْنَا عَلٰى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًاo ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا۔

قصہ کی پہلی تعبیر ہے جس کا نام میں نے اجمالی تعبیر لکھا ہے' گویا کل چار فقروں یا آیتوں پر یہ تعبیر مشتمل ہے۔ اس کے بعد یہ فرماتے ہوئے کہ "میں ان کا قصہ حق کے ساتھ تمہیں سناتا ہوں" قصہ کی تفصیلی تعبیر قرآن میں پائی جاتی ہے جو کافی طویل ہے عام طور پر چھوٹی تقطیع والے قرآن کے ڈیڑھ صفحہ سے زیادہ جگہ اس نے لے لی ہے۔

پہلے اجمال اور پھر تفصیل میں حکمت:

جاننے والے جانتے ہیں کہ اختصار پسندی قرآن کی ایک بڑی خصوصیت ہے لیکن اس خاص قصہ کے متعلق یہ طریقہ کہ پہلے اجمالی تعبیر میں قصہ کو ادا کیا گیا اور پھر اجمال کے بعد اسی قصہ کو تفصیلی رنگ عطا کیا گیا ہے' بجائے خود ایک نئی بات ہے۔ اجمالی اور تفصیلی تعبیروں کے مشتملات پر غور کرنے سے پہلے سوچنے کی بات یہی ہے کہ ایک ہی قصہ کو اجمالی اور تفصیلی دو تعبیروں میں ادا کرنے کی آخر کیا مصلحت ہے؟ اس مصلحت کا صحیح علم تو خود قرآن کے نازل کرنے والے ہی کے پاس ہوگا۔ خاکسار کی جو کچھ یافت اس سلسلہ میں ہے اسے پیش کر دیتا ہے تفصیلی تعبیر کی اس آیت:

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ۔

"(اگر تمہارے دشمن) تم سے واقف ہو جائیں گے تو تم کو سنگسار کریں گے یا واپس کر لیں گے اپنی ملت کی طرف یعنی مرتد بنالیں گے۔"

سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایمانی آزمائش اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ یا جان سے ہاتھ دھو لیں یا اپنے دین سے تعلق قطع کر کے مرتد بن جائیں۔ غالباً ایمانی آزمائش کی شدت کا یہ آخری نقطہ ہو سکتا ہے لیکن اس جز کا اضافہ تفصیلی تعبیر میں کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے اجمالی تعبیر میں صرف اس کا ذکر ہے کہ پناہ لینے کے لئے کہف والے کھوہ میں چلے گئے تھے لیکن کس چیز سے پناہ لینے کے لئے انہوں نے ایسا کیا تھا' اس کا ذکر اجمالی تعبیر میں نہیں ہے۔ صرف ماسبق کے

فحوی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایمانی آزمائش ہی کا یہ قصہ تھا کیونکہ اس کا ذکر اسی سوال کے بعد کیا گیا ہے جو عقیدہ ولدیت کے آثار کے مشاہدہ کے بعد قدرتاً دلوں میں پیدا ہوتا ہے کہ آفات ومصائب کا جو سلسلہ ان آثار سے دنیا میں پیدا ہوگا ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی تدبیر قرآن نے ایمان وعمل صالح کی زندگی کو بتایا ہے لیکن ان آثار کے پیدا کیے ہوئے ماحول میں ایمان ہی کا بچانا تو مشکل ہے' اسی سوال کے جواب میں قرآن نے یہ فرماتے ہوئے کہ ان حالات میں ایمان وعمل صالح کی زندگی کے بچا لینے پر تمہیں تعجب کیوں ہوتا ہے' اس قسم کے واقعات پہلے بھی پیش آ چکے ہیں اور توفیق یافتہ بندوں نے اپنا ایمان بچایا ہے بہرحال سابق و لاحق آیتوں کے تعلق سے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کہف کی طرف پناہ گزینی کے لئے وہ ایمانی آزمائشوں ہی کی وجہ سے روانہ ہوئے تھے' لیکن ان کے فعل کے اس محرک کا صراحتاً تذکرہ قصہ کی اجمالی تعبیر میں نہیں پایا جاتا۔

میرا خیال یہی ہے کہ دنیا میں جیسے عموماً چیزوں کی دو حدیں ہوتی ہیں' ایک ابتدائی اور انتہائی' اسی طرح ایمانی آزمائش میں دیکھا جاتا ہے کہ انتہائی حد تو اس کی وہی ہے کہ جان دیجئے یا ارتداد اختیار کیجئے اور ابتدائی حال اس کا اس ماحول سے شروع ہوتا ہے جس میں گمراہی' ضلالت کا تسلط اکثریت پر ہو جاتا ہے۔ جان یا مال کا خطرہ تو پیش نہیں آتا' مرتد ہونے پر خواہ مخواہ مجبور تو کسی کو کوئی نہیں کرتا لیکن ملک کی عام سوسائٹی اور مجلسی ماحول سے کنارہ کشی اختیار کیے بغیر دین وایمان اور ان کے اقتضاؤں کی تکمیل بظاہر ناممکن یا کم از کم سخت ترین قسم کی دشواریوں کی زنجیروں میں جکڑی نظر آتی ہو' سمجھ میں یہی آتا ہے کہ شاید تفصیلی تعبیر میں ایمان آزمائش کی آخری حد کے مشکلات پیش نظر ہیں اور اسی کے مقابلہ میں ایمانی آزمائش کی ابتدائی کیفیت کی دشواریوں سے نجات یابی کی طرف اجمالی تعبیر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اجمالی تعبیر کے مشتملات:

اب آیئے اس نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے قصہ کی اجمالی تعبیر کے مشتملات اور جو نتائج ان سے پیدا ہوتے ہیں ان پر غور کریں۔

ظاہر ہے کہ پہلی بات اس تعبیر میں یہی بیان کی گئی ہے کہ ایمانی آزمائش میں مبتلا ہونے والوں نے اپنے علاقے کی عام سوسائٹی سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا اور اسی فیصلہ کے مطابق وہ ''الکھف'' (کھوہ) میں پناہ لینے کے لئے چلے گئے یعنی ایسے مقام کا انتخاب بودوباش کے لئے کیا جہاں اس عہد کی عام بے ایمان' ادھرم' ناستک' سوسائٹی کی گندہ لہروں سے محفوظ رہنے کی ان کو توقع ہوسکتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمانی آزمائش کے ان حالات میں علیحدگی اور ''کنارہ کشی'' کی یہ تدبیر بذات خود کوئی اہم بات نہیں ہے بلکہ پہلی بات ان حالات میں دل میں اگر آتی ہے تو یہی آتی ہے کہ

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم نشیں کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

مگر اس شاعرانہ خیال کی خوش گواری اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ خیال صرف خیال ہے لیکن خیالی حدود سے نکل کر عمل کی سرحد میں قدم جس وقت رکھا جاتا ہے اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ یہ خیال اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ شاعروں نے اس کو مشہور کر رکھا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ انسان فطرتاً انس پسند پیدا ہوا ہے تنہا کسی ایسی جگہ زیادہ دن تک وہ ٹھہر نہیں سکتا جہاں انس حاصل کرنے کے لئے اسی کے ہم جنس' ہم مذاق افراد کا ملنا ناممکن ہو جائے۔ ''آدمی فطرتاً مدنی الطبع ہے'' اس کا بھی مطلب یہی ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ عام سوسائٹی سے کنارہ کشی کے بعد معاشی سہولتوں کے بھی دروازے عموماً بند ہو جاتے ہیں حالانکہ سدّ رمق ہی کی حد تک سہی' جس سے جان کا رشتہ بدن کے ساتھ باقی رہے' کم از کم اس کی ضرورت ہر اس شخص کو ہوتی ہے جو فرشتہ نہیں بلکہ آدمی بنا کر دنیا میں پیدا کیا گیا ہے' اور تیسری بات تجربہ کی اس سلسلہ میں وہی ہے کہ جس کا مشاہدہ بداوت کی زندگی رکھنے والوں میں ہمیشہ کیا گیا ہے۔ قرآن میں بھی بداوت کی اسی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ذہنی پستی اس حد تک زوال پذیر ہوتے ہوئے پہنچ جاتی ہے کہ

اَجْدَرُ اَنْ لَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔

''زیادہ مستحق ہو جاتے ہیں (بدوی زندگی رکھنے والے) اس امر کے کہ اللہ کی اتاری

ہوئی باتوں کے حدود کو نہ پہچانیں''

وہ مرد وہ مرد مرد را احمق کند

مشہور بات ہے۔

تہذیب وتمدن کے ماحول سے عزلت گزینی اسی لئے ایک طرف اگر اس کے ماحول کے سمّی اثرات اور زہریلے نتائج سے محفوظ رہنے کی ایک کارگر تدبیر ہے تو دوسری طرف اس قسم کی زندگی قدرتاً دماغ کو کند، عقل کو تاریک بناتی بھی چلتی ہے۔

آپ ان باتوں کو اپنے سامنے رکھ لیجئے اور اب غور کیجئے کہ اصحاب کہف کے قصہ کی اجمالی تعبیر کی آیتوں میں سب سے پہلی بات تو آپ کو یہی نظر آئے گی کہ کہفی زندگی بسر کرنے والوں کو قرآن بجائے فرد واحد ''فتية'' (یعنی نوجوانوں [1] کی ایک ٹولی) قرار دیتا ہے۔

آپ چاہیں تو اس سے یہ نتیجہ پیدا کر سکتے ہیں کہ ایمانی آزمائش کے زمانے میں جب یہ محسوس ہو رہا ہو کہ تہذیب وتمدن کے عام ماحول میں رہ کر ایمان وعمل صالح کی زندگی کے اقتضاؤں کی تکمیل میں کامیابی نہیں ہو سکتی اور نجات کی راہ یہی نظر آتی ہو کہ اس ماحول سے رشتہ منقطع کر کے بود وباش کے لئے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کیا جائے تو جو اس قسم کے خبیث شیطانی ماحول سے دور ہو تو قرآن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اپنے ہم مذاق، ہم مشرب افراد کو آمادہ کیا جائے کہ اس کہفی زندگی میں ساتھ دے کر ایک دوسرے کے لئے باعث انس بھی ثابت ہوں اور ضرورت کے وقت باہم ایک دوسرے کی دست گیری وغمگساری بھی کر سکتے ہوں۔ دوسری بات قصہ کی اسی اجمالی تعبیر سے جو سمجھ میں آتی ہے وہ کہفی زندگی کا فیصلہ کرنے والوں کا یہ نقطہ نظر ہے

[1] یہ خیال کر کے سن رسیدہ ہونے کے بعد آدمی جس ماحول کا عادی ہو جائے اس سے الگ ہونا اس کے لئے بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ بعض حضرات نے فتية (نوجوانوں) کے لفظ سے نکتہ پیدا کیا ہے کہ معمر کہنہ سال لوگوں کو کہفی زندگی کی رفاقت کے لئے نہ لینا چاہئے، مگر میرا خیال یہ ہے کہ رفاقت پر اگر کہنہ سال لوگ آمادہ نہ ہوں تو یہ الگ بات ہے لیکن اگر وہ ساتھ دینے پر تیار ہوں تو محض کہنہ سالی کی وجہ سے ان کو چھوڑنا نہ چاہئے، قرآن میں فتية کا لفظ ضرور آیا ہے لیکن کہف کے رفقا جب تک ہی تھے تو قرآن اگر ان کی تعبیر فتية سے نہ کرتا تو اور کس سے کرتا؟ بہرحال میرے نزدیک یہ واقعہ اظہار ہے خواہ مخواہ اس سے نکتہ آفرینی کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

کہ انہوں نے اس زندگی میں قدم رکھتے ہوئے ہر طرف سے ٹوٹ کر اپنی پرورش کے حقیقی سرچشمہ کے ساتھ لو لگالی تھی' فرمایا گیا ہے کہ "فقالوا ربنا" (انہوں نے کہا اے ہمارے پروردگار) جس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ ربوبیت اور پرورش کے جھوٹے یا مجازی مظاہر ہیں ان سے یک لخت بے تعلق ہو کر اس نئی زندگی کی راہ میں اپنے "رب صادق" اور "سچے پروردگار" کے دامن کو انہوں نے تھام لیا تھا' وہ عام اسباب کی دنیا سے کنارہ کش ہو رہے تھے لیکن جو اسباب کا محتاج بنا کر پیدا کیا گیا ہے وہ ان سے الگ ہو کر کیسے جی سکتا ہے؟ اسی لئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ انہوں نے مجازی اسباب سے تو علیحدگی اختیار کی تھی لیکن جو مسبب الاسباب اور اسباب کا پیدا کرنے والا ہے اس کو پوری طاقت کے ساتھ پکڑے ہوئے تھے اور اسی کے ساتھ اپنے احتیاجی ان عام نتائج کے بعد درحقیقت خصوصی توجہ کے مستحق ان کی دعا کے دونوں فقرے ہیں جن کا پہلا فقرہ ہے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً۔

"اے ہمارے پروردگار! عطا فرما اپنے پاس سے ہمیں "رحمت"۔

اور دوسرا فقرہ یہ ہے کہ:

وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۔

"اور فراہم فرما! ہمارے معاملہ میں "رشد"

"رشد" عربی زبان کا لفظ ہے جسے قرآن میں بار بار استعمال کیا گیا ہے خصوصاً "غیی" کے مقابلہ میں "الرشد" کے اسی لفظ کو استعمال کر کے قرآن ہی بتا رہا ہے کہ انسان کی فکری و نظری قوت سے اس کا تعلق ہے۔ یہی فکری و نظری قوت جب غلط نتیجہ تک پہنچتی ہے تو اس کا نام "غیّ" ہے اور ٹھیک اصل حقیقت تک فکر و نظر کی رسائی کی صلاحیت کا نام "رشد" ہے۔ بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دعا کے دوسرے فقرے کا تعلق چونکہ باطنی احساسات اور معنوی رجحانات سے ہے تو مطلب اس کا یہی ہوا کہ سوسائٹی کے گندے اور خبیث رجحانات کے مقابلہ میں جس ایمانی مسلک کی توفیق ان کو میسر آئی تھی جس کی تعبیر اَمْرِنا کے لفظ سے دعا میں کی گئی ہے اپنے اسی ایمانی مسلک کے متعلق حق تعالیٰ سے وہ آرزو کر رہے تھے کہ غی اور گمراہی سے بچاتے

ہوئے ان کی فکر ونظر کی قوتوں میں رشد کی روشنی پیدا کی جائے یعنی ایمانی ترقی اور باطنی سلوک کی راہ میں چاہتے تھے کہ جو قدم بھی اٹھے رشد کی یہی معنوی روشنی ان کو آگے بڑھاتے ہوئے لئے چلی جائے۔اس تشریح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی دعا کے پہلے فقرے میں ''رحمت'' کا جو لفظ پایا جاتا ہے اس کا مطلب بھی متعین ہو جاتا ہے' مطلب یہ ہے کہ یوں تو رحمت اور وہ بھی رب السموت والارض کی قرآناً ہر چیز میں سمائی ہوئی ہے۔وسعت رحمتی کل شیء (ہر شئے میں میری رحمت پھیلی ہوئی ہے) قرآن ہی کی آیت ہے مگر یہاں ''رحمت'' کے اس لفظ کا استعمال جب ''رشد'' کی معنوی و باطنی صفت کے مقابلہ میں کیا گیا ہے تو اس قرینہ سے یہی سمجھنا چاہئے کہ معنوی و باطنی ضرورتوں کے مقابلہ میں ان حاجتوں کے متعلق پروردگار عالم کی رحمت کی استدعاوہ کر رہے تھے جن کی تعبیر ہم ظاہری اور معاشی ضرورتوں سے کر سکتے ہیں' حاصل یہی ہوا کہ ملک کی عام سوسائٹی سے علیحدگی کے بعد قدرتاً جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہی دو باتیں سب سے زیادہ اہم ہوتی ہیں یعنی معاشی ضرورتوں کا مسئلہ اور فکری ونظری قوتوں کے انحطاط وزوال کا خطرہ' الغرض ظاہر و باطن کی ان ہی دونوں اہم ضرورتوں میں حق تعالیٰ غیبی پشت پناہیوں کی درخواست پر ان کی یہ دعا کم ازکم اس خاکسار کو مشتمل نظر آ رہی ہے۔

اس کے بعد میرا خیال یہ ہے کہ ''رشد'' کی درخواست دعا کے دوسرے فقروں میں جوان کی طرف سے پیش ہوئی ہے اگرچہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی آرزو کی تکمیل کے لئے قدرت کی طرف سے کہفی زندگی میں کیا کیا انتظامات کئے گئے تھے مگر بظاہر جہاں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایمانیوں کی یہ ٹولی ایک دوسرے کے ساتھ حق [1] اور صبر کی تواصی کے فرض کو ادا کر کے جیسا چاہئے ان کے ''رشد'' کی حفاظت کرتی ہوگی وہیں اس پر کیوں تعجب کیا جائے کہ ایمانی راہ کے دوسرے چلنے والے جوان سے پہلے گزر چکے تھے ان کی تعلیمات اور مشوروں سے بھی مستفید ہونے کا موقع ان کی رقمی یادگاروں سے ان کو عزت اور کنارہ کشی کی زندگی میں مل گیا ہو بالفاظ دیگر ان کے پاس دوسرے انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں سے کچھ صحائف و مخطوطات اور ان ہی

[1] حق اور صبر کی ایک دوسرے کو وصیت و تلقین اہل ایمان کی ایک قرآنی خصوصیت ہے۔سورۃ العصر میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پیغمبروں کے ماننے والوں کی لکھی ہوئی کچھ کتابیں ہوں جن سے ان کی رشدی بصیرت روشنی حاصل کرتی ہو تو اس کے انکار کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی بلکہ یہ جو "الــــــکھف" کے ساتھ "الــرقیم" کے لفظ کی طرف بھی ان کی اضافت کی گئی ہے۔ تفسیر کی عام کتابوں میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف جن کے متعلق اگرچہ یہ قول بھی منسوب کیا گیا ہے کہ:

لا ادری ماالرقیم

"میں نہیں جانتا کہ "رقیم" کیا چیز ہے۔

تو ان ہی تفسیروں میں ان ہی کا یہ قول بھی ملتا ہے، درمنثور میں ابن المنذر اور ابن ابی حاتم کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

"من طریق علی عن ابن عباسؓ قال الرقیم الکتاب" (ص ۲۱۱، ج ۴)

علی کی یہ روایت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ "الرقیم "الکتاب ہے۔

علی جن کا پورا نام علی بن ابی طلحۃ الہاشمی ہے جو جانتے ہیں کہ ابن عباسؓ (کے تفسیری اقوال کی روایت میں ان کا کیا مرتبہ [1] ہے) کی تفسیر میں کتنی قوت ہے۔

بہرحال میری غرض یہی ہے کہ "الرقیم" سے کیا مراد ہے؟ اگر اس کا متعین کرنا ضروری ہو تو لغت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اور لکھی ہوئی چیز کو "الــرقیم" کہتے تھے اور صحابہؓ کے اقوال میں بھی مستندترین قول یہی ہے کہ "الرقیم" سے مراد الکتاب ہے ایسی صورت میں کیوں نہ سمجھا جائے کہ ان کی دعا کے دوسرے فقرے یعنی اپنے امر کے متعلق "رشد" کی جس روشنی کے مہیا کرنے کی درخواست انہوں نے بارگاہ الٰہی میں پیش کی تھی، اسی درخواست کی منظوری "الرقیم" کو مہیا کر کے قدرت کی طرف سے ہوئی تھی۔

خلاصہ یہ کہ کہفی زندگی کی یہ دونوں اہم ضرورتیں یعنی معاشی سہولتیں ان کے لئے من لدنی

---

[1] اسی سے اندازہ کیجئے کہ امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے کہ مصر میں علی ابن ابی طلحہ کی روایت سے ابن عباسؓ کی تفسیر کا جو نسخہ پایا جاتا ہے اگر بغداد سے صرف اسی نسخہ کو حاصل کرنے کے لئے مصر کا کوئی سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی (اتقان) بخاریؒ نے بھی ابن عباسؓ کے تفسیری اقوال کے نقل کرنے میں اسی طریقہ کو ترجیح دی ہے۔

طور پر فراہم کی جائیں اور باطنی روشنی کی بقا وارتقا ان دونوں ضرورتوں کا انتظام اپنے رب کے سپرد کر کے کہفی زندگی میں وہ داخل ہو گئے۔ اس کے بعد قصہ کی اجمالی تعبیر میں دو فقرے اور پائے جاتے ہیں۔ پہلا فقرہ تو یہ ہے:

فَضَرَبْنَا عَلٰى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا۔

''پس تھپک دیا ہم نے ان کے کانوں میں کہف میں چند سال گنتی کے۔''

بظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ''رشد'' کی معنوی بصیرت ہی کی حفاظت کا یہ سامان بھی قدرت کی طرف سے ان کے لئے کیا گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ فاسد اور بگڑی ہوئی سوسائٹی سے جسمانی طور پر علیحدگی عموماً اس وقت تک چنداں مفید ثابت نہیں ہوتی جب تک کہ سوسائٹی کے فساد و بگاڑ کے اس عہد کے ذکر واذکار' گپ شپ' جھوٹ' خرافات سے بھی اپنے آپ کو بے تعلق نہ کرلیا جائے۔ اس زمانے میں تو خیر اخبارات نکلتے ہیں جن میں جھوٹ کے ساتھ ساتھ کچھ سچی خبریں بھی چھپتی رہتی ہیں اور دور دراز کار اور ایسے واقعات کا بھی علم پڑھنے والوں کو ان کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے جن سے شخصی نہ سہی لیکن قومی یا ملکی اغراض پڑھنے والوں کے بھی یک گونہ وابستہ رہتے ہیں اور خواہ کسی قسم کا عملی حصہ ان حوادث و واقعات کے تغیر وتبدل میں لینے کی گنجائش وہ نہ رکھتے ہوں مگر جہل کے مقابلہ میں یہی سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان واقعات کا علم تو حاصل ہو گیا اگرچہ سچی بات یہی ہے کہ اخبار خوانوں یا ریڈیو سننے والوں کی اکثریت کا خبروں کے پڑھنے اور سننے' پھر باہم ملنے جلنے والوں سے تنقید و گفتگو کرنے' پھر موافق و ناموافق خبروں سے مسرت والم کے تاثرات دلوں میں قدرتاً جو پیدا ہوتے رہتے ہیں ان قصوں میں سوچا جائے گا تو نظر آئے گا کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں ہر روز اپنے عزیز واوقات کا بڑا قیمتی حصہ بلاوجہ ضائع ہوتا رہتا ہے اور اس طرح پر ضائع ہوتا رہتا ہے جس کے معاوضہ کی توقع نہ اس زندگی میں ضائع کرنے والوں کو ہوتی ہے اور نہ مرنے کے بعد آنے والی زندگی میں ان کا معاوضہ کسی شکل میں ان کے آگے آئے گا۔

پھر ذرا سوچئے ان دنوں کو جب بجائے اخبارات و جرائد کے ہر بولنے والی زبان اخبار کا ایک ورق اور سچی جھوٹی خبروں کے گھڑنے والے دماغ پریس کی حیثیت حاصل کئے ہوئے

تھے۔ جس کے جی میں جو بھی آتا خبر بنا کر اسے پھیلا دیا کرتا تھا اور ایک سے دوسرے تک پھیلتے ہوئے خبریں زمین کے کناروں تک چلی جاتی تھیں۔ راہ کا ہر راہی اس سمت کا روز نامہ ہوتا تھا' جدھر سے وہ آتا تھا اپنے اپنے ہر ملنے والے کی کان میں کچھ ڈالتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا تھا۔ آج اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس راہ سے انسانی زندگی کے گرامی قدر اوقات کو شیطان کس بے دردی کے ساتھ برباد کر رہا تھا اور وقت کی بربادی تو خیر ایک منفی حالت ہے۔ ان ہی راہوں سے وساوس واوہام کے طوفان اور ان کی پیدا کی ہوئی تاریکیوں اور ان کی پھیلائی ہوئی گندگیوں کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ فلسفہ اور حکمت' شعریت وخطابت' اور کیا کیا بتایا جائے کن مدہش اور مہیب ناموں سے انسانی دل ودماغ کو مرعوب کرنے کی کوشش ان ہی ابلیسی بوالہواسیوں کی راہ سے نہیں کی گئی یا نہیں کی جارہی ہے۔

اوروں کا خیال کچھ ہی ہو لیکن اپنا تجربہ تو یہی ہے کہ ''رشد'' و''ہدایت'' کی لاہوتی روشنی سے صحیح طور سے استفادہ ان لوگوں کے لئے مشکل ہو جاتا ہے جنہوں نے اسی ''روشنی'' کے ساتھ ان ظلمات اور تاریکیوں کی موجوں کو بھی اپنے اندر گزرنے کے لئے آزادی دے رکھی ہو' جو فاسد سوسائٹی کے دل ودماغ سے نکل نکل کر ماحول کو متاثر کر رہی ہوں۔

کچھ بھی ہو' اپنا ذہن تو مذکورہ بالا آیت جس میں فرمایا گیا ہے کہ چند سال کیلئے ان کے کانوں کو ہم نے تھپک دیا تھا۔

فَضَرَبْنَا عَلٰى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا۔

اس سے ادھر منتقل ہوتا ہے کہ رشد کی جس روشنی کی فراہمی کی استدعا بارگاہ ربانی میں ان لوگوں نے پیش کی تھی اسی کے سلسلہ میں اور جو قدرتی تائیدیں ان کو میسر آئی ہوں گی ان ہی کے ساتھ شاید یہ بھی کیا گیا کہ اپنے ملک کی سوسائٹی کے جس متعفن اور سڑے ہوئے ماحول سے نکل کر کہفی زندگی کے نیچے انہوں نے پناہ لی تھی۔ اس سوسائٹی میں گزرنے والے حوادث وواقعات اور اس میں پیدا ہونے والے گندے افکار وخیالات سے بھی ان کے کانوں کا رشتہ توڑ دیا گیا تھا اور بجائے اس کے کہفی زندگی میں ان کے ''رشد'' کی بقا اور ارتقاء کا جو سامان پیدا کیا گیا تھا اسی میں وہ مگن تھے۔

اور میرا خیال تو یہ ہے کہ اسی سے

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا۔

پھر ہم نے ان کو اٹھایا تا کہ ہم جانیں (یعنی اس 1 علم کو ظاہر کریں) کہ دونوں فریق میں سے کس نے اس مدت کا احصاء کیا جس میں وہ غار میں ٹھہرے۔''

قرآن کی اس آیت کا مطلب بھی با آسانی سمجھ میں آجاتا ہے جس پر قصہ کی اجمالی تعبیر کو قرآن نے ختم کیا ہے۔

صرف ایک لفظ یعنی ''احصی'' سے کیا مراد ہے؟ اس کو طے کر لیجئے بات انشاء اللہ آپ کی سمجھ میں بھی آجائے گی۔ یوں تو ''حصی'' کے مادہ سے ماخوذ ہے' شمار کرنا اور گننا جس کا ٹھیٹ لغوی ترجمہ ہے' عام مترجمین نے یہی ترجمہ درج بھی کیا ہے لیکن بجنسہ یہی ''احصی'' ماضی کا صیغہ ''اسماحسنیٰ'' والی مشہور حدیث میں بھی ستعمال کیا گیا ہے لغت حدیث کی کتاب ''نہایہ'' میں ابن اثیر نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اطاق قیام حقها و اطاق العمل بمقتضا ها۔''

''(اسماء حسنیٰ کا جو حق تھا) اس حق کو ادا کیا اور ان کا جو مقتضی تھا اسے پورا کیا۔''

راغب نے بھی ''مفردات'' میں قرآنی الفاظ ''لن تحصوه'' کو درج کر کے کی قراءت سے اس کی شرح کی ہے' پھر حدیث:

نفس تنجیها خیر لك من امارة لا تحصیها۔

---

1 یہ قرآن کا ایک خاص طریقہ ادا ہے جسے وہ عموماً استعال کرتا ہے۔ یہ وسوسہ کہ وقوع سے پہلے کیا واقعات کا علم حق تعالیٰ کو نہیں ہوتا۔ بالکل بے بنیاد ہے تا کہ ہم جانیں اس سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ اس واقعہ سے ناواقف تھے یہ تو آپ کا اپنا دماغی اضافہ ہے کہ مفہوم مخالف پیدا کر کے قرآن کی طرف ایسی بات منسوب کر دیں جو اس میں نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی چیز کا علم ہمیں ہوتا ہے لیکن دوسرا یہ نہیں جانتا کہ میں اس سے واقف ہوں تو اس موقع پر آدمی اپنے علم کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے'' جناب میں جانتا ہوں کہ آپ نے فلاں کام کیا ہے'' اس وقت مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو اپنے عالم ہونے کی خبر دی جائے نہ کہ واقعہ کا اسی وقت علم حاصل ہوا ہے اس کی خبر اس طریقہ بیان سے دی جاتی ہے۔ دوسری زبانوں میں بھی ایسے محاورات مستعمل ہیں۔

''اپنی جان لے کر پار نکل جانا یہ تمہارے لئے اس امارت اور افسری سے بہتر ہے
جس کے حقوق سے تم عہدہ برآنہ ہو۔''

سے بھی ''احصٰی'' کے اس مطلب کو سمجھانا چاہا۔ ارباب تحقیق کی ان شہادتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سورہ کہف کی اس آیت کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ جو مدت اس عرصہ میں گزری' اس زمانہ کی جو قدر و قیمت تھی اس کو ان دونوں فریق میں سے کون صحیح معنوں میں حاصل کر سکا؟ یعنی ملک کی عام سوسائٹی سے الگ ہو کر کہفی زندگی جن لوگوں نے اختیار کی تھی وہ اپنے وقت کی صحیح قیمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے یا فاسد اور گندی سوسائٹی میں جو گھلے ملے رہے انہوں نے اپنے وقت کو ضائع ہونے سے بچایا۔

ظاہر ہے کہ اس راہ میں وہی یقیناً کامیاب رہے جنہوں نے وقت کی فاسد سوسائٹی اور اس کے گندے ماحول کو حوادث وسوانح اور پیدا ہونے والے افکار وخیالات سے الگ تھلگ رہ کر ہر چیز سے کان کو بند کئے ہوئے ''رشد'' کی روشنی میں کہفی زندگی کی اس مدت کو گزارا تھا۔ آخر یہ مطلب اگر نہ لیا جائے تو یہ بات کہ کہفی زندگی کی یہ مدت جنتری کے حساب سے کتنی تھی؟ اس کے جاننے یا نہ جاننے کو اہمیت اس موقع پر کیا تھی؟ جسے قرآن ان کی کہفی زندگی کا آخری نتیجہ قرار دے رہا ہے۔

بہر حال اصحاب کہف کے قصہ کی اجمالی تعبیر سے قرآن کی جن آیتوں کا تعلق ہے ان سے تو صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ ناموافق حالات پر غالب آنے یا ان سے مقابلہ کرنے کا امکان جب محسوس ہو کہ باقی نہیں رہا ہے تو اس وقت ایمان وعمل صالح کی زندگی کے بچا لینے کی تدبیر یہ ہے کہ کہفی زندگی اختیار کر لی جائے اور یہ کہفی زندگی میں معاشی دشواریوں کے ساتھ فکری جمود اور ذہنی خمود کا خطرہ قدرتاً جو پیدا ہوتا ہے' توجہ دلائی گئی ہے کہ حق تعالیٰ سے ان دونوں خطروں سے محفوظ رہنے کی دعا کی جائے اور یہ وہی مشورہ ہے جس کی طرف ان صحیح حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے جن میں آیا ہے کہ ایسا وقت بھی آنے والا ہے جس میں القاعد' بیٹھنے والا القائم (کھڑا رہنے والا) سے اور الماشی' معمولی چال چلنے والا الساعی (دوڑنے والے) سے بہتر ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ اس زمانہ میں بجائے میدان میں آنے کے چاہئے کہ مومن

اپنے گھر کا ٹاٹ بن کر پڑ جائے۔ بخاری کی مشہور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

یوشك ان یکون خیر مال المسلم غنم یتبع بھا شعف الجبال و مواقع القطر یفر بدینه من الفتن۔

"قریب ہے کہ مسلمانوں کا بہترین مال بکریاں ہوں گی جن کے پیچھے پیچھے پہاڑوں کی چوٹیوں اور پانی کے چشموں کی طرف اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لئے بھاگا پھرے گا۔"

حدیث کا مفاد بھی یہی ہے۔ پیشین گوئی کی گئی ہے کہ مستقبل میں بھی مسلمانوں کو اس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا جیسے مکی زندگی کے دور سے نبوت کبریٰ عامہ جب گزر رہی تھی۔ تو قرآن ہی میں اسی عہد کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ ο وَاِذَا مَرُّوْا بِھِمْ یَتَغَامَزُوْنَ ο وَ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓی اَھْلِھِمُ انْقَلَبُوْا فَکِھِیْنَ ο وَ اِذَا رَاَوْھُمْ قَالُوْٓا اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ο (المطففین)

"جو مجرم ہیں وہ ایمان لانے والوں پر ہنستے ہیں اور جب ان پر گزرتے تو ان کے متعلق باہم ایک دوسرے سے چشمک زنی کرتے ہیں اور جب واپس لوٹتے ہیں اپنے گھروں کی طرف تو باتیں بناتے ہیں' اور جب ایمان والوں کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہی لوگ گمراہ ہیں۔"

صحابہ کرامؓ کے سامنے ایسے واقعات گزر رہے تھے کہ سنگ وخشت سے بنی ہوئی مسلمانوں کی کوئی عبادت گاہ نہیں' بلکہ اسلام کے سارے احترامی عناصر کا تقدس جس ذات گرامی کے احترام وتقدس کے ساتھ وابستہ ہے' یعنی خود سرور کائنات ﷺ سجدے میں ہیں' پشت مبارک پر اونٹنی کی بچہ دانی ڈال دی گئی ہے اور صحابہ کرامؓ جیسے تر وتازہ ایمان رکھنے والے حضرات پیغمبر کو اس حالت میں دیکھتے ہیں۔ ابن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا بیان امام بخاریؒ ہی نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس حال کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وانا انظر ولا اغنی عنه لو کانت لی منعة۔

''میں رسولؐ اللہ کو اس حال میں دیکھتا اور کچھ کام نہ آ سکتا' کاش میرے پاس مدافعت کی قوت ہوتی''

تفصیلی تعبیر کے عمومی مشتملات:

غرض قصہ کی اجمالی تعبیر سے صرف اتنی بات معلوم ہوئی کہ اپنی دینی زندگی کو چاہا جائے تو ہر حال میں بچا لیا جا سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اصحاب کہف کی سرگزشت کا تعلق جہاں تک میرا خیال ہے اس بشارت سے ہے جس میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ ایمان وعمل صالح کی زندگی کے اجر حسن یا نتائج وثمرات سے اہل ایمان ہر حال میں مستفید و متمتع ہوتے رہتے ہیں' یعنی ما کثین فیه ابدا۔ (ٹھہرے رہیں گے اس میں (یعنی ایمان وعمل صالح کے نتائج وثمرات میں) قائم ودائم رہیں گے)

ہمیشہ کے الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے' اصحاب کہف کے قصہ کی تفصیلی تعبیر قرآن کے جس بیان کو میں قرار دے رہا ہوں' اگر غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ اس دعویٰ کے ثبوت کی گویا یہ ایک تاریخی مثال ہے' بتایا گیا ہے کہ اپنے رب یا پالنے والے پر ایمان جو آدمی کا اختیاری فعل ہے' اسی قسم کا اختیاری فعل جیسے نور یا روشنی چاروں طرف سے ہمیں گھیرے رہتی ہے' لیکن روشنی کے جاننے کا جو قدرتی ذریعہ بینائی کی قوت ہے' آپ کو اختیار ہے روشنی کے ساتھ متعلق کر کے اس کو دیکھئے یا چاہئے تو آنکھیں بند کئے پڑے رہئے ایسی صورت میں روشنی جس سے دنیا جگمگا رہی ہے آپ کو نظر نہ آئے گی' اس طرح آپ کا رب اور آپ کی پرورش کرنے والی قوت بھی گو آپ پر محیط ہے' آپ سے قریب ہے' مگر اپنے اسی رب' اس کی ذات وصفات' افعال و مرضیات کی یافت کا جو طبعی طریقہ ہے' یعنی نبوت و رسالت پر اعتماد اس وقت تک آپ کا ایمانی حاسہ اپنے رب کے پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ رب کی یافت کے اس طبعی طریقہ اور قدرتی ذریعہ کو کام میں نہ لایا جائے۔

بہرکیف قصہ کی تفصیلی تعبیر میں یہی بیان کیا گیا ہے کہ نوجوانوں کی وہی ٹولی جن کو ہم اصحاب کہف کہتے ہیں کہ وہ اپنے پالنے والی قوت یعنی اپنے رب پر ایمان لانے میں کامیاب

ہوئی۔ یہ فعل تو ان کی طرف سے ہوا' اس کے بعد ان کے اسی ایمان کا اجر حسن یا اس کے نتائج و ثمرات ان کے سامنے مسلسل پیش آتے چلے گئے اور اس ترتیب کے ساتھ پیش آتے چلے گئے کہ ان کے ایمان کو اگر تخم فرض کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تخم کے کلّے پھوٹے' کلّوں سے شاخیں نکلیں' شاخوں سے شاخوں کے نکلنے کا سلسلہ جاری رہا اور عجیب طرح سے جاری رہا۔

مطلب یہ ہے کہ پہلے بھی قصہ کے اس تفصیلی بیان کی اس خبر کا تذکرہ کر چکا ہوں یعنی اپنی قوم سے کہف والوں کی کش مکش ترقی کرتے ہوئے خطرے کے اس آخری نقطہ تک پہنچ چکی تھی کہ قرآن نے ان ہی کی زبانی' بایں الفاظ اس کو نقل کیا ہے:

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْيُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْآ اِذًا اَبَدًا (الکهف)

''(یعنی وہ کہتے تھے) کہ ہماری قوم کے لوگ اگر تم سے واقف ہو گئے تو تمہیں یا تو سنگسار کر دیں گے یا پلٹا لیں گے اپنی ملت کی طرف اور پھر تم لوگ کبھی کامیاب نہ ہو سکو گے۔''

جس کا حاصل یہی ہوا کہ اپنے دین کو بچا لینے کے لئے دیکھ رہے تھے کہ سنگسار ہونے کے خطرے میں مبتلا ہونا پڑے گا اور سنگسار ہونے کے خطرے سے اگر بچنا چاہتے ہیں تو مرتد ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی عاقبت کو برباد کرنے پر آمادہ ہونا پڑتا ہے۔ اپنی قوم کی مخالفت نے ان بے کسوں کو بے چارگی اور بے نوائی کی اس بدترین دردناک حد تک پہنچا دیا تھا۔ ہر ایک ان میں یا ان غریبوں کی جان کا گاہک تھا یا جان سے بھی زیادہ عزیز ترین متاع دین ہی سے محروم کرنے پر تلا ہوا تھا' یہ ہو سکتا تھا کہ تہور بے جا سے کام لے کر اپنی قوم سے وہ ٹکرا جاتے اور سنگسار یا قتل ہو کر شہادت کا درجہ حاصل کر لیتے لیکن انہوں نے یہ نہیں کیا بلکہ اپنی قومی سوسائٹی کے مخالفانہ ماحول سے کنارہ کشی اختیار کر کے کہف (کسی پہاڑ کے کھوہ) کی طرف پناہ لینے کے لئے وہ چلے گئے' اتنی بات تو قصہ کی اجمالی تعبیر ہی سے معلوم ہو چکی اس کے بعد قرآن میں کہتے ہوئے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ۔

''ہم تمہارے سامنے بیان کرتے ہیں (ان کہف والوں) کی خبر کو حق کے ساتھ''

حق کے ساتھ' یہ ایک قرآنی محاورہ ہے اور مختلف مقامات معانی میں استعمال کیا گیا ہے' یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ قصہ صرف برائے قصہ نہیں سنایا جائے گا بلکہ سنانے کا مقصد یہ ہے کہ اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق لوگ اس قصہ سے حصہ حاصل کریں' آگے اسی قصہ کی تفصیلی تعبیر شروع ہوئی ہے' پہلی خبر اس سلسلہ میں یہ دی گئی ہے کہ:

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ۔

''(یہ کہف والے) چند نوجوان تھے' ایمان لے آئے تھے وہ اپنے رب پر۔''

''اپنے رب پر ایمان لانا'' یہی ان نوجوانوں کا اختیاری فعل تھا۔ چاہتے تو جیسے ان کی قوم کی اکثریت اپنی اس پرورش کرنے والی قوت سے لاپروائی اور بے اعتنائی کا طریقہ اختیار کئے ہوئے زندگی گزار رہی تھی' وہ بھی اسی طریقہ کو اختیار کر لیتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنے رب کی یافت کا جو قدرتی طریقہ ایمان کا ہے اس کا رشتہ ''رب'' سے قائم کر کے مومن بن گئے' یہاں تک تو ان کا کام تھا جسے ان نوجوانوں نے انجام دیا' اب سنئے اسی ایمان کا اجر حسن ان کے سامنے کن کن شکلوں میں مسلسل آتا چلا گیا' اس کے بعد اطلاع دی گئی ہے۔

''وَزِدْنٰهُمْ هُدًى''

''اور ہم نے ہدی (یعنی راست بینی اور حق یابی) میں ان کو بڑھا دیا۔

سمجھا آپ نے یہ کیا کہا گیا؟ نوجوانوں نے اپنے رب پر ایمان لانے کے فرض کو پورا کیا تھا' تب اس کا معاوضہ اور اجر حسن ان کو انکے رب کی طرف سے ایک معنوی دولت اور باطنی نعمت کی شکل میں عطا کیا گیا' یعنی باہر میں تو بظاہر کسی قسم کی کوئی ایسی چیز ان نوجوانوں کے سامنے نہیں آئی جسے دیکھنے والے ان کے ایمان کا اجر و معاوضہ قرار دیتے لیکن اندر ہی اندر ان کی بصیرت کی روشنی میں قدرت کی طرف سے اضافہ شروع ہوا۔ ایمان سے پہلے جن باتوں کا تصور بھی ان کے لئے دشوار بلکہ شاید ناممکن تھا ان ہی کو وہ پا رہے تھے اور قدرت کی پیدا کی ہوئی اس معنوی روشنی میں ان ہی کو وہ دیکھ رہے تھے تا آیں کہ باطنی سلوک کی اس راہ میں چلتے ہوئے وہ ایک ایسے مقام تک پہنچ گئے جس کی خبر قرآن سے اسی کے بعد ان الفاظ میں دی ہے' فرمایا گیا ہے:

''وَ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ''

''اور باندھ دیا ہم نے ان کے قلوب پر یعنی دلوں پر''

''قلوب'' قلب کی جمع ہے۔ یہ وجود انسانی کے اس عنصر کی تعبیر ہے جس کا کام ہی انقلاب ہے' یعنی یہ کہ الٹتا پلٹتا رہے۔ یہی ہے لامحدود اسباب کا یہ گھنا جنگل جس کا نام عالم یا دنیا ہے۔ اس عالم کے رب سے جب تک انسانی وجود کا یہ چنچل حصہ بیگانہ اور نامانوس رہتا ہے' اس وقت تک بجز اس بات کے کہ ایک سبب سے منتقل ہو کر دوسرے سبب اور دوسرے سے تیسرے سبب کی وادی میں سراسیمہ ہو کر بھٹکتا رہے' بلکہ سراسیمگی و حیرانی و سرگردانی میں جس کی حرکت جتنی زیادہ تیز ہوتی ہے وہی رب پر ایمان سے محروم رہ جانے والی مجلسوں میں ستائش اور شاباشی کا زیادہ مستحق ٹھہرایا جاتا ہے۔

لیکن ایمان کی راہ سے اپنی پرورش کرنے والی قوت کو جو پا لیتے ہیں اور اس ایمان کے معاوضہ میں معنوی بصیرت کی جو روشنی ان کو رب کی طرف سے ارزانی ہوتی ہے اس باطنی روشنی کی شدت جس حد تک بڑھتی جاتی ہے اسی حد تک ان کے آگے اصل حقیقت اور ''ربوبیت'' کا صادق نظارہ بے نقاب ہونے لگتا ہے تا ایں کہ وہی ''قلب مضطرب'' یا انسانی وجود کا ''بے چین عنصر'' قلب' سکون و قرار کے ایسے خنک برف خانے میں اپنے آپ کو پاتا ہے جس کی صحیح تعبیر یہی ہو سکتی ہے کہ ہر طرف سے توڑ کر اسی قلب کو ''ربوبیت'' کے حقیقی سرچشمہ کے ساتھ گویا باندھ دیا گیا ہے۔

طمانیت و سکون کی اسی کیفیت کو لوگ روپے کے ڈھیروں' بینک کے پاس بکوں اور سرمایہ کی دوسری منقولہ وغیر منقولہ جائیدادوں کے اندر ڈھونڈھتے ہی رہتے ہیں لیکن اپنے رب کے ساتھ قلب کے مربوط ہو جانے کی مذکورہ بالا باطنی نعمت سے جو سرفراز کیا جاتا ہے اس کے پاس باہر میں خواہ کچھ ہو یا نہ ہو لیکن اپنے باطن کو ہر چیز سے کسا کسایا جاتا ہے' دماغ نام رکھئے یا دل' عقل کہئے یا دانش' ڈانواڈول رہنے کی لعنت سے اس کو نجات مل جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے اقدامات کی جرات اس میں پیدا ہو جاتی ہے جن کو رب سے ٹوٹے ہوئے غیر مربوط قلب والے شاید سوچ بھی نہیں سکتے خود ان ہی یعنی نوجوانوں کے متعلق آگے ان کے قصہ کی تفصیلی تعبیر میں جو یہ خبر دی گئی ہے کہ:

اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا۔

"(اور دیکھو) جب وہ کھڑے ہوئے پھر بولے ہمارا پالنے والا آسمانوں اور زمین کا پالنے والا ہے۔ ہرگز نہیں اس کے سوا ہم کسی الٰہ کو پکاریں گے اگر ایسی بات ہم نے کہی تو (حقیقت سے) یہ ہٹی ہوئی بات ہوگئی۔"

ہدایت کی باطنی روشنی جوان میں بڑھائی گئی تھی اسی روشنی میں انہوں نے پایا کہ ہماری پرورش جو قوت کر رہی ہے وہی پالنے والی قوت آسمانوں اور زمین (اور ان دونوں میں رہنے والی ہستیوں کی) بھی پروردگار ہے' وحدانی ربوبیت کے اس جلوے نے ان کے لئے آبادی اور بن دنوں کو ایک کر دیا۔ ان کی قوم جو ایمان اور ایمان سے پیدا ہونے والی اس بصیرت سے محروم تھی ان کے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لامحدود کثرتوں کے اس نظام کی ربوبیت و پروردگاری کے لئے صرف ایک ہی "رب" کیسے کافی ہو سکتا ہے' اسی لئے ایک خالق کے وجود کو ربوبیت اور پروردگاری کے لئے ناکافی ٹھہراتے ہوئے انہوں نے دوسری ہستیوں کے ساتھ وہی رشتہ قائم کر لیا تھا جو رشتہ بندوں اور ان کے معبود میں ہوتا ہے یعنی ان سے مدد حاصل کرنے کے لئے ان کی عبادت کرتے تھے' ان سے دعائیں مانگتے تھے' ان کی پوجا پاٹ کرتے تھے' نوجوانوں کی یہ ٹولی اپنی باطنی روشنی میں خالق عالم کی پروردگاری کو پا رہی تھی کہ کافی ہے اور قطعاً کافی ہے اور ان کی قوم اسی ربوبیت اور پروردگاری کے لئے مزید قوتوں کا اضافہ کر رہی تھی' گویا علم مناظرہ کی اصطلاح میں نوجوانوں کی حیثیت منکر کی تھی' اور مدعی ہونے کا مقام ان کی قوم کو حاصل تھا' مسلم بات ہے کہ بارِ ثبوت ہمیشہ مدعی کے سر ہوتا ہے منکر کے لئے انکار کافی ہے۔ اسی لئے نوجوانوں نے کہا' قرآن نے نقل کیا ہے کہ وہ بولے:

"هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ۔

"اس ہماری قوم نے (خالق عالم) کے سوا دوسروں کو اپنا معبود ٹھہرا لیا ہے' کیوں نہیں لاتی (اپنے اس دعویٰ پر کوئی ایسی کھلی ہوئی دلیل جو عقل پر چھا جائے"۔ (الکہف)

"دلیل" جو عقل پر چھا جائے" یہی سلطان کے لفظ کا گویا ترجمہ ہے' سلطان کے ساتھ

انہوں نے بیـــن“ کے لفظ کا اضافہ کیا”کھلی ہوئی“ ہے بظاہر ان کا مطلب یہ تھا کہ جھوٹے سچے قصے، پرانی روایتیں اوہامی وساوس کی پشت پناہی میں مشرکانہ اعمال وافعال کو جاری رکھنا، یہ دوسری بات ہے کوئی ان کو”دلیل“ یا ”سلطان“ ٹھہرا لے تو یہ اس کی ذاتی اصطلاح ہوگی لیکن ایسی کھلی دلیل جو اپنے وزن سے عقل کو اتنا مغلوب کر دے اور دبا دے کہ دعویٰ کا انکار اس کے لئے نا ممکن ہو جائے۔ مشرکین کا طبقہ اپنے اعمال وافعال کی جو توجیہ میں پیش نہیں کر سکتا، کیونکہ اس قسم کی دلیل جو صحیح معنیٰ میں ”سلطان بین“ ہو۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا ایسے مقدمات سے وہ دلیل مرتب ہوئی ہو جن کی بنیاد مشاہدات ومحسوسات پر قائم ہو۔ ظاہر ہے کہ ”ربوبیت“ یا پروردگاری میں خالق عالم کے سوا کوئی دوسری قوت بھی شریک ہے، اس کی تائید میں مشاہدات و محسوسات سے کیا مدد مل سکتی ہے؟ دوسری صورت یہ ہے کہ خالق عالم نے وحی کے ذریعہ سے جو باتیں منکشف فرمائی ہیں جن کا اصطلاحی نام ”منصوصات“ ان پر دلیل مبنی ہو تو مشرک قومیں وحی والہام کی معلومات سے بھی یقیناً فائدہ حاصل نہیں کر سکتیں، کیونکہ جو ذخیرہ وحی والہام کی معلومات کا دنیا میں موجود ہے اس میں کوئی تائیدی شہادت مشرکانہ کاروبار کے لئے میسر نہیں آ سکتی۔ آگے ان ہی نوجوانوں کی تقریر کا یہ فقرہ قرآن نے جو نقل کیا ہے یعنی:

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا۝

”اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے“

بہ ظاہر اس فقرے سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مشرک اگر اس کا دعویٰ کرے کہ اللہ ہی نے اس کو مشرکانہ کاروبار کا حکم دیا ہے، یہ خدا پر افترا ہوگا، اور خدا پر جھوٹ باندھنے والوں سے زیادہ بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے، خلاصہ یہ کہ خالق عالم کی پروردگاری کو ناکافی ٹھہراتے ہوئے دوسری قوتوں کو الٰہ بنانے کی ضرورت کا دعویٰ جو مشرکین کرتے ہیں۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں نہ کوئی عقلی دلیل ہی وہ پیش کر سکتے ہیں اور نہ وحی والہام کی معلومات سے اس سلسلہ میں ان کو کوئی مدد مل سکتی ہے۔

بہر حال اپنے رب پر ایمان لانے کا اجر پہلے تو ان کو یہ ملا کہ ہدایت کی باطنی روشنی ان کی بڑھا دی گئی، تا ایں کہ اس مقام تک پہنچ گئے جس پر پہنچنے والا ڈانوڈول، چنچل عقل یا دماغ یا دل کی

بے چینیوں سے شفایاب ہو کر تندرست بن جاتا ہے پھر سکون وطمانیت کی اسی کیفیت نے ان میں جرات وہمت پیدا کی کہ وہ کھڑے ہو گئے' کس اقدام کے لئے کھڑے ہو گئے؟ نوجوانوں میں اوران کی قوم میں کش مکش کی جو وجہ تھی اس کو مذکورہ بالا الفاظ میں ظاہر کرنے کے بعد قرآن نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا:

وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْ هُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّءْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا٥ (الکھف)

''اور جب تم لوگ (اے نوجوانو) کنارہ کش ہو گئے ان سے (یعنی اپنی قوم سے) اور ان چیزوں سے جنہیں اللہ (خالق عالم) کے سوا وہ پوجتے ہیں تو آؤ پناہ لو کہف (کھوہ) میں کھول دے گا تمہارے لئے تمہارا پروردگار اپنی رحمت کو اور مہیا کرے گا تمہارے معاملہ میں سہولتیں۔''

جس سے معلوم ہوا کہ اپنی پوری قوم جن میں ان کے اعزہ ورشتہ دار بھی ہوں گے' وہ بھی ہوں گے جن سے معاشی ضرورتوں کے حل میں ان کو امداد ملتی ہو گی' دوست ہوں گے' احباب ہوں گے مگر ایمان کی بدولت اسی کا اجر ومعاوضہ ان کو اس بلند ہمتی کی شکل میں ملا کہ اپنی تمام ضرورتوں اور دلچسپیوں کے ساز وسامان کو ٹھکرا کر اٹھ کھڑے ہوئے ان کو بھی چھوڑا اور جن مفروضہ معبودوں کے ساتھ ان کی قوم بلاوجہ الجھی ہوئی تھی' ان سے بھی قطعی بے تعلق ہو کر اب ان میں اس کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی کہ آبادی کو چھوڑ کر پہاڑ کے کھوہ میں بھی اپنے پالنے والے رب کی پروردگاری کا تماشا دیکھیں۔ ان کی اسی صلاحیت کو دیکھ کر ایک نے دوسرے کے سامنے (الکہف) کھوہ کی تجویز پیش کی اور کتنی قوت' کتنی طاقت کے ساتھ پیش کی' بغیر کسی جھجک اور تذبذب کے باہم ایک دوسرے کو یقین دلا رہے تھے کہ آبادیوں میں پالنے والے رب کی پروردگاری اوراس کی مہربانیوں کا تجربہ ضرور ضرور وہاں بھی ہم کو کرایا جائے گا جہاں عالم اسباب کے چکروں پھڑ پھڑانے والی عقل ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ گویا وہ کہہ رہے تھے جہاں کچھ نظر نہیں آرہا ہے وہیں سب کچھ تمہیں میسر آئے گا۔

قصہ کی اجمالی تعبیر میں تو ان کی دعا کا تذکرہ کیا گیا تھا لیکن یہاں ان کے ایمان کے بعد اس

یقین واعتماد کی قرآن خبر دے رہا ہے' جس سے اپنے رب پر ایمان لانے کے بعد وہ سرفراز ہوئے تھے' سچ پوچھئے تو یہ بھی ایمان ہی کے اجر حسن اور اچھے معاوضہ کا ایک قالب تھا جو دوسرے معاوضوں کے ساتھ ساتھ قدرت کی طرف سے ان کو عطا ہوا تھا' ایمان سے محروم' بد بخت' بے ایمان' شک کے روگی' غریب کو اس یقین' اس اذعان واطمینان کی ہوا بھی چھو سکتی ہے؟ اور جیسے قصہ کی اجمالی تعبیر میں ان کی دعا دو اجزاء پر مشتمل تھی' ایک کا تعلق جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا تھا بہ ظاہر معاشی سہولتوں سے معلوم ہوتا ہے اور دوسرے جز میں استدعا کی گئی تھی کہ رشد یا فکری و ذہنی سوجھ بوجھ کی حفاظت کی جائے۔ اسی طرح قصہ کی تفصیلی تعبیر میں بھی بجائے ایک کے دو چیزوں کی فراہمی کا یقین باہم ایک دوسرے کو دلا رہے ہیں' کوئی وجہ نہیں کہ یہاں بھی ان دونوں اجزاء سے وہی دو باتیں مراد نہ ہو جن کی آرزو اپنی دعا میں انہوں نے کی تھی۔

بہر حال اس وقت تک تو اصحاب کہف کے ایمان کا اجر وصلہ ان کے اندر پیدا ہو ہو کر ان کی تقویت وحفاظت کا ذریعہ بنتا رہا اور اسی کی پشت پناہی میں ایک ایسی جگہ کو چھوڑ کر جو ان کا وطن مالوف تھا اور جیسا کہ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ المدینہ یا ایسا شہر تھا جس کے بازاروں میں ''ازکی طعاما'' (صاف ستھرا کھانا) خریداروں کو مل جاتا تھا اور بیان کرنے والوں کا یہ بیان اگر صحیح ہے کہ یہ ایشاء کوچک کی قدیم حکومت ایونیا کا مشہور پایہ تخت افسیس [1] تھا۔ تو اس

---

[1] عام طور پر اصحاب کہف کے وطن کا نام اسلامی وغیر اسلامی کتابوں میں افسیس یا افیسوس بتایا گیا ہے۔ بلیکی صاحب نے اپنی کتاب (اے مینول آف بائبل ہسٹری) میں لکھا ہے کہ یہ شہر ایونیا کا دار الخلافہ تھا اور ارتمس دیوی کے مندر نیز اپنے فلسفے اور بد کرداری کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ ان ہی کا بیان ہے کہ اس شہر کی آبادی کچھ تو گریک کے یورپین باشندوں پر اور کچھ مشرقی قوموں کے افراد پر مشتمل تھی' اسی لئے یہاں کی بت پرستی میں مغربی ومشرقی دونوں علاقہ کے مشرکانہ رسوم کا اثر تھا۔ ارتمس دیوی یورپ کی مشرک قوموں کی دیوی تھی' اس کا مندر شہر افسیس میں تھا۔ کہتے ہیں کہ دو سو بیس سال میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی تھی۔ ۱۲۷ سنگی ستونوں پر اس مندر کی چھت قائم تھی' ایک ایک ستون اس مندر کا مختلف بادشاہوں کی طرف سے بطور نذرانہ کے مندر پر چڑھایا گیا تھا' ہر ستون ساٹھ فٹ اونچا تھا' خود ارتمس دیوی کی مورتی تو لکڑی کی بنی ہوئی تھی اور عقیدہ تھا کہ آسمان سے نازل ہوئی ہے' لیکن بازاروں میں اسی دیوی کا نقرئی مجسمہ بکثرت فروخت ہوتا تھا' تیرتھ میں آنے والے خرید خرید کر اپنے اپنے ملک میں جسے بطور تحفہ لے کر جاتے تھے۔ فلسفہ کا زور بھی (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

کے یہ معنی ہوئے کہ وہاں سب کچھ مل رہا تھا جس کا آدمی اپنی موجودہ زمینی زندگی میں محتاج ہے لیکن سب کچھ چھوڑ کر جہاں کچھ نہ تھا وہیں جانے کے لئے اس یقین کے ساتھ آمادہ ہو گئے کہ سب کچھ وہیں مل جائے گا' وہ بھی جس کے بغیر جسدی نظام قائم نہیں رہ سکتا' اور وہ بھی جس کے بغیر آدمی کی روحانی زندگی موت بن جاتی ہے' ان کے ایمان نے اس یقین کو تو ان کے اندر پیدا کیا تھا اور ان سے باہر دیکھئے قرآن دکھا رہا ہے۔

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ إِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ۔ (الکهف)

''اور دیکھتا ہے تو آفتاب کو جب طلوع ہوتا ہے تو کترا کر (گزرتا) ہے ان کے کہف سے داہنی طرف اور جب غروب ہوتا ہے تو کاٹتا ہے بائیں طرف اور وہ لوگ (مقیم ہیں) اسی کہف کے فجوہ میں۔

دیکھ رہے ہیں آپ ایمان کے اجر حسن کو! جس کو ہستانی ٹاپو میں سر چھپانے کا سوال بھی بڑا اہم سوال تھا وہیں پہنچنے کے بعد قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہترین صحت بخش سائنٹفک آرام گاہ ان نوجوانوں کو مل گئی۔

سرسری طور پر اگرچہ قرآن کے مذکورہ بالا بیان کا خلاصہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ایک غار میں وہ چلے گئے تھے جس میں دھوپ کی گزر نہ تھی۔

غار اور کہف میں فرق:

افسوس ہے کہ میری طوالت بیان سے لوگ گھبرا اٹھے ہیں' ورنہ قرآنی الفاظ پر جی چاہتا تھا کہ سیر حاصل بحث کرتا۔ تاہم اتنا تو بہر حال لوگوں کو سوچنا چاہئے تھا کہ کہف بھی عربی ہی زبان کا

(گزشتہ سے پیوستہ) اس شہر میں اس حد تک ترقی کر کے پہنچ گیا تھا کہ ان تک گریک کا فلسفہ ایونیا کی طرف سے منسوب ہو کر یونانی فلسفہ کے نام سے موسوم ہے' سحر اور جادو میں بھی اس شہر کے باشندے مشہور تھے اسی کے ساتھ عیاشی اور خرنفسی میں بھی یہ اپنی آپ ہی نظیر تھے۔ اب کھنڈر کی صورت میں دریائے کیسپڑ کے دہانے پر دور تک پھیلا پڑا ہے۔ ترک مسلمانوں کا ایک گاؤں جوایا ملک ان ہی کھنڈروں کے درمیان اس وقت تک آباد ہے۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ان کے زمانہ میں افیسوس کو لوگ طرطوس کہتے ہیں۔

لفظ ہے اور غار بھی' قرآن نے بجائے غار کے کہف کا لفظ یہاں کیوں استعمال کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ کہف کا تعلق بھی اس میں شک نہیں کہ عموماً پہاڑوں ہی سے ہوتا ہے جیسے غار کا' لیکن اپنی حقیقت کے لحاظ سے یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ حرا یا ثور کے تاریخی غار بلاشبہ غار تھے' جن میں بہ مشکل چند آدمیوں کے لئے گنجائش پیدا ہوتی ہے اسی لئے ثور کے غار کو قرآن نے بھی غار ہی کے نام سے موسوم کیا ہے لیکن ان ہی پہاڑوں کی شکم میں خاص قسم کا خلا قدرتی عوامل کے تحت پیدا ہو جاتا ہے جس کی وسعت کبھی میلوں کی ہوتی ہے' جنوبی ہند میں ''بیجا نگر'' کی راجدھانی جن پہاڑوں کے درمیان تھی ان میں بیان [1] کیا گیا کہ ایسے قدرتی طویل تہ خانے پائے جاتے تھے جن میں ہزارہا ہزار آدمی غائب ہو جاتے تھے اور مہینوں ان ہی میں رہتے' کھاتے پیتے تھے۔ اس قسم کے کہوف دنیا کے دوسرے پہاڑوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

عربی زبان میں کہف دراصل ان ہی زیرزمین طویل و عریض تہہ خانوں کو کہتے ہیں۔ قرآن نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اسی کہف میں فجوہ تھا جسے ان نوجوانوں نے اپنا مسکن بنایا تھا' فجوہ کے لغوی معنی کو پیش نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ باضابطہ وسیع حال یا دالان ہی ان کو اپنے قیام کے لئے اس جبلی تہہ خانہ میں مل گیا تھا' اس قسم کے زیرزمین تہہ خانوں میں سب سے بڑی مصیبت تاریکی' رطوبت' ٹھنڈک اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی کثافت اور جراثیم کی ہوتی ہے۔ یہ ان کے ایمان ہی کے اجر حسن کا نتیجہ تھا کہ ان سارے مضرت بخش خطرات کے ازالہ کی ضمانت جس چیز میں پوشیدہ ہے یعنی آفتاب کا آتشیں کرہ' اس کے متعلق قرآن کا بیان ہے کہ ایک خاص قسم کا تعلق قدرتی طور پر اس کو اس کہف سے پیدا ہو گیا تھا' طلوع و غروب کے وقت آفتاب اور اس کی شعاعوں کی دو مختلف نسبتیں جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے روزانہ قائم ہوتی تھیں۔ طلوع کے

[1] بیجاپور کی تاریخ میں زبیری نے لکھا ہے ''دراصل شہر بیجانگر و حوالی آن کوہ ہاہتند مشتمل بر رخنہا و غارہای عمیق کہ سہ فرسخ (۹ میل) چار فرسخ (۱۲ میل) اندرون رخنہا راہ تواں رفت'' یہ بھی ہے کہ کہیں کہیں اندرونی حصے ان کے بہت وسیع اور روشن ہیں اور کہیں بہت تنگ' بیجانگر کا جب سقوط ہوا تو شہر کی آبادی کی بڑی تعداد ان ہی کوہستانی تہ خانوں میں پناہ گزیں ہو گئی تھی مسلمانوں کو مہینوں کے بعد اس کی خبر ہوئی (صہ ۱۰۷) امیر شکیب ارسلان نے بھی اپنے وطن لبنان کے ایک کہف کا تذکرہ کیا ہے جس میں ایک فوج چھپ گئی تھی۔

وقت بیان کیا گیا ہے کہ خود کہف کے ساتھ تـــــزاور کی نسبت پیدا ہوتی تھی یعنی اس کہف سے آفتاب کترا جاتا تھا لیکن چونکہ عن کے ساتھ تزاور کی اس نسبت کو قرآن نے ظاہر کیا ہے اس سے عربی محاورے کی رو سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تعلق پیدا ہونے کے بعد آفتاب اور اس کی دھوپ اس کہف سے گزر جاتی تھی۔ میرا خیال یہی ہے کہ جس وقت آفتاب طلوع ہوتا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہف کے دہانے پر اس کی شعاعیں پڑ کر گزر جاتی تھیں' حاصل یہی ہے کہ دیر تک دھوپ ان کے کہف میں نہیں ٹھہرتی تھی بلکہ رات کی تاریکی کی وجہ سے رطوبت و برودت اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کو صاف کر کے گزر جاتی تھی۔ چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ طلوع کے وقت کہف کے لئے اور کہف والوں کے لئے آفتاب کی بالائے بنفشی شعاعوں سے استفادہ کا موقع فراہم کیا گیا تھا برعکس اس کے جس وقت آفتاب غروب ہونے لگتا تھا تو قرآن نے کہف کے ساتھ نہیں بلکہ اصحاب کے متعلق یہ اطلاع دی ہے کہ آفتاب ان کو کاٹ جاتا تھا۔ یہاں عن کا صلہ نہیں ہے' جس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ کہف والے غروب کے وقت کی دھوپ سے کلیۃً محفوظ رہتے تھے' جس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ غروب سے پہلے دن بھر دنیا دھوپ سے گرماتی رہتی ہے اسی لئے شام کی دھوپ نہ مرغوب ہی ہوتی ہے نہ مفید۔ تاہم ایک نکتہ یہاں بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ غروب کے وقت سے بے تعلقی کو قرآن نے کہف کی طرف نہیں بلکہ براہ راست اصحاب کہف کی طرف منسوب کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود کہف میں غروب کے وقت کچھ نہ کچھ دھوپ پہنچتی تھی لیکن فجوہ (یا کمرے) میں اصحاب کہف مقیم تھے وہاں تک اس کی رسائی نہ تھی اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کہف دورخا تھا' ایک رخ اس کا بظاہر سمت جنوب مائل بمشرق تھا اور دوسرا سمت شمال مائل بہ مغرب رخ تھا۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو شمال وجنوب کے ساتھ غروب وطلوع کے وقت آفتاب کے ساتھ نسبت اور تعلق کو بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی' بلکہ اسی بنیاد پر میں تو یہی خیال کرتا ہوں کہ ہوا کی آمد و رفت کا راستہ کہف میں کھلا ہوا تھا۔ گویا یوں روزانہ آفتابی شعاعوں اور ہوائی لہروں سے کہف کی صفائی کا کام قدرت لے رہی تھی۔

خدا ہی جانتا ہے کہ ان غریب نوجوانوں کے گھر شہر کے کس حصہ میں تھے' اور صحت وراحت

کے لحاظ سے اس محلہ کی کیا حالت تھی' لیکن دیکھئے قرآن دکھا رہا ہے کہ ان کے ایمان نے اسی بیابان میں جہاں سر چھپانے کا نظم بھی دشوار تھا' گویا ایک ہائی جینک صحت بخش (قیام گاہ) کا مفت بغیر کسی کرایہ کے انتظام کر دیا' آگے اسی کے بعد فرمایا گیا ہے:

"ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا (الکھف)

"یہ ہے اللہ کی نشانیوں سے جس کو دکھائے راہ اللہ وہی راہ پانے والا ہے' اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو ہرگز نہ پائے گا اس کا کوئی پشت پناہ راہ بتانے والا۔"

جس کا مطلب میری سمجھ میں تو (واللہ اعلم بالصواب) یہی آتا ہے کہ "ایت اللہ" (اللہ کی نشانیوں) کو پا کر جو اللہ کو پاتا ہے' اور خدا کے ان ہی پتوں کو پڑھ کر خدا پر ایمان لاتا ہے' اس کے نزدیک سب کچھ "اللہ" ہی ہوتا ہے' جہاں اللہ ہے وہی یقین رکھتا ہے کہ اللہ اپنی آیتوں کو بھی ظاہر کرے گا' جیسے کہف والوں نے اللہ پر ایمان لا کر دیکھا کہ جہاں سر چھپانے کے سامان کی بھی توقع نہ تھی وہیں ان کے لئے اللہ نے ان کے رہنے سہنے کا معقول نظم کر دیا۔ مگر یقین کی یہ کیفیت ایمان کے معاوضہ میں ارزانی ہوتی ہے' مومن کو خدا اس کے ایمان کا یہ اجر دیتا ہے کہ ہدایت کی راہ اس پر کھول دیتا ہے' لیکن اللہ سے بے گانہ اور بے تعلق ہو کر جو صرف آیاتِ اللہ کی زنجیروں میں الجھے ہوئے ہیں وہ اپنی بے ایمانی کی یہ سزا بھگتتے رہتے ہیں کہ آیات اللہ سے ان کا ذہن اللہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ وہ آیات اللہ یا اسباب کے جنگلوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں' ایسوں کو تو اولاً پشت پناہ ہی نہیں ملتا اور پشت پناہی کسی کی مل بھی جائے تو صحیح راہ کی طرف راہ نمائی کرنے والے مرشد سے تو وہ ہمیشہ محروم ہی رہتے ہیں۔ دیکھ لیجئے کہ ایمان کی راہ سے ہٹ کر جو زندگی گزار رہے ہیں' حالانکہ بڑے بڑے مفکرین' ارباب نظر و فلسفہ کی کتابیں وہ پڑھتے ہیں' لیکن بجائے پانے کے صحیح راہ سے دور ہی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور جب تک اللہ سے توڑ کر "آیات اللہ" کا مطالعہ کیا جائے گا یہ لعنت آدمی پر مسلط رہے گی۔

ایمانی معاوضوں کے کرشمے:

یہاں تک تو ایمان کے اجرحسن کے ایسے مظاہرے اور اللہ کی ایسی آیتیں اور نشانیاں تھیں جن سے بے ایمانی کے مجرموں کو اللہ کے پانے کی توفیق تو نہیں میسر آتی لیکن بذات خود ان نشانیوں اور آیات کو دیکھنے کا مخاطب ان کو بنایا جاسکتا ہے' کیونکہ یہ ایسی باتیں ہیں جن کی توجیہ بخت واتفاق سے بھی کرنے والے چاہیں تو اپنی بدبختی سے کر سکتے ہیں کہ ان نوجوانوں کو اس قسم کی سہولتیں اتفاقاً مل گئیں لیکن ان کے بعد ایمانی معاوضوں کے جن کرشموں کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے' ان کی حالت تو یہ ہے کہ مومن ہوئے بغیر شاید ان کے سننے کو بھی کوئی مشکل ہی سے آمادہ ہوسکتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ کہف والے کہف میں جس وقت داخل ہوئے تو جیسا قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے اپنے ساتھ ورق (چاندی) کی کوئی مقدار بھی لائے تھے غالباً یہ چاندی سکے کی شکل میں تھی اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کو کہفی زندگی میں ساتھ رکھنے کا امکان تھا' ان کے رکھنے اور کہف میں ساتھ لے جانے سے خواہ مخواہ احتراز اور پرہیز کا طریقہ انہوں نے اختیار نہیں کیا تھا' اور بالکل ممکن ہے کہ بچھانے اور اوڑھنے کا تھوڑا بہت سامان بھی ان کے ساتھ رہا ہو' اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں قرآنی اشارات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رشد اور فکری ونظری قوت کو زندہ رکھنے کے لئے اگر ان کے پاس کچھ مخطوطات اور کتابی نوشتے بھی ہوں تو الرقیم کی جو تفسیر ابن عباسؓ سے منقول ہے اس سے اس کی تائید ہی ہوتی ہے۔

عام طور پر اس قصہ کو لوگ جس شکل میں بیان کرتے ہیں اس کی بنیاد پر تو خواہ کچھ ہی کہا جائے لیکن جہاں تک قرآنی آیات کا تعلق ہے ان کی روشنی میں یہ دعویٰ آسانی کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا کہ کہف میں داخل ہونے کے ساتھ ہی وہ سو گئے' بلکہ میرا خیال ہے کہ اپنے ساتھ جو کچھ وہ لائے تھے جس میں کھانے پینے کی خشک اور تر چیزوں کو سب سے پہلے ہونا چاہئے تو جب تک انہیں اس سے مدد رہی اس طویل گہری نیند کی ان کو ضرورت ہی نہ تھی جس کا ذکر بعد کو خود قرآن نے کیا ہے۔

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ کہف میں داخل ہونے کے ساتھ ہی کوئی ضروری نہیں کہ ان کو سویا ہوا تسلیم کر لیا جائے' بلکہ ظاہر حالات کا تقاضا یہی ہے کہ جب تک ساتھ لائی ہوئی چیزوں سے مدد ملتی رہی اس وقت تک ان کے ساتھ کوئی غیر معمولی صورت پیش نہیں آئی اور اس کے پیش آنے کی ضرورت بھی نہ تھی! ہاں جب لایا ہوا ذخیرہ ختم ہو گیا تو اس ٹاپو میں یہ اہم سوال تھا کہ خورد و نوش کی چیزیں کہاں سے مہیا ہوں گی؟ ایک صورت تو اس کی یہ تھی جیسا کہ بیدار ہونے کے بعد انہوں نے عمل بھی کیا کہ چھپ چھپا کر شہر ہی سے کھانے پینے کا سامان منگوالیں' لیکن جن حالات میں دشمنوں کے پنجوں سے بچ کر نکل جانے میں وہ کامیاب ہوئے تھے شاید ان حالات میں شہر کی طرف رخ کرنا ان کے لئے مناسب نہ تھا پس ان ہی نازک ترین گھڑیوں میں اب ان کا ایمان ان کے آگے اجر اور معاوضہ کی ایک ایسی صورت کو پیش کرتا ہے جس کے سننے کی تاب بھی ایمان سے محروم عقل نہیں لاسکتی' قرآن کی آیت:

"وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ۔"

''اور تم خیال کرو گے کہ وہ بیدار ہیں' حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔''

میں اطلاع دی گئی ہے کہ ان پر نیند طاری ہوئی' عجیب وغریب نیند' ایک طرف تو اس کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ جاگ رہے ہیں' اور دوسری طرف اسی نیند کا ایک پہلو یہ بھی قرآن ہی نے اسی کے بعد بیان کیا ہے:

وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ۔

''اور ہم ان کو الٹتے پلٹتے رہے' دائیں اور بائیں پہلو پر۔''

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ایسی گہری نیند ان پر طاری ہوئی تھی کہ نیند میں بھی تھوڑا بہت احساس یا اختیار کروٹ بدلنے کا آدمی میں جو باقی رہتا ہے اس اور اختیار سے بھی وہ قطعی طور پر خالی ہو چکے تھے اور کروٹ بدلنے کا انتظام براہ راست قدرت کی طرف سے کیا گیا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس گہری نیند کی مدت کتنی تھی۔ قرآن میں قصہ کو ختم کرتے ہوئے خبر دی گئی ہے کہ تین سو نو سال تک اس کہف میں ان کا قیام رہا' لیکن ظاہر ہے کہ یہ ان کے قیام کی مدت ہے نہ کہ نیند کی۔ بہر حال اتنی بات تو ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ان پر گہری نیند طاری ہوئی اور

اسی نیند کی بدولت جب تک وہ سوتے رہے کھانے پینے کی ضرورت سے بے نیاز رہے۔ البتہ ایک ایسی جگہ جہاں وہ سوئے تھے نیند کی حالت میں طرح طرح کے خطرات کا اندیشہ ہوسکتا تھا۔ موذی حشرات الارض یا درندے یا چور وغیرہ جیسی چیزوں کا اندیشہ غالباً ان ہی خطرات سے حفاظت کے لئے یہ کہا گیا کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں' اسی کے ساتھ جیسا کہ قرآن ہی میں ہے:

وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ۔

''کتا ان کا دونوں ہاتھوں کو پھیلائے در پر (کہف کے) پڑا ہوا تھا۔

اور یہ بھی کتے کے جاگنے کی ہیئت ہے' دیکھنے والوں کو گویا معلوم ہوتا تھا کہ کتا بھی بیٹھا ہوا ہے۔ ان سب کے سوا ان کے ایمان کا اجر حسن ایک یہ بھی تھا کہ جس کی قرآن نے تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ:

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا۔

''اگر تو ان کی طرف جھانکے تو پیٹھ پھیر کر بھاگے اور بھر جائے تو رعب سے ان کو دیکھ کر اسی ''ایمانی اجر'' کی رومی تعبیر ہے۔

ہیبت حق است ایں از خلق نیست ہیبت آں مرد صاحب دلق نیست
ہر کہ ترسد از حق و تقویٰ گزید! ترسد از وے جن انس و ہر کہ دید [1]

---

[1] کوئی سنا سنایا یا افسانہ نہیں ہے چشم دید مشاہدات میں دیکھا گیا ہے' اللہ کے ان محبوب بندوں کو جن کا قلب اپنے رب کے ساتھ ربط و وابستگی میں استغراق کی کیفیت میں ڈوبا ہوا ہے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور دنیا کے حالات سے وہ قطعاً بے خبر اور چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ خوابیدہ اور رقود ہیں لیکن ان سے گفتگو جب کی گئی تو دین ہی نہیں دنیا کے معاملہ میں بھی ان سے کوئی مشورہ اگر لیا گیا تو اس وقت ہمیشہ ایسی باتیں ان سے سنی گئی ہیں جن پر ان لوگوں کو حیرت ہوئی ہے' جو چوبیس گھنٹے دنیا اور دنیا کے قصوں میں الجھے رہتے ہیں' میں نے تو جب ان لوگوں کو دیکھا اور ان سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا تو عموماً **تحسبھم ایقاظا و ھم رقود** (تم خیال کرتے ہو کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں) کا مصداق ان کو پایا' ان کی کتابوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے باخبر گویا جاگ رہے ہیں' لیکن واقعہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا اور دنیا کے رگڑوں جھگڑوں کے لحاظ سے وہ رقود اور سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور ان بزرگوں کے آستانوں پر اگرچہ کتوں (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

واقعہ یہ ہے کہ بے ایمانوں کی عقل ایمانی معاوضوں کے ان تذکروں کو برداشت کرے یا نہ کرے مگر اس وقت تک کہف والوں کے ایمانی اجر کے جن قوالب ومظاہر کو قرآن نے بیان کیا ہے کسی نہ کسی رنگ میں آج بھی چاہا جائے تو ایمانیوں کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا مشاہدہ اور تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ روز بروز اب ان کی تعداد گھٹ رہی ہے تاہم اب بھی دنیا ان قدسی نفوس سے قطعی طور پر خالی نہیں ہوئی ہے۔ ڈھونڈنے والے چاہیں تو اب بھی دنیا کے دور ودراز گوشوں میں ان کو پا سکتے ہیں۔

البتہ اس کے بعد قرآن نے **وکذلک بعثنٰھم** (اور جس طرح اٹھایا ہم نے ان کو) کے تمہیدی الفاظ کے ساتھ کہف کے ایمانی اجر کے جس رخ کو بے نقاب کیا ہے اور اس تمہید کے بعد جو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ عامی آدمی کے لئے تو شاید اس کا سمجھنا بھی دشوار ہو۔

مطلب یہ ہے کہ کہف میں کہف والوں کے قیام کی مدت جو تین صدیوں سے بھی متجاوز ہے۔ اولاً عام حالات کے لحاظ سے بجائے خود یہی ایک غیر معمولی حادثہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام طور پر شخصی حالات یا زندگی کی اتنی طوالت کہ صدیوں سے متجاوز ہو جائے چنداں حیرت انگیز بات نہیں ہے' آخر ملائکہ بلکہ شیاطین جیسی زندہ ہستیوں کے متعلق بغیر کسی شک اور تذبذب

(گزشتہ سے پیوستہ) کو تو میں نے نہیں پایا لیکن بسا اوقات یہ دیکھا ہے کہ کوئی پکا دنیا دار جسے چاہیں تو مشہور حدیث کی رو سے "کلب من کلاب الدنیا" (دنیا کے کتوں میں کوئی کتا) آپ قرار دے سکتے ہیں وہی کسی نہ کسی وجہ سے ان بزرگوں کے ساتھ عقیدت واخلاص کا ایسا تعلق پیدا کر لیتا ہے کہ بسا اوقات اسی دنیا دار معتقد کی عقیدت مندی ان بزرگوں کے مخالفوں کے مقابلہ میں مدافعت کا کام کرتی رہتی ہے' خود تو ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا' لیکن یہ دیکھ کر فلاں امیر یا حکمران یا حاکم ان کا معتقد ہے' مخالفوں کو لب کشائی کی بھی ہمت نہیں ہوتی اور اس کا تجربہ تو جس وقت جی چاہے آپ کر سکتے ہیں کہ دنیاوی جاہ وحشمت واقتدار واختیار رکھنے والے جب کسی مربوط القلب ایمانی شخصیت کے سامنے آتے ہیں تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان کے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ بات کرنا چاہتے ہیں لیکن نہیں کر سکتے' دل ان کا رعب سے معمور ہو جاتا ہے' ان کے سامنے بیٹھنا چاہتے ہیں لیکن نہیں بیٹھ سکتے' کھڑے کھڑے کانپ رہے ہیں۔ میں مبالغہ اور شاعری سے کام نہیں لے رہا۔ **بحمداللہ** ان گرامی برگزیدہ ہستیوں کی خدمت میں حاضری کی سعادت میسر آئی اور سچ پوچھئے تو ان ہی بزرگوں کو دیکھ کر سورۃ کہف کی ان آیتوں کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ مومن کی حفاظت اس کے ایمانی اجر سے کیسے ہوتی ہے اس کے تجربہ کا موقع ان کی مجلسوں میں ملتا رہا ہے۔

کے کیا یہ نہیں مانا جاتا کہ پیدا ہونے کے بعد تاریخ کے نامعلوم عہد سے اس وقت تک اپنی شخصی حیات کے ساتھ وہ زندہ ہیں اور خدا ہی جانتا ہے کہ آئندہ بھی ان کی زندگی کا تسلسل کب تک باقی رہے گا بلکہ ان نادیدہ ہستیوں کے سوا دیکھی بھالی چیزوں میں گدھ وغیرہ جانوروں یا زندگی رکھنے والوں کے متعلق طوالت عمر کا دعویٰ کیا لوگ نہیں کرتے؟ تاہم انسانی قالب میں انفرادی و شخصی زندگی کی اتنی طوالت روزمرہ کے عام مشاہدات کے خلاف ضرور ہے' جبرائیل' میکائیل' اسرافیل علیہم السلام جیسے فرشتوں کے متعلق یہ سن کر کہ جب سے پیدا ہوئے ہیں زندہ ہیں اور آئندہ بھی مدتوں زندہ رہیں گے۔ اگرچہ ہمیں تعجب نہیں ہوتا مگر اسی کے مقابلہ میں نوح یا عیسیٰ علیہما السلام کی طویل زندگی کا مسئلہ اسی لئے موجب حیرت بنا ہوا ہے کہ وہ انسان تھے اور نوح و مسیح علیہما السلام کی طوالت عمر کی تو ایک گونہ عقلی توجیہ بھی ہوسکتی ہے۔ ❶ لیکن کہف کے ان نوجوانوں کے متعلق تو ان کی بھی گنجائش نہیں اور قصہ اسی پر ختم نہیں ہوا بلکہ بیدار ہونے کے بعد اپنے سونے کی مدت ان کو ایک دن' یا دن کے کچھ حصہ سے زیادہ محسوس نہیں ہوئی جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں صحیح طور پر قرآن سے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ ان کے سونے کی مدت کتنی تھی تاہم قرآن

❶ نوح علیہ السلام کا تعلق ظاہر ہے کہ نسل انسانی کے اس قرن سے ہے جب زمین کو آباد کرنے کے لئے یہ نسل اس کرہ پر پھیلائی گئی تھی۔ طبقات الارض کے ماہرین کہتے ہیں کہ اسی زمین پر ایک ایسا وقت بھی گزر چکا ہے جب چھپکلی' گرگٹ وغیرہ جیسے جانوروں کا قد جو اس زمانے میں بالشت ڈیڑھ بالشت سے زیادہ باقی نہیں رہا ہے' ان ہی زحافات کے ڈھانچے برف ستانوں میں نکلے ہیں جن سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ ہاتھیوں سے بھی دو چند' سہ چند قد ان ہی جانوروں کا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نشوونما کی قوت آج زمین میں جو پائی جاتی ہے کسی زمانہ میں یہی قوت کہیں زیادہ تھی' ایسی صورت میں اگر انسانی وجود بھی زمین کی اس قوت سے مستفید ہوا ہو تو اس پر تعجب کیوں کیجئے بلکہ آدم کے قد کے متعلق روایتوں میں جس درازی کا ذکر کیا گیا ہے زمین کے حالات کے عین مناسب ہے' باقی رہا مسیح علیہ السلام کی طوالت زندگی کا مسئلہ' سو اس باب میں اگرچہ یہ خیال سامنے ہو کہ حضرت والا کے جسد وجود میں انسانی حصہ صرف والدہ محترمہ کی طرف سے شریک تھا' ورنہ جیسا کہ معلوم ہے متمثل ہو کر فرشتے نے آپ کی والدہ کے بطن مبارک میں آپ کو ہبہ کیا تھا' حضرت مسیح علیہ السلام کا پیدا ہونے کے ساتھ گفتگو کرنا' مردوں کو زندہ کرنا' بے جان پرندوں کو جاندار بنا کر اڑا دینا' ایسے اعضا جن سے زندگی کے آثار غائب ہوگئے تھے ان میں پھر زندگی کے آثار پیدا کر دینا یعنی اندھوں کو بینا کر دینا' کوڑھی کو چنگا کر دینا' یہ سارے قصے ان کی ملکوتی نسبت ہی کے نتائج تھے اور زندگی کی طوالت بھی اسی کا ثمرہ ہے۔ والقصتہ بطولہا۔

میں اسی تمہیدی بیان کے بعد جو یہ الفاظ ہیں کہ:

لِيَتَسَآءَ لُوْا بَيْنَهُمْ ط قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ط قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ۔

''تا کہ ہم ایک دوسرے سے پوچھیں' ایک کہنے والے نے ان میں سے کہا کہ کتنے دن تک ٹھہرے؟ بولے کہ ٹھہرے ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔''

اگر چہ یہاں بھی پوچھ گچھ کا تعلق ''لبث'' یعنی قیام کی مدت سے ہے' نہ کہ سونے کی مدت سے' لیکن اٹھنے کے بعد چونکہ سوال و جواب کا ذکر قرآن نے کیا ہے' اس قرینہ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اٹھنے یعنی جاگنے سے پیشتر جس حال میں وہ تھے اسی کی مدت کے متعلق پوچھ رہے تھے اور جاگنے سے پہلے ظاہر ہے کہ نیند ہی کی حالت ہو سکتی ہے۔

بہر حال کچھ بھی ہو' عام طور پر یہ جو قصہ مشہور ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے اور قرآن کے فحویٰ کا اقتضا بھی یہی ہے کہ نیند کی جو واقعی مدت تھی' جاگنے کے بعد صحیح احساس اس مدت کا ان میں نہیں پایا جاتا تھا' حاصل جس کا یہی ہوا کہ ایک دن یا دن کے کچھ حصہ سے جس وقت کی وہ تعبیر کر رہے تھے واقع میں وہ وقت اتنا مختصر نہ تھا۔ نیند میں وقت کا صحیح تخمینہ اگر سونے والا نہ کر سکے تو یہ چنداں تعجب کی بات نہیں ہو سکتی۔ شاعروں کا تو خیال ہے کہ ہجر وقت کے احساس کو ختم کر دیتا ہے اور وصال اسی کے مقابلہ میں اسی وقت کو حد سے زیادہ مختصر کر دیتا ہے' یوں بھی نیند کی حالت میں آدمی خواب اور رویا کے اندر ایسے کاروبار میں اپنے آپ کو مشغول پاتا ہے جو مہینہ دو مہینہ بلکہ سال بھر میں انجام کو پہنچے' بسا اوقات دیکھتا ہے کہ اس کی شادی ہوئی' نو مہینے تک بیوی نے حمل کا زمانہ گزارا' بچہ پیدا ہوا' یہ سب کچھ خواب میں دیکھتا ہے' بیدار ہونے کے بعد مگر گھڑی بتاتی ہے کہ دو ڈھائی گھنٹوں سے زیادہ سونے کا موقع اسے نہ مل سکا لیکن ظاہر ہے کہ' خواب کی بات ہے اور کہف والوں کی نیند پر جو وقت بھی گزرا تھا' زیادہ سے زیادہ خواب والی مثال کو نظیر بنا کر قیاس کی گنجائش تو پیدا ہوتی ہے مگر دونوں کی نوعیت ایک ہے' اس کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے؟

خیر زندگی کی غیر معمولی طوالت اور پھر اس طویل مدت کو کہف کے ان نوجوانوں کا حد سے زیادہ مختصر محسوس کرنا یہ دونوں باتیں ان کے ایمان کے اجر و معاوضہ کی ایسی غیر معمولی شکلیں ہیں

جن کی عام حالات میں آدمی توقع نہیں کرسکتا اور جہاں تک میرا خیال ہے یہی بتانا یہاں مقصود بھی ہے کہ ایمان کے اجر وصلہ یا ثمرات ونتائج کا پیمانہ حدود و معلومات و مشاہدات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عقل کو نہ قرار دینا چاہئے بلکہ سمجھنا چاہئے کہ عقل جن باتوں کو سوچ سکتی ہے ایمان ان آسانیوں کو بھی مومن کے سامنے لاتا ہے' اور عام حالات میں جن امور کا تصور بھی عقل کے لئے دشوار ہو' جس رب پر آدمی کو ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوتی ہے' وہی رب جب چاہتا ہے تو ان کو بھی بیدار کر کے مومن کی دستگیری فرما سکتا ہے' آپ دیکھ رہے ہیں کہ کہف کے یہ نوجوان کس حال میں گھر سے نکلے تھے' مگر قدرت کی طرف سے ان کے قیام کے لئے کافی آرام بخش جگہ بھی مہیا کی گئی' ان کی حفاظت کے لئے علاوہ کتے کے ایسے حالات خود ان پر بھی طاری کئے گئے کہ اس ویرانے میں بھی ان کو کوئی چھو نہیں سکتا تھا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ایمانی اجر کی یہ ایسی شکلیں ہیں جن کا تجربہ عام طور پر ہر زمانہ میں کیا گیا ہے اور آج بھی چاہا جائے تو کیا جا سکتا ہے۔ مگر بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی بلکہ عقل جن باتوں کو سوچ نہیں سکتی' اصحاب کہف کا ایمان ان کو بھی کھینچ کر ان کے سامنے لایا۔ ان کی زندگی دراز ہو گئی اور کتنی دراز پھر وقت کی درازی سے آدمی کو جو ذہنی تکلیف ہوتی ہے' اس تکلیف سے بھی ان کو ان کے ایمان ہی نے بچا لیا اور باوجود دراز ہونے کے وہی طویل وقت ان کو محسوس ہوا کہ حد سے زیادہ مختصر تھا اور اسی کے ساتھ اس کا بھی ان کو تجربہ کرایا گیا کہ اتنے طویل زمانہ کو بغیر آب و خور کے انہوں نے گزار دیا۔ خدا ہی جانتا ہے وہ کتنے دنوں تک سوتے رہے مگر جس وقت بیدار ہوئے تو جیسے رات کو سونے والے صبح بیدار ہو کر کچھ کھانے پینے کی ضرورت یا خواہش عام طور پر محسوس کرتے ہیں انہوں نے بھی محسوس کی۔ قرآن میں اسی کے بعد جو یہ الفاظ ہیں:

قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ط فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ۔ (الکہف)

''(وقت کے متعلق باہم) بولے تمہارا رب ہی زیادہ جاننے والا ہے کہ تم کتنی دیر ٹھہرے' پھر (انہوں نے کہا) کہ بھیجو تم اپنے میں سے کسی کو شہر کی طرف اس ورق (چاندی) کے ساتھ چاہئے کہ وہ دیکھے صاف ستھرا کھانے کو اور لائے تمہارے لئے

روزی۔"

ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بھوک کا تقاضا بھی چنداں سخت تھا ورنہ ازکیٰ **طعاما** (صاف ستھرے لذیذ) کھانے کی تلاش کا حکم وہ نہ دیتے اور یہ بھی ان کے ایمان کے کرشموں میں سے ایک حیرت کرشمہ تھا۔

کذلك کے لفظ سے ان کے ایمانی نتائج کو قرآن نے جو الگ کر دیا ہے غالباً ان کی اہمیت ہی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے' یعنی ایمانی اجر ہونے میں یوں تو سب مساوی ہیں لیکن غیر معمولی ہونے کی وجہ سے ان کی نوعیت گزشتہ آثار سے چونکہ مختلف تھی' اس لئے ان کو پہلی فہرست سے قرآن نے جدا کر دیا۔

اسی کے ساتھ ذیلی طور پر ایک سبق تو اس سے یہ ملتا ہے جیسا کہ امام رازیؒ نے بھی لکھا ہے۔

وهذه الاية تدل على ان السعى فى امساك الزّاد امرمهم مشروع وانه لا يبطل التوكل۔

"یہ آیت بتاتی ہے کہ زادراہ کا ساتھ رکھنا یہ شریعت کا ایک اہم مسئلہ ہے اور توکل پر اس سے زد نہیں پڑتی۔"

نیز "**ازكى طعاما**" کی تفسیر اگر یہ کی جائے' امام ہی نے دوسرے اقوال [1] کے ساتھ اس کا تذکرہ بھی بایں الفاظ کیا ہے۔

ايها اطيب والذّ (ص ۶۹۹ جلد ۵)

"یعنی غرض ان کی یہ تھی کہ کھانوں میں جو صاف ستھرا اور لذیذ کھانا ہو' اس کو حاصل کریں"

تو اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ **طيبات من الرزق** یا ایسی غذا جو آدمی کے ذائقہ کے مناسب اور لذت بخش ہو' خواہ اس سے نفرت یا چڑھ پیدا کرنے کی مشق دینی راہ کے سلوک میں قطعاً

---

[1] ازکی کی تفسیر میں یہ کہنا کہ غیر ذبیحہ یا بتوں پر چڑھائی ہوئی چیزوں سے بچنے کا مشورہ دے رہے تھے' یہ مشورہ اصحاب کہف کی جماعت کے کسی رکن کو بظاہر دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ اتنی باتیں تو ہر معمولی مومن آدمی بھی جانتا ہے۔

غیر ضروری ہے۔

اور اسی کے بعد آگے قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا ۝ إِنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا (الکہف)

"اور چاہئے کہ کھانا لانے جو شہر جائے وہ نرمی سے کام لے اپنے متعلق کسی کو پتہ چلنے نہ دے (کیونکہ) اگر وہ تم سے واقف ہو جائیں گے تو سنگسار کر دیں گے تمہیں، یا واپس پلٹا لیں گے اپنے کیش وملت کی طرف جس کے بعد تم کبھی کامیاب نہ ہو گے"

اور یہ وہی بات ہے جس کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں یعنی اپنی قوم اور اپنے وطن کو چھوڑ کر کہفی زندگی بسر کرنے کے لئے نوجوانوں کی یہ ٹولی شہر سے جس حال میں نکلی تھی، قرآن نے ان ہی کی زبانی اس حال کے متعلق ان کے اعترافی الفاظ کو یہاں نقل کیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قوم سے ان کی مخالفانہ کشمکش شدت کی اس آخری حد تک پہنچ چکی تھی کہ اپنی جان سے ہاتھ دھو لیں یا جس دین کے لئے وہ سب کچھ برداشت کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے (العیاذ باللہ) اسی سے دست بردار ہو جائیں اور اس کا خطرہ کہف میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کے دلوں میں باقی رہا باوجود یہ کہ ایمان یقین کے اس درجہ تک قرآنی شہادت کے رو سے ان کی رسائی ہو چکی تھی جس کا نام ربط ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ بجائے مقابلہ کے اس شخص کے متعلق جو کھانا لانے کے لئے شہر بھیجا جا رہا تھا یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ لطف ونرمی کی راہ اختیار کرے اور اس طریقہ سے بازار میں داخل ہو کہ دوسروں کو پتہ نہ چلے کہ وہ ان کی جماعت کا آدمی ہے۔

ممکن ہے کہ کائنات کے حوادث و واقعات اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کو خالق کائنات کی مرضی کی تاثیری کارفرمائیوں کے بغیر سوچنے کے جو عادی ہیں ان کو کہف والوں کی اس "ذہنیت" کے پیچھے بزدلی اور اخلاقی کمزوری کے عناصر پوشیدہ نظر آتے ہوں اور ان کے نزدیک اخلاقی قوت کے مظاہرے ہی کی یہی واحد شکل ہو کہ بڑی سے بڑی قوت کے ساتھ انتہائی خطرناک حالات میں بھی نتیجہ سے قطعاً بے پرواہ ہو کر آدمی ٹکرا جائے مگر میں نے پہلے بھی نقل کیا ہے اور قرآن نے اصحاب کہف کی زبانی اس موقع پر ان کی طرف جس طرز عمل کو منسوب

کیا ہے اس سے بھی یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ خواہ یہ طریقہ کار لا حاصل' بے جا تہور ہو یا نہ ہو مگر فلاح و بہبود کے توقعات و امکانات کے دائرے کو تنگ ضرور کر دیتا ہے۔ آخر خود سوچئے کہ ایسی صورت میں ٹکرانے والے اگر (عیاذاً باللہ) ارتداد کے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے تو فلاح و کامیابی کا دروازہ کیا ہمیشہ کے لئے اپنے اوپر بند نہ کر لیتے اور بجائے ارتداد کے اگر رجم (سنگسار) ہونے کی سزا قبول کر کے اپنے آپ کو ختم کرا دیتے تو گو ذاتی طور پر شہادت ہی کا درجہ ان کو کیوں نہ حاصل ہو جاتا مگر دوسروں کے لئے فلاح و بہبود کے جو امکانات ان کے وجود سے تھے یقیناً اس کی راہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی۔

ان کے بیان کے الفاظ:

وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا۔

''اور نہ کامیاب ہو گے تم لوگ اس صورت میں پھر کبھی''

سے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ فلاح سے محرومی کے اس خطرے کا تعلق صرف ''ارتداد'' ہی سے نہیں بلکہ رجم اور سنگسار ہونے کے اندیشہ سے بھی بظاہر معلوم ہوتا ہے اور لازم وہی متعدی فلاح سے شہید ہو کر اپنے وجود کے منافع سے لوگوں کو ضرور محروم کر دیتے ہیں۔

ایک انقلابی تحریک اور کہف والوں کا برآمد ہونا:

بہر حال خالص عقل کے مشورے پر چلنے والے ہوں یا درحقیقت عقل کی پیغمبری کو قبول کرتے وقت ایمان و اسلام کا مجازی خول عقل پر چڑھا کر زندگی کے پروگرام بنانے کے عادی ہوں' اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں کو اختیار ہے جس طرح چاہیں سوچیں اور جوڑے چاہے قائم کریں' جس چیز کا چاہیں اخلاقی کمزوری یا جبن و بزدلی وغیرہ نام رکھ دیں لیکن دیکھئے خاص ایمان کے تحت جو جی رہے تھے ان کو تجربہ کرایا جا رہا ہے کہ ان ہی کا ایک حال تو یہ تھا کہ ان کی قوم ان کے خون کی پیاسی اور ان کے دین کی دشمن بنی ہوئی تھی کہ اچانک ایک نیا انقلاب شروع ہوتا ہے وہی شہر جس کے باشندوں کے خوف سے کہف میں ان نوجوانوں نے پناہ لی تھی' اسی شہر کے رہنے والوں میں ایک نیا جذبہ ابھرتا ہے' آگے کی آیتوں میں اسی نئی نقلابی تحریک کا قرآن نے ذکر کیا

ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ دشمنوں کی اسی آبادی اور اسی شہر میں دیکھا جا رہا تھا کہ انتہائی مظلومیت اور بے کسی کے حال میں ان کے شہر سے نوجوانوں کی یہ ٹولی جو نکلی تھی ان ہی کے وہ نادیدہ عاشق زار بنے ہوئے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ اپنے شہر کے باشندوں کے ظالمانہ طرزِ عمل پر وہ ندامت کا اظہار کر کے بچتے رہے تھے بلکہ مافات کی تلافی کے لئے چاہتے ہیں کہ جن پر ظلم کیا گیا تھا اور صحیح دین کے قبول کرنے کے جرم میں بن باس ہونے پر جنہیں مجبور کیا گیا تھا ان کی کوئی دوامی یادگار قائم کریں۔ بعض لوگوں کی رائے اپنے مذاق کے مطابق یہ تھی کہ ان کی یاد میں کوئی عمارت بطور میموریل کے بنائی جائے اور دوسرا طبقہ "عمارت برائے عمارت" کی اس لا حاصل تجویز کی مخالفت کر کے چاہتا تھا کہ جس خدا کے لئے ان نوجوانوں کو مصائب میں مبتلا ہونا پڑا تھا اسی خدا کی عبادت کے لئے ان کی یاد میں مسجد بنائی جائے' خلاصہ یہ ہے کہ جو علاقہ اور شہر کہف کے ان نوجوانوں کے دشمنوں اور مخالفوں سے بھرا ہوا تھا' وہی علاقہ اور شہر اب صرف ان کے عقیدت مندوں' بلکہ نادیدہ عشاق سے اچانک معمور ہو گیا اور طرفہ تماشا یہ ہوا کہ ٹھیک جن دنوں میں یہ انقلابی ہلچل اس شہر کے اندر برپا تھی اچانک یہ عجیب وغریب حادثہ پیش آیا کہ جن سے ملاقات کا لوگوں کو شان وگمان بھی نہ تھا کہف کے ان ہی نوجوانوں کے متعلق شہر والوں کو یہ خبر ملی کہ وہ تو اس وقت تک اسی کہف میں جیتی جاگتی حالت میں پائے جا رہے ہیں' یہ صورت کیسے پیش آئی؟ قصوں میں تو عموماً یہ بیان کیا گیا ہے اور مشہور ہے کہ بازار میں جب کھانا لینے کے لئے کہف سے آدمی آیا اور جو سکہ اس نے نان بائی کے حوالہ کیا' وہ دقیانوس نامی بادشاہ کے ٹھپہ کا سکہ تھا' جو تین سو سال پیشتر اس شہر میں حکمرانی کرتا تھا۔ نان بائی نے اس نئے سکہ کو دیکھ کر پوچھ گچھ کی' لوگوں میں اس کا چرچا پھیلا۔ آخر اس آدمی کو اقرار کرنا پڑا کہ ہمارا تعلق نوجوانوں کی اس جماعت سے ہے جو دشمنوں کی خوف سے کہف میں روپوش ہو گئے ہیں' اسی ذریعہ سے لوگ کہف میں ڈھونڈ ھتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں فجوہ میں یہ لوگ بیٹھے ہوئے کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ ارباب حکایات وقصص اسی روایت کو کافی رنگ آمیزیوں کے ساتھ کتابوں میں نقل کرتے ہیں لیکن قرآن میں ہم ان تفصیلات کو نہیں پاتے اور سچ پوچھئے تو اس قسم کی دور از کار تفصیلات سے قرآن کا عام دستور ہے کہ عموماً تعرض بھی نہیں کرتا' وہ تو صرف ایمانی اجر کی مختلف

شکلوں کو اس موقع پر پیش کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ کہف والوں کے ایمانی اجر و معاوضہ کی یہ شکل بھی اپنی علیحدہ مستقل نوعیت رکھتی تھی۔ اسی لئے "کـذلك" کے لفظ سے شروع کرتے ہوئے یعنی یہ بتاتے ہوئے کہ جیسے گزشتہ قالبوں میں ایمان اجر کہف والوں کے سامنے آیا' اسی طرح ایک نیا مظاہرہ ان کے ایمانی اجر کا اس شکل میں بھی ہوا کہ:

اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْآ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَ اَنَّ السَّاعَةَ لَارَيْبَ فِيْهَآ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ط رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ط قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا۔ (الکھف)

''اچانک ان پر (کہف والوں پر) مطلع کر دیا ہم نے تا کہ وہ جان جائیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کی گھڑی آنے والی ہے قطعاً اس میں کوئی شک نہیں ہے (اور کہف والوں پر مطلع ہونے کا قصہ اس وقت پیش آیا) جب دیکھو! (شہر والے) باہم جھگڑ رہے تھے ان ہی کہف والوں کے متعلق پس (بعض) بولے کہ بناؤ ان پر کوئی عمارت' ان کا رب خوب جانتا تھا ان کو' کہا ان لوگوں نے جو ان کے معاملہ پر قابو یافتہ تھے کہ ہم بنا کر رہیں گے ان پر مسجد۔''

بہر حال اصحاب کہف پر اعثار یعنی اچانک ان پر واقف ہونے کی صورت جو پیش آئی اس کی تفصیلی وجہ قرآن نے نہیں بیان کی ہے بلکہ بجائے عداوت و دشمنی کے اسی شہر کے باشندوں میں کہف والوں کے ساتھ غیر معمولی دل چسپی بلکہ نادیدہ عشق کا انقلابی سانحہ جو پیش آیا اور اسی جذبہ عشق سے سرشار ہو کر لوگ ان کی یادگار کی تعمیر کے متعلق مختلف تجویزیں جو پیش کر رہے تھے' قرآن نے صرف یہ خبر دی ہے کہ عین اسی زمانے میں ان سے واقف ہونے کا حادثہ اچانک رونما ہوا۔ اس سلسلہ میں اسی حد تک قرآن نے اپنے بیان کو محدود رکھا ہے کیونکہ وہ تو صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ ایمان مومن کا ساتھ کہاں تک دیتا ہے' کن کن حالات میں دیتا ہے اور یہ ایمانی اجر کے ظہور کی شکلیں صرف ان ہی منطقی حدود تک محدود نہیں ہوتیں جہاں تک سوچنے والوں کی عقل عام معلومات و مشاہدات کی رہنمائی میں پہنچتی یا پہنچ سکتی ہے' الغرض یہ جو دعویٰ قرآن میں کیا گیا ہے' یا اہل ایمان کے لئے صلائے عام دیا گیا ہے کہ:

وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا۔

''اور بشارت دے دو ایمان والوں کو جو اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں کہ یقیناً ان کے لئے اچھا اجر و معاوضہ ہے جس میں وہ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

اسی دعویٰ یا اسی صلائے عام کے عملی تجربات کی یہ مثالی شکلیں ہیں جو مختلف رنگوں میں کہف کے ان مومن نوجوانوں کے سامنے مسلسل پیش آتی چلی گئی ہیں' اتنی دراز مدت جو کہف میں ان پر گزری' چاہئے تو یہ تھا کہ دنیا ان کو بھول جاتی ہے' حافظوں سے لوگوں کے نکل جاتے۔

یادگاروں کے قائم کرنے کا مغربی طریقہ:

مگر آپ دیکھ رہے ہیں' بجائے بھلانے کے قدرت ان کی یاد کے نقوش کو چمکاتی ہی چلی گئی۔ نہ صرف دلوں اور دماغوں میں بلکہ جس شہر کے باشندوں کے مظالم سے تنگ آ کر بیابان اور ٹاپو کی زندگی انہوں نے اختیار کی تھی' اسی شہر کے رہنے والے ان کے لئے یادگار قائم کرنے کی کوششوں میں مست ہیں' ایک طبقہ ''عمارت برائے عمارت'' والے اصول پر مصر ہے' یہی مذاق عام طور پر آج کل یورپ و امریکہ کے باشندوں پر غالب ہے۔ لاکھوں نہیں بلکہ بلا مبالغہ میموریل کی بعض عمارتوں میں کروڑ ہا کروڑ روپے لگا دیئے جاتے ہیں لیکن اس عمارت میں اسی شہر کے اس غریب کو سر چھپانے کا بھی موقع نہیں مل سکتا جو موسم سرما کی سرد و تاریک راتوں کو کسی فٹ پاتھ پر ٹھٹھر ٹھٹھر کر بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اور اسی کے مقابلے میں دوسرا طبقہ ''عمارت برائے عبادت'' والی تجویز پیش کر رہا تھا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی ثانی الذکر طبقہ کہف والوں کے امر پر غالب تھا' شاید اس کا یہ مطلب ہو کہ کہف والوں کے دین کو صحیح معنوں میں قبول کر کے ان کے معاملہ پر غالب آ گیا تھا اور اول الذکر ''عمارت برائے عمارت'' نظریہ والے محض قوم کے ہیرو ہونے کی حیثیت سے ان کی یادگار میں ایک میموریل تعمیر کروانا چاہتے تھے۔ اس تجویز کے ذکر کے ساتھ بطور جملہ معترضہ کے قرآن میں جو:

رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ۔

''ان کا رب ان کا زیادہ جاننے والا ہے''

کا فقرہ پایا جاتا ہے' اس سے ''عمارت برائے عمارت'' کے نظریہ کی اس بنیاد پر شاید ضرب لگانی مقصود ہے جو اس کے جواز میں عموماً پیش کرنے والا پیش کر دیا کرتے ہیں کہ میموریل کی اس قسم کی عمارتوں کو صرف برائے عمارت قرار دینا صحیح نہیں ہے بلکہ اس دنیا سے جو چلے گئے ان کی یاد کو آئندہ نسلوں کے اندر تر تازہ رکھنے کے لئے عمارت بنائی جاتی ہے' اسی بنیاد کے کھوکھلے پن کو قرآن ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ بظاہر مطلب یہ ہے کہ اس دنیا سے جو چلے گئے ہیں ان کی یاد یا تو علم الٰہی میں ہمیشہ ہی قائم و دائم' تر و تازہ رہتی ہے اور اس طور پر تر و تازہ رہتی ہے کہ خواہ کتنی ہی مدت اور زمانہ گزر جائے اس کی تازگی میں کسی قسم کا کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں جو عمارتیں خود فانی ہونے والی ہیں ان کے ذریعہ سے فانی ہونے والے حافظوں میں ان کی یاد تازہ رہنے کی غیر ضروری تدبیر بجز اہمال اور بے حاصلی کے اور بھی کچھ ہے؟

اور جیسے یہ ایک معترضہ لیکن حد سے زیادہ پر معنی فقرہ بیان کے اس حصہ میں پایا جاتا ہے اسی طرح شروع میں ''كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ'' کے بعد:

لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا۔

''تاکہ وہ جانیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور (قیامت) کی گھڑی میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے''۔

ان سے بھی ذیلی طور پر قرآن دو باتوں کی طرف غالباً متوجہ کرنا چاہتا ہے' پہلی بات تو یہی ہے کہ مسلسل کہف والوں کے سامنے جو باتیں پیش ہوتی رہیں ان سے ایک غرض تو یہی تھی کہ ایمان کے متعلق جس اجر حسن کا اور یہ کہ مومن ایمان کے اس اجر سے ہمیشہ بغیر کسی وقفہ کے مستفید و متمتع ہوتا رہے گا اس کا وعدہ جو کیا گیا ہے' یعنی:

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا۔

''اور بشارت دے دو ایمان والوں کو جو کرتے ہیں اچھے کام کہ یقیناً ان کے لئے اچھا اجر اور معاوضہ ہے' رہیں گے اس میں وہ ہمیشہ ہمیش۔''

کا جو خلاصہ ہے' ان کو یہ دکھایا گیا کہ خدا کا وعدہ کتنا سچا ہے' ایمان کیسی کیسی نازک گھڑیوں میں مومن کی پشت پناہی کرتا چلا گیا ہے''

اور دوسری بات وہی جو دوسرے فقرے:

وَ اَنَّ السَّاعَۃَ لَارَیْبَ فِیْھَا۔

''اور (قیامت) کی گھڑی میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے''

سے سمجھ میں آتی ہے۔ لکھنے والوں نے تو خدا جانے اس کا کیا کیا مطلب لکھ دیا ہے' مگر میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ حق تعالیٰ کے اس وعدے کو جو ایمان کے متعلق اس نے فرمایا ہے پورا ہوتا ہوا جو دیکھ رہے تھے ان ہی کو یہ بتانا مقصود ہے کہ الساعۃ یعنی قیامت جو ایمان اور بے ایمانی ہی کے فائنل رزلٹ (آخری انجام) کا دوسرا نام ہے اس میں شک کرنے کی گنجائش ہی اب کیا باقی رہتی ہے۔

نیز بعض لوگ جو خواہ مخواہ عقلی تخمینہ میں مبتلا ہو کر ایسی چیزوں کو جن کی نہ نفی ہی عقلی دسترس کے حدود میں داخل ہے اور نہ اثبات۔ ان ہی کے متعلق طرح طرح کی عقلی موشگافیوں سے کام لیتے ہیں مثلاً دعویٰ کرتے پھرتے ہیں کہ ہم جنت و دوزخ' قیامت' عذاب قبر وغیرہ چیزوں کو عقلی دلائل اور سائنٹفک طریقوں سے صحیح ثابت کرنے کے لئے تیار ہیں اور عقل اس قسم کی بدعقلیوں پر تمسخر کرتی ہے' بھلا اگر عقل ہی ان باتوں کے دریافت کرنے کے لئے کافی ہوتی تو نبوآت و رسالات کا عظیم الشان نظام قدرت کیوں قائم کرتی؟

خیر' بات طویل ہو جائے گی' لکھنا یہ ہے کہ اس قسم کے ''غیبی حقائق'' کے ثبوت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سب سے بڑے صادق اصدق الصادقین' خالق تعالیٰ جل مجدہ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ مرنے کے بعد مرنے والوں کو پھر ہم دوبارہ جینے کے عمل جیسے پہلی دفعہ ان ہی لوگوں کے اندر جو زندہ نہ تھے' زندگی بھری گئی تھی اور یہ دوبارہ جینے والے کے سامنے اس کے اعمال کے نتائج آئیں گے' یقیناً یہی سب سے بڑی' سب سے استوار' اور محکم دلیل ان غیبی امور کے یقینی ہونے کی ہوسکتی ہے کہ یہ خدا کا وعدہ ہے۔

''زماں'' محض ایک اضافی تماشا ہے:

میرا خیال ہے کہ یہاں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایمان کے متعلق خدائی وعدے کو پورا ہوتے ہوئے جو دیکھ چکے ہیں' وہی قیامت یا الساعۃ کے متعلق کیسے شک میں مبتلا رہ سکتے ہیں' نیز اسی کے ساتھ ایک باریک پہلو غالباً اس تنبیہ کا اپنے خاص موقع اور محل کے لحاظ سے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قیامت کب آئے گی؟ اس سوال کے متعلق دلوں میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ لاکھوں لاکھ برسوں سے لوگ مرتے چلے جارہے ہیں' آخر قیامت کا انتظار وہ کب تک کرتے رہیں گے؟ چونکہ وقت کے احساس کی جو اصل حقیقت ہے' اس کا ذکر اصحاب کہف کے قصہ میں قرآن نے اس موقع پر کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دیر اور سویر عجلت اور جلدی وغیرہ کے احساسات کا تعلق زمانے کے ساتھ کسی واقعہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ قدرت کے اختیار میں ہے۔ جس قسم کا احساس چاہے ہر قسم کے وقت کے متعلق دلوں میں وہ پیدا کرسکتی ہے خود قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ جینے والے جب زندہ ہوکر اٹھیں گے تو گزرا ہوا زمانہ ان کو بھی وہی ایک دن یا ایک دن کے کچھ حصہ سے زیادہ معلوم نہ ہوگا۔ اور جب زمانہ کے احساس کی یہی نوعیت ہے تو پہلی صدی عیسوی میں آج سے دو ہزار سال پہلے جو مرا اور دو ہزار سال بعد ۱۹۵۰ء میں جو مرا یا آئندہ مرے گا' دونوں کے لئے دو ہزار سال کے وقفہ کی یہ مدت احساس کے لحاظ سے ظاہر ہے کہ ایک ہی جیسی ہوگی اور سچ تو یہ ہے کہ فلسفہ قدیم ہو یا جدید تھوڑا بہت مطالعہ جن لوگوں نے اس کا کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ زماں (TIME) جسے سب جانتے ہیں' مگر جب بھی غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ زمانے کو نہ کوئی جانتا ہے اور نہ اس کے جاننے کا کوئی ذریعہ کسی کے پاس ہے' آخر جو چیز نہ آنکھ ہی سے دکھائی دیتی ہو' نہ کانوں سے سنی جاتی ہو' نہ ناک ہی سے سونگھی جاتی ہو' نہ زبان ہی سے چکھی جاتی ہو اور نہ وہ ایسی چیز ہو جس کا پتہ چھونے سے چلتا ہو' خود سوچئے کہ ماننے والے اس کو کس بنیاد پر مان رہے ہیں' یہ سال و ماہ' روز اور گھنٹہ' منٹ' سیکنڈ' جمعہ' جمعرات وغیرہ کو آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ سن رہے ہیں؟ سونگھ رہے ہیں؟ چکھ رہے ہیں؟ مگر پھر بھی آپ ان کو مانتے ہیں اور آپ کے سارے کاروبار کی بنیاد ان پر قائم ہے پس ایسی مشتبہ حقیقت جس کے احساس کے

متعلق اس قسم کے اضافی تماشے جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے کسی حیثیت سے موجب حیرت ہو سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ الساعۃ یا قیامت کے متعلق زمانی وسوسہ کی راہ سے کچھ شک وشبہ کی لہر ذہنوں میں جو اٹھتی ہے یا اٹھ سکتی ہے' اصحاب کہف کے ساتھ جو ماجرا پیش آیا' کوئی چاہے تو ان کے زمانی احساس کی راہنمائی میں اپنے وسوسہ کا ازالہ کر سکتا ہے۔

تعداد اصحاب کہف:

اور صرف یہی نہیں کہ جس شہر سے وہ نکلے تھے اسی کی حد تک یا اسی شہر کے باشندوں کی حد تک اصحاب کہف کے ساتھ دلچسپیوں کے یہ قصے محدود رہے بلکہ قرآن میں اس کے بعد جو یہ خبر دی گئی ہے:

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا ۢ بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ۔

''اور قریب ہے کہ وہ کہیں گے کہ (کہف والے) تین ہیں' چوتھا ان کا کتا ہے اور کہیں گے کہ وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے' اٹکل پچو طریقے سے اور کہیں گے کہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے بعد بھی جب اچانک لوگ ان سے واقف ہوئے کہف کے ان نوجوانوں کو آئندہ نسلوں میں بھی کافی اہمیت کا مقام حاصل رہا اور کیسی اہمیت؟ کہ خود نہیں بلکہ ان کے ساتھ جو کتا تھا تاریخ انسانی کا ایک ایسا کتا بن گیا کہ کہف والوں کی تعداد اس کتے کے بغیر اور کتے کے ساتھ مختلف مکتب خیال کی بنیاد بن گئی۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں سال بعد عرب میں بھی عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات کے سلسلہ میں ایک بڑا اہم ''خلافی مسئلہ'' کتے کے ساتھ اور کتے کے بغیر اصحاب کہف کی تعداد کا مسئلہ تھا۔ عیسائیوں میں جو فرقہ اس زمانہ میں ''یعقوبیوں'' کے نام سے موسوم تھا' اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے قول کا قائل اور معتقد تھا' کہتا تھا کہ تین تو اصحاب کہف تھے چوتھا ان کا کتا تھا اور ''نسطوریوں'' کے نام سے جو فرقہ ملقب تھا وہ

پانچ تو تعداد کہف والوں کی بتاتا تھا اور کتے کو چھٹا قرار دیتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تیسرا قول کن لوگوں کا تھا؟ ہمارے مفسرین نے لکھا ہے کہ تیسری بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ امام رازیؒ نے یہ لکھ کر گزشتہ دو قولوں کو قرآن نے جب "رجماً بالغیب" یعنی اٹکل پچو قرار دیا ہے تو معلوم ہوا کہ تیسرا قول مقابلۃً واقعہ سے زیادہ قریب ہے۔ پھر واو کے ساتھ تیسرے قول میں کتے کو جو قرآن نے الگ کر کے بیان کیا ہے اس سے امام رازیؒ نے بوجوہ مختلفہ تیسرے قول کی صحت کو ثابت کرنا چاہا ہے۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دو مکاتب خیال میں غلو سے کام لیتے ہوئے لوگوں نے اصحاب کہف کے ساتھ کتے کو بھی اتنی اہمیت دی تھی کہ گویا اس کا وجود اصحاب کہف کے برابر ہو گیا تھا' سمجھا یہ جاتا تھا کہ ان ہی میں فانی ہو گیا تھا' اسی لئے اصحاب کہف اور کتے کے ذکر میں واو عاطفہ کے فاصلہ کا اضافہ بھی پسند نہیں کرتے تھے اور ہمارے مفسرین کا یہ خیال اگر صحیح ہے کہ تیسرا ہی قول واقعہ کی صحیح ترجمانی کرتا ہے تو واو کے اضافہ سے شاید کتے کی عنیت یا فسائیت کی غلطی کا ازالہ غالباً قرآن کرنا چاہتا ہے۔ ❶ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل

❶ عموماً غلو سے مذہب میں جب کام لیا گیا ہے تو اسی قسم کے بے سروپا شاعرانہ خیالات عقائد میں داخل ہو گئے یہی خیال کہ نیک بنتے ہوئے ترقی کر کے آدمی ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ آدمی نہیں بلکہ خدا بن جاتا ہے' فنافی الاصل کا نظریہ جسے کہتے ہیں یا یہ کہ آدمی آدمی نہیں فرشتہ بن جاتا ہے جیسا کہ عیسائیوں کا عام عقیدہ ہے (اسی لئے قرآنی جنت کی تعبیر عیسائیوں کے حلقوں میں حیوانی جنت سے کرتے ہیں) مگر ظاہر ہے کہ یہ صرف شاعرانہ اعتراض ہے' قرآن ہمیشہ حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے اس نے خدا بن جانے یا فرشتہ بن جانے کا کا نظریہ نہیں پیش کیا ہے بلکہ آدمی ہر حال میں آدمی رہتا ہے' اسی طرح یہاں بھی شاید یہی بتانا مقصود ہے کہ اصحاب کہف کا کتا خواہ کچھ ہی ہو گیا ہو مگر تھا وہ کتا ہی' آدمی نہیں بن گیا تھا اور جیسے کتا آدمی نہیں بن جاتا اسی طرح یہ خیال کہ آدمی مرنے کے بعد باپ کی وجہ سے کتا بن جاتا ہے جیسا کہ تناسخ والے کہتے ہیں سب بے معنی مہملات ہیں' سگ اصحاب کہف کے متعلق مسلمانوں میں غیر قوموں کے زیر اثر اس قسم کے خیالات پھیل گئے تھے۔ سعدیؒ کا مصرعہ سگ اصحاب کہف کے متعلق مشہور ہے کہ "پے نیکاں گرفت مردم شد"

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ بلعم باعور کے جسد میں سگ اصحاب کہف کی روح جنت میں چلی جائے گی اور بلعم باعور کی روح اس کتے کے قالب میں واصل جہنم ہو گی۔ ہیں تو یہ غلو کی باتیں لیکن سوچئے تو کہف والوں کے ایمان نے ان ہی کو نہیں' ان کے کتے کو بھی تاریخ کا کتنا اہم مسئلہ بنا دیا۔

ہو رہا تھا اصحاب کہف کی تعداد کتے کے ساتھ اور کتے کے بغیر دنیا کا یا کم از کم عرب و اطراف عرب کے ممالک کا اہم مسئلہ بنا ہوا تھا۔ قرآن پاک جیسا کہ اس کا قاعدہ ہے اس قسم کے بے نتیجہ مسائل سے مسلمانوں کو ہمیشہ الگ رہنے کی تاکید کرتا ہے یہاں بھی یہ فرما کر کہ:

قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ج فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا۔

''کہہ دو کہ میرا رب ان کی تعداد سے زیادہ واقف ہے نہیں جانتے ان کو مگر کم لوگ' پس تم نہ جھگڑو ان کے بارے میں مگر سرسری طور پر اور نہ پوچھو ان کے متعلق کسی سے۔''

اپنے اسی اصول کو جس کی تعبیر حدیثوں میں ''ترك مالا'' یعنی سے کی گئی ہے' اسی کا اعادہ کرتے ہوئے قصہ کی جو روح ہے اور عملی زندگی میں مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کو استعمال کرتے رہیں' اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتا ہے۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًاo اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔

''اور ہرگز نہ کہا کرو کہ یہ کام کرنے والے ہیں ہم کل مگر یہ کہ چاہے اللہ''

اہل ایمان کو ملحدانہ طریق سے بچ کر ایمانی راہ اختیار کرنی چاہئے:

جس کا بظاہر مطلب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ خدا کے بغیر عالم حوادث و واقعات کو سوچنے اور اسی کی مدد سے زندگی کا پروگرام بنانے کے جو عادی ہیں' ایمان والوں کو شدید تاکید کی گئی ہے کہ اس الحادی بے ایمانہ ذہنیت سے کنارہ کش رہیں۔ اشارہ کیا گیا ہے کہ کہف والوں ہی کی سرگزشت کو دیکھو کن حالات سے ان کی ابتدا ہوئی' ان کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے' ان کا دین شدید خطرے میں گھر گیا تھا' عقل کی راہ سے سوچتے تو خدا جانے کن کن ٹھوکروں سے سابقہ پڑتا لیکن انہوں نے ایمان کی راہ اختیار کی اور جس رب پر ایمان لائے تھے اسی کی غیبی دستگیریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے قدم اٹھایا پھر ان کو تجربہ کرا دیا گیا کہ ایمان کی راہ اختیار کرنے والے کو کبھی دھوکا نہیں ہوتا' ناموافق سے ناموافق بدترین حالات' ایمانی قوت اس سے

پیدا ہونے والے نتائج بہترین حالات سے بدل دیتے ہیں۔ جو دردرائے جاتے ہیں' دھتکارے جاتے ہیں ان ہی کو سر پر چڑھایا جاتا ہے' ان کی نعت گائی جاتی ہے' ان کی یادگار قائم کی جاتی ہے' ان کے ساتھ دلچسپیاں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ ان کی تعداد کے متعلق مختلف سکول قائم ہو جاتے ہیں' ان کے صدقے میں ایک معمولی کتا بھی انسانی تاریخ کا اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ بھلا خدا سے ٹوٹی ہوئی عقل اس وقت جب کہف والے اپنی قوم سے الگ ہو کر نکل رہے تھے' یہ سوچ سکتی تھی کہ آئندہ مظلوموں اور لاوارث بے نواؤں کی یہی ٹولی اتنی اہمیت حاصل کرنے والی ہے کہ صدیوں بعد قرآن میں ان کے متعلق وحی نازل ہوگی اور یوں قیامت تک کے لئے جریدہ عالم پر ان کا نام ثبت ہو جائے گا۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ گو مسلمانوں میں اصحاب کہف کے متعلق اس قسم کے مکاتب خیال جیسے عیسائیوں کے یعقوبی اور نسطوری فرقوں میں قائم ہو گئے لیکن سلفاً عن خلف اصحاب کہف اور ان کے کتے کے نام سے مسلمانوں کے ''ارباب عزم ورقی'' نے ہمیشہ نفع اٹھایا ہے۔ سیوطی نے اپنی کتاب ''الرحمة فی الطب والحکمة'' میں لکھا ہے کہ خبیث روحوں اور جناتی بکھیڑوں کے ازالہ میں ان ناموں کو بالخاصیت حد سے زیادہ موثر اور نفع بخش پایا گیا ہے۔ ❶ اسی چودھویں صدی کے قطب ارشاد' محدث جلیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ان ہی اغراض کے لئے جن کا سیوطی نے ذکر کیا ہے ان ناموں کو استعمال فرماتے تھے اور لکھ کر یا لکھوا کر حاجت مندوں کو دیا کرتے تھے۔

حاصل یہ ہے کہ آج کے حالات کو دیکھ کر کل کے متعلق سوچنے کے جو دو مستقل طریقے ایک طریقہ لوگوں کا ہے جو حسی اور عقلی معلومات کے سوا حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی مشیت اور ارادہ کا خطرہ بھی اپنے دل میں نہیں پاتے بلکہ علل و اسباب کے حسی و عقلی سلسلے کے ساتھ خدائی کارفرمائیوں پر جو نظر رکھتا ہے اسلئے اسی کا مضحکہ اڑاتے ہیں علانیہ کہتے ہیں:

''خدا کو کیا پڑی میرے تمہارے درمیان کیوں ہو''

آج نسل انسانی کی اکثریت پر عقیدہ ولدیت کے آثار نے اسی ملعون طرز خیال کو مسلط کر

❶ ''تذکرۃ الرشید'' سوانح حضرت گنگوہی میں بھی اور سیوطی نے تملیخا' کمسلمینا' مرطونس' بیونس' ساربنوس' اکفشد طنونس' دونواس تو اصحاب کہف کا اور قطمیر کتے کا نام بتایا جاتا ہے بعض کتابوں میں قطمور کتے کا نام ہے۔

دیا ہے اور دوسرا طریقہ فکر وعمل وہ ہے جس کا سبق ہمیں اصحاب کہف کی قرآنی سرگزشت سے ملتا ہے۔ قرآن نے اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکم دیا ہے کہ

''ہرگز ہرگز نہ کہا کرو کہ ہم یہ کام کل انجام دیں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔''

ہر اقدام میں مومن کی نظر مشیت حق پر ہونی چاہئے:

جس کا ماحصل یہ ہوا کہ مومن کو چاہئے کہ اپنے ہر آئندہ اقدام میں عام علل واسباب کے ساتھ اپنی نظر حق سبحانہ وتعالیٰ کی مشیت قاہرہ اور ارادہ باہرہ پر رکھے، یہی ایمانی طریقہ فکر وعمل ہے اور اسی کے متعلق بشارت دی گئی ہے کہ اس کے ایمان کا اجر کبھی ضائع نہ ہوگا اور مومن ان کے نتائج سے بغیر کسی انقطاع کے برابر مستفید ہوتا رہے گا۔ پھر اسی کے بعد یہ حکم دیتے ہوئے کہ۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ۔

''اور یاد کر اپنے رب کو جب بھول جائے تو۔''

جس کا مطلب یہی ہوا کہ خدا پر ایمان لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک دفعہ مان کر دماغ کے کسی گوشے میں اس کی یاد دفن کر دی جائے بلکہ چاہئے کہ زندہ خدا کے ساتھ مومن بندگی کے تعلق کو مسلسل زندہ رکھے اور جب کبھی غفلت ہو جائے تو پھر اس کی یاد تازہ کر کے اپنے اندر اس شعور کو بیدار کرتا رہے اور اسی کی آرزو کی جائے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّىْ لِاَ قْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا۔

''اور کہہ کہ میرا رب قریب ہے کہ اس سے زیادہ نزدیک راہ کی طرف ہماری راہنمائی فرمائے گا۔''

بظاہر اس کا مطلب وہی ہے کہ جب ''ایمانی زندگی'' آدمی اختیار کرتا ہے جیسا کہ کہف والوں نے اختیار کیا تھا تو ان کی ہدایت اور رہنمائی میں مزید اضافہ کر دیا گیا اور بتدریج ترقی کرتے ہوئے۔

رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ۔

''باندھ دیا ہم نے ان کے قلوب پر''

کے مقام سکینت تک پہنچ گئے تھے' اسی طرح یہاں بھی ''مومن'' کو توجہ دلائی گئی ہے کہ ایمان کے اس باطنی اجر کی اپنے رب سے توقع رکھے۔ جس طرح کہف والوں کے ایمان ''ربط قلب'' کے مقام رفیع و منزل خنک تک چڑھا کر ان کو پہنچا دیا تھا' امید رکھے کہ اس کو بھی اپنے ایمان کا یہ اجر بارگاہ ربانی سے ارزانی ہوگا۔

اصحاب کہف کی مدت قیام قرآنی روشنی میں:

سچ پوچھئے تو قصہ اور قصہ سے قرآن مسلمانوں کو جو کچھ سمجھانا چاہتا تھا' وہ اپنی آخری حد پر پہنچ چکا ہے لیکن سارے قصہ میں ایک جز یعنی انسانی زندگی کی غیر معمولی درازی اور طوالت ان لوگوں کی عقول کے لئے جو عزیز مقتدر کی کارفرمائیوں سے بیگانہ رہ کر جینے کے عادی ہیں ان کے لئے یہ خبر یقیناً باعث گرانی و تشویش بن سکتی تھی۔ اس مسئلہ کو بھی قرآن آخر میں سمجھا دینا چاہتا ہے۔ پہلے کہف کے قیام کی جو واقعی مدت تھی اس کو ان انداز میں قرآن نے بیان کیا ہے۔

وَلَبِثُوا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا۔

''اور ٹھہرے اپنے کہف میں تین سو سال اور بڑھا دیا انہوں نے ''نو ماہ'' اور سنین کے بیان کرنے میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے تو تین سو سال ان کے قیام کی مدت بتائی گئی ہے پھر فرمایا کہ نو سال کا اور اضافہ ہوا' اس کی توجیہ میں امام رازی نے نقل کیا ہے کہ:

كانت المـــدة ثلث مائة سنة من سنين الشمسية و تسع سنين من القمرية (ص:۷۰۶ جلد۳)

''تین سو سال تو شمسی حساب سے ہوئے اور تین سو سال قمری حساب سے۔''

خیر یہ تو حساب کی بات ہے ذہنی خرخشے کی بنیاد تو اس مقام پر ہے کہ انفرادی زندگی کی اتنی غیر معمولی درازی کا انسانی قالب میں تجربہ عموماً نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب ''بنیاد'' ہی کی تلاش ہے تو ذرا کریدنے کی اور کوشش کرو اور سوچو کہ حوادث و واقعات جن کا ظہور عالم محسوس ہو رہا ہے' اسباب و علل کے سلسلے میں ان کی کڑیاں کیا صرف ''شہادت'' ہی کی حد تک

محدود ہیں، یعنی حسی معلومات کی راہ سے عام انسانی عقل کی رسائی جن کڑیوں تک ہوسکتی ہے' کیا علل واسباب کا یہ قصہ ان ہی پر ختم ہو جاتا ہے؟ کسی معمولی گھاس یا جنگل کی جڑی بوٹی ہی کو اٹھالو' کون بتا سکتا ہے کہ قدرت کے کن کن عوامل کے زیر اثر اس گھاس یا بوٹی کا وجود منصۂ شہود تک پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے؟ جڑ' پتے' تنے' شاخیں' پھل' پھول' خواص وصفات میں جن نیرنگیوں کا تماشا اس قسم کے نباتات کی مختلف قسموں کے متعلق ہم دیکھتے ہیں کیا ان بوقلمونیوں کی توجیہ صرف جانے ہوئے اسباب وعلل یا عوامل وموثرات سے جن کا عالم شہادت سے تعلق ہے باآسانی ممکن ہے؟ اصحاب کہف کے قیام کی مذکورہ بالا بات کی خبر دیتے ہوئے اسی کے بعد جو فرمایا گیا ہے کہ:

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْاجِ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

''کہو اللہ زیادہ جاننے والا ہے ان کے قیام کی مدت کو' آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ باتیں اسی کے لئے ہیں۔''

ان الفاظ سے قرآن یہی سمجھانا چاہتا ہے کہ اپنے محدود معلومات کو پیمانہ بنا کر خدائی خبروں کی پیمائش کھلی ہوئی منطقی غلطی ہے۔ حق تعالیٰ کے دائرہ علم میں شہادت یعنی عالم محسوس کے قوانین کے ساتھ غیب کے قوانین بھی داخل ہیں۔ پھر جو نہیں جانتا ہے اسے خود سوچنا چاہئے کہ جاننے والوں کی خبروں کی تنقید کا حق آخر کس بنیاد پر رکھتا ہے۔ علم الٰہی کے اسی احاطہ کو واضح کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔

اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ۔

کیا عجیب دیکھتا ہے وہ اور سنتا ہے۔

جس کا مآل یہی ہوا کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ جو کچھ معاملہ کرتے ہیں اس کی مصلحتوں سے ان کے سوا دوسرا کون واقف ہوسکتا ہے؟ یہی کہف والے نوجوان تھے۔ اپنے رب پر ایمان لاکر خدائی امداد کے متدعی ہوئے تھے' حق تعالیٰ ان کے اخلاص اور راست بازی کو بھی دیکھ رہا تھا اور جو دعائیں اپنے مالک سے انہوں نے کی تھیں انہیں بھی وہ سن رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ ان کے ایمان کا اور اپنے رب کے ساتھ حسن ظن کی جس نسبت کو انہوں نے قائم کیا تھا اس

کے آثار ونتائج یا اجر ومعاوضہ کا ان کو تجربہ کرائے پھر مرنے سے پہلے انہوں نے بھی دیکھا اور دوسروں کو بھی دکھایا گیا کہ غیبی دستگیریوں کی کیسی عجیب وغریب شکلیں ان کے سامنے آئیں جن میں بعض چیزیں ایسی بھی تھیں کہ عقل وقوع سے پہلے ان کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ مثلاً یہی تجربہ کہ جس زندگی کی طوالت عام حالات میں اسی نوے سال سے بھی عموماً متجاوز ہوتے ہوئے نہیں دیکھی گئی، وہی زندگی تین صدیوں سے بھی آگے بڑھ گئی۔

اور یہ تو خیر علم وجہل کا قصہ تھا۔ کہ جاننے والوں کی باتوں میں خواہ مخواہ شک اندازی نہ کرے۔ اس پر اصرار نہ کرے کہ اس کا جہل جن باتوں کے دریافت کرنے سے قاصر ہے عالم کا علم بھی اس کے اسی جہل کا ساتھ دے۔ یقیناً ایسا اصرار جاہلانہ اصرار ہوگا۔

اور اس سلسلے میں اپنی فہمائش کو قرآن نے اسی حد تک پہنچا کر چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ آیت ان الفاظ پر جو ختم ہوئی ہے۔

مَالَهُمْ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا۔

''نہیں ہے ان کیلئے اللہ کے سوا کوئی پشت پناہ اور نہیں شریک ہے اس کے حکم میں کوئی۔''

حیات انسانی کی طوالت محال عقلی بھی نہیں:

لوگ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ قرآن کا شاید یہ کوئی اسلوب بیان ہے، حالانکہ سچ پوچھئے تو جس ''راز'' سے پردہ مذکورہ بالا الفاظ سے ہٹایا گیا ہے اور ''خالق ومخلوق'' کے جس تعلق کو بے نقاب کر کے عالم اور اس کے نظام کے سمجھنے کی جو صحیح راہ قرآن نے پیش کی ہے اس کو سمجھ لینے کے بعد زندگی کی اس غیر معمولی طوالت ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ اس نوعیت کے تمام مسائل کے متعلق وساوس واوہام کے سارے سوراخ چھوٹے ہوں یا بڑے ہمیشہ ہمیش کے لئے قطعی طور پر بند ہو جاتے ہیں۔

میرے لئے تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے مختصراً اس قرآنی قصہ کو یاد دلانا چاہتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام سے اس قصہ کا تعلق ہے۔ ان پر سو سال کے لئے بجائے نیند کے موت طاری کی گئی، پھر وہ زندہ کئے گئے ان سے بھی وہی مدت دریافت کی گئی جو مرنے کے

بعد دوبارہ زندہ ہونے تک گزری تھی' جواب میں سوسال کی اس طویل مدت کے متعلق انہوں نے بھی اپنے اسی احساس کو ظاہر کیا کہ دن بھر یا دن کا کچھ حصہ گزرا تب ان کو خبر دی گئی کہ سوسال کا زمانہ گزرا ہے۔اس کے بعد ان کو حکم دیا گیا کہ کھانے پینے کی جو چیزیں ان کے ساتھ تھیں ان کو دیکھیں جن میں کسی قسم کا تغیر پیدا نہیں ہوا تھا۔ بالکل تروتازہ حال میں سب چیزیں تھیں۔مگر اس کے مقابلہ میں سواری میں ان کے جو گدھا تھا مرکر صرف اس کی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں' پورے قصہ کو قرآن کی سورۂ بقرہ میں پڑھئے۔یہاں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آیت الکرسی کے نام سے قرآن کی جو آیت مشہور ہے۔اسی کے بعد اس قصے کے ساتھ چند دوسرے قصوں کا ذکر بھی اس مقام پر یکے بعد دیگرے کیا گیا ہے۔یعنی ابراہیم علیہ السلام اوران کے عہد کے بادشاہ کا مکالمہ' موت اور زندگی کی پیدائش کے قانون کے متعلق اور تیسرا قصہ چار پرندوں کا جس کا تماشا ابراہیم علیہ السلام کو ان کے سوال کے بعد دکھایا گیا۔

جہاں تک میرا خیال ہے کہ آیت الکرسی میں حق تعالیٰ نے اپنے صفات کو بیان کرتے ہوئے پہلی صفت اپنی (زندہ) بیان کی ہے تاکہ خدا کا وجود مردہ مادے کے وجود سے ممتاز ہو جائے اس کے بعد القیوم کی صفت کا اظہار کیا گیا ہے اپنی سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ بادشاہ کے ساتھ مکالمہ والے قصہ کا تعلق تو حق تعالیٰ کی صفت الحی (زندہ) سے ہے۔یہ بتایا گیا ہے کہ جو زندگی اور حیات سے خود محروم ہوگا اس سے زندگی اور حیات کیسے پیدا ہوسکتی ہے اور عزیر علیہ السلام کے قصے میں جو دکھایا گیا کہ سڑ جانے اور گل جانے کی صلاحیت کھانے پینے کی جن چیزوں میں زیادہ اور بہت زیادہ تھی وہ تو سوسال تک تروتازہ قالب میں رہیں' برخلاف اس کے گدھا جو نسبتاً زیادہ دن تک باقی رہنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا تھا وہی سڑ گل کر صرف مشت استخوان بن کر رہ گیا۔اس سے یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ کائنات کی چیزیں صرف اپنی پیدائش اور حدوث ہی میں خالق تعالیٰ کی محتاج نہیں ہیں بلکہ اپنے سارے تغیرات وانقلابات میں بھی ہر لمحہ' ہر لحظہ' ہر حال میں براہ راست خالق تعالیٰ کے ارادے اور مشیت کے ساتھ ان کا معاملہ وابستہ ہے۔اسی کا نتیجہ اور کرشمہ یہ ہوا کہ جن چیزوں کو سڑ گل جانا چاہئے تھا وہ تروتازہ حال پر باقی رہیں اور گدھا غریب سڑ گل گیا۔

قیومیت کا مفہوم:

خالق ومخلوق کے اسی تعلق کی تعبیر حق تعالیٰ کی صفت قیوم کی طرف نسبت کر کے ''قیومیت'' کے لفظ سے کی جاتی ہے' جس کا مطلب یہی ہے کہ پیدا ہونے کے بعد یہ سمجھ لینا کہ مخلوقات اپنے تغیرات وانقلابات میں حق تعالیٰ کی تاثیری کارفرمائیوں سے آزاد ہو جاتی ہیں' عالم کے نظام کے متعلق یہ قطعاً ایک غلط تصور ہے۔

اوراسی بنیاد پر ہمیں سمجھنا چاہئے کہ زندہ ہونے کے بعد موت کا تعلق زندہ ہونے والی شئی کی طبیعت وفطرت ومزاج وغیرہ مجہول چیزوں سے نہیں ہے بلکہ خدا کی مشیت' اس کا ارادہ' اس کا اذن جس چیز میں جب تک چاہتا ہے زندگی کو باقی رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے زندگی سے اس کو محروم فرما دیتا ہے اور یہ قانون صرف زندگی یا حیات ہی کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر مخلوق اپنے ہر تغیر کے ہر پہلو میں قیومیت کے اسی عام قانون کی تابع ہے اور اب سوچئے کہ اصحاب کہف کی طویل زندگی کے ذکر کے بعد جو یہ فرمایا گیا ہے۔

''نہ تھا (ان لوگوں کے لئے) اللہ کے سوا کوئی پشت پناہ''

یعنی ''مالھم من دونہ من ولی'' کا جو ترجمہ ہے اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اتنی مدت تک ان لوگوں کے قیام میں حق تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے سے کسی قسم کی کوئی مدد نہیں مل رہی تھی اور کیسے ملتی؟ جب واقعہ یہ ہے کہ سارے نظام عالم کا واحد ہمہ گیر قانون ہی یہ ہے کہ:

وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔

''اور نہیں شریک ہے اس کے حکم میں کوئی''۔

پس یہی واقعہ کی جب اصل حقیقت ہے تو اپنی پیدا کی ہوئی زندگی کو پیدا کرنے والا جب تک اس کا جی چاہے باقی رکھے اور جب چاہے ختم کر دے' کسی دوسرے کی دخل اندازی کی گنجائش ہی کیا ہے۔ ''خالق ومخلوق'' کے باہمی تعلق کی یہی عقلی نہیں بلکہ وجدانی یافت' ایمانی زندگی کا معراج کمال ہے۔ صوفیہ کی اصطلاح میں اسی کی تعبیر ''وحدۃ الوجود'' کے لفظ سے کی گئی ہے لیکن جو نہیں

جانتے ہیں انہوں نے ان پر الزام لگایا کہ وہ ''وحدۃ الوجود'' کے نظریہ کے مبلغ ہیں۔
وشتّان مابینھا' قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ۔

اصحاب کہف کی مدت قیام تاریخی نقطہ نظر سے:

اصحاب کہف کے قصہ کی حد تک قرآنی بیان گویا سمجھنا چاہئے کہ ختم ہو چکا ہے اگرچہ آگے کی آیتوں کا بھی براہ راست ان کی سرگزشت سے خواہ تعلق نہ ہو' لیکن کلیتہً اس قصہ سے وہ جدا نہیں ہیں بلکہ اسی قصہ سے پیدا ہونے والے نتائج ہی ہیں۔ ہم چاہیں تو ان کو بھی شمار کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ اس کا ذکر تو آئندہ کیا جائے گا۔ سردست اصل قصہ کو ختم کر کے ایک ذیلی مسئلہ کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ اس وقت تک تو عموماً میں نے اپنے بیان کو قرآنی الفاظ ہی کی حد تک محدود رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ارباب قصص و حکایت نے کہف والوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے میں نے قصداً اس سے تعرض ہی کیا ہے یا ضرورۃً بعض چیزوں کا ذکر اگر آ گیا ہے تو اس کی حیثیت ایک ذیلی بیان کی ہے اس وقت بھی ایک ذیلی بات ہی کا ذکر مقصود ہے۔

اصحاب کہف کے لبث (یا مدت قیام) کو بتاتے ہوئے قرآن نے جو یہ طریقہ تعبیر اختیار کیا ہے کہ ''تین سو سال وہ ٹھہرے اور بڑھا دیا انہوں نے ۹ سال'' امام رازی کی تفسیر سے نقل کر چکا ہوں کہ بعض لوگوں نے قرار دیا ہے کہ شمسی و قمری سالوں کے تفاوت کی طرف اس پیرایہ بیان سے اشارہ کیا گیا ہے لیکن خود امام نے اس پیرایہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ حساب کی رو سے یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ایسی صورت میں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آخر اس خاص طریقہ بیان کی مصلحت کیا ہے؟ اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن کے الفاظ سے تو اس کا پتہ نہیں چلتا کہ اصحاب کہف کا یہ قصہ کس زمانے میں پیش آیا' لیکن اسلامی و غیر اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے جب منادی شروع کی اور دنیا کے مختلف حصوں میں وہ پھیل گئے تو ایشیائے کوچک کے اس مرکزی شہر افسیس میں بھی بعض لوگ پہنچے اور حضرت عیسیٰ کے پیغام کی وہاں کے باشندوں میں تبلیغ شروع کی۔ عرض کر چکا ہوں کہ افسیس کے باشندے بت پرست تھے ان ہی بت پرستوں

میں چند نوجوان مسیحی پیغام سے متاثر ہوئے قوم سے جھگڑا شروع ہوا' اسی کشمکش سے تنگ آ کر کہف میں پناہ لینے کے لئے وہ داخل ہو گئے۔اب یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔

قدیم وجدید ہر قسم کے مورخوں نے اس کا ذکر کیا ہے حتیٰ کہ مشہور محدث جلیل علامہ ابن حزم اندلسی نے جن کی وفات ۴۲۸ھ میں ہوئی ہے۔اپنی کتاب ''ملل ونحل'' میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ دین عیسوی کے ماننے والوں پر رومی بت پرستوں نے شروع شروع میں مظالم کے پہاڑ توڑے' لکھا ہے۔

فبقوا علی هذه الحالة لا يظهرون البتة ولا لهم مكان يامنون فيه ثلث مائة سنة بعد رفع المسيح عليه السلام۔

(مظلومیت کے اسی حال میں عیسائی مبتلا رہے) دنیا کے سامنے ظاہر نہیں ہو سکتے تھے نہ ان بے چاروں کو ایسی جگہ مل سکی جس میں امن کے ساتھ زندگی بسر کریں (اور یہ صورت حال) عیسیٰؑ کے اٹھائے جانے کے تین سو سال بعد تک باقی رہی۔''

آگے ابن حزم نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تین سو سال گزرنے کے بعد کس طرح قسطنطین شاہ قسطنطنیہ نے عیسائی دین قبول کر لیا اور اسی کے بعد عیسائیوں کو آزادی کے ساتھ رہنے سہنے' چلنے پھرنے اور علانیہ تبلیغ کرنے کا موقع ملا بلکہ تبلیغ کے ساتھ جبر وزبردستی سے کام لے کر بھی لوگوں کو عیسائی بنانے لگے۔

اب ایک طرف تاریخ کے اس بیان کو رکھئے اور اس کو قرآن کی اس خبر سے ملایئے کہ کہف والوں کے قیام کی مدت میں وہی تین سو سال مزید نو سال کے اضافہ کے ساتھ تھی۔اگر اس سے یہ نتیجہ پیدا کیا جائے کہ مظلومیت اور روپوشی کی جو مدت عام عیسائیوں پر گزری اسی زمانہ میں کہف والے بھی کہف میں پناہ گزیں رہے اور ان کے شہر کے باشندوں میں جو مذہبی انقلاب رونما ہوا' تا آنکہ اپنے شہر سے بھاگنے والے ان نوجوانوں کے ساتھ نادیدہ عشق ومحبت' عظمت واحترام کا تعلق پیدا ہوا' یہ سارے قصے اسی تین سو سال کے اندر پیش آئے۔اس کے بعد اچانک لوگ ان سے جب واقف ہوئے تو ۹ سال کا زمانہ اس واقفیت کے بعد گزرا اور دونوں زمانوں کے اسی اختلاف کی طرف قرآن نے اپنے پیرایہ بیان سے اشارہ کیا ہے' جہاں تک میرا خیال ہے دوسری

توجیہوں سے یہ توجیہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے سمجھ میں یہ آتا ہے کہ کہف والوں کو ایمان اور ایمانی اجر کا تجربہ کرانا مقصود تھا اسی لئے اتنی طویل زندگی ان کو عطا کی گئی اور جہاں سے بصد بے کسی و بے نوائی وہ نکلے تھے اسی مقام کے باشندوں کی عجیب وغریب گرویدگیوں اور اپنے ساتھ غیر معمولی دلچسپیوں کا تماشا ان کو کرایا گیا۔ شاید اس کے بعد ۹ سال جینے کا موقع ان کو اور ملا اور پھر کل نفس ذائقة الموت کے کلی قانون کے تحت ان کی وفات ہوگئی۔ ❶

❶ مرزائی جماعت کے لاہوری اور قادیانی دونوں گروہوں کی تفسیروں میں اصحاب کہف کی شخصی و انفرادی زندگی کی جگہ تین سو نو سال کی اس مدت کو عیسائیوں کی قوم کی طرف منسوب کر کے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ مدت شخص و افراد کی نہیں بلکہ عیسائی امت یا قوم کی زندگی کا کہفی دور تھا اور قسطنطین کے عیسائی ہونے سے پہلے ان پر گزرا۔ مرزا بشیر الدین نے عیسوئی سنہ کے موجوہ کیلنڈر کی غلطیوں کا ذکر کر کے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ۹ سال کا عرصہ قرآن نے خاص طریقہ سے جو کیا ہے اس میں اشارہ کیلنڈر کی ان غلطیوں کی طرف ہے' جو بالکل ایک ان میں بے جوڑسی بات معلوم ہوتی ہے اور اس پر بھی زیادہ تعجب ان کی اس تحریفی جرات پر ہے کہ قرآن کے واضح الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ کہف میں نو جوانوں کی جو ٹولی پناہ لینے کے لئے داخل ہوئی تھی وہی نیند سے اٹھی' اچانک لوگ ان ہی سے واقف ہوئے ان ہی کی یادگار قائم کرنے پر لوگ اصرار کر رہے تھے ان کے متعلق آئندہ عددی مکاتب خیال قائم ہوئے اور وہی تین سو نو سال اس کہف میں قیام پذیر رہے۔ مگر معلوم نہیں قرآن کے کس لفظ سے ان انفرادی شخصیتوں کو قادیانی ذہنیت نے قوم اور امت کا رنگ دے دیا۔ شاید اپنی اس تحریفی حرکت سے ان کی غرض یہ ہے کہ شخصی زندگیوں کی اتنی غیر معمولی طوالت کو چونکہ عام عقلیت برداشت نہیں کر سکتی' اس لئے غلط عقلیت کی تصحیح کے زیادہ مناسب ان کو یہ معلوم ہوا کہ قرآن کی غلطی کی تصحیح کر دی جائے۔ حالانکہ ایمانی اجر کے متعلق جن پر غیر معمولی توقعات کو قرآن مومن کے دل میں قائم کرنا چاہتا ہے اس غرض کی تکمیل ہی اس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ ایمان کی عام شکلوں کے ساتھ ساتھ اسی کے غیر معمولی مظاہر کا تذکرہ نہ کیا جاتا۔ ان کی سرگزشت سے ایسے عناصر جن کا عام حالات میں تجربہ نہیں ہوتا اگر نکال دیئے جائیں گے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ کبوتر کے اسی پر کو گرا دیا گیا ہے جس میں دلبر کا نامہ بندھا ہوا تھا گویا جس مقصد کے پیش نظر ان کے قصے کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے اس کی روح ہی اس تحریفی طریقہ کار سے نکل جاتی ہے یہی تو بتانا مقصود ہے کہ ناموافق حالات میں بھی ایمان بہرحال نجات کا ایک ذریعہ ایسا رہ جاتا ہے کہ مومن جس سے ہر حال میں مدد حاصل کر سکتا ہے۔ ہاں! قصہ کو اصحاب کہف کی انفرادی سرگزشت قرار دیتے ہوئے عیسائیت کے عہد مظلومیت کی طرف بھی ایک گونہ ایماء اگر اسے ٹھہرایا جائے تو ''باب الاشارہ'' کے لحاظ سے تھوڑی بہت گنجائش اس کی پیدا ہو سکتی ہے لیکن بجائے جزئی اور شخصی واقعہ کے کسی قوم کے کلی حادثہ کی تعبیر قرآنی الفاظ سے نکالنی تحریفی خواب پریشان کے سوا اور کچھ نہیں۔

باب چہارم

احکام مندرجہ سورۃ کہف

اصحاب کہف کی سرگزشت کو ختم کر کے آگے چند احکام ہیں۔آیئے اور ان کا مطلب سمجھئے اور دیکھئے کہ کہف والوں کے قصے سے ان احکام کا کیا تعلق ہے۔ پہلا حکم اس سلسلے کا یہ ہے۔

تلاوت کتاب:

وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتٰبِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ط وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا○

''اور پڑھتا[1] رہ جو وحی کی گئی تجھ پر تیرے رب کی کتاب سے، نہیں ہے کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کا اور ہرگز نہ پائے گا تو اس کے سوا یکسوئی کی کوئی جگہ''

حکم کی ابتداء واو عاطفہ سے کی گئی ہے اور اسی کا ترجمہ ''اور'' کیا گیا ہے جہاں تک میرا خیال ہے اور قاعدہ بھی اسی کو چاہتا ہے کہ عطف کے اس حروف واو کے بعد والا مضمون اس کے ماقبل کی عبارت کے مضمون سے مربوط ہے، اسی ربط کو تلاش کرنا چاہئے۔

یاد ہوگا کہ منجملہ دوسری باتوں کے کہف والوں کے قصہ کے دو لفظ ''الرقیم'' (جس کی تفسیر ''الکتاب'' کی گئی تھی) اور ''فتیة'' (نوجوانوں کی ٹولی جس کا ترجمہ کیا گیا تھا) قرآن کے ان دونوں لفظوں سے یہ اشارہ حاصل کیا گیا تھا کہ کہفی زندگی جس میں تہذیب وتمدن کے ہنگاموں سے آدمی الگ ہو جاتا ہے اس میں دماغی پستی، ذہنی تعطل و جمود کا قدرتاً خطرہ جو پیدا ہوتا ہے اسی خطرے کے انسداد کے لئے قصہ کی اجمالی و تفصیلی دونوں تعبیروں میں ''رشدی'' صلاحیتوں کی حفاظت کی طرف خصوصی توجہ کی گئی ہے اور ''رشد'' یعنی سوجھ بوجھ فکر ونظر کے ملکہ وسلیقہ کو زندہ وتر وتازہ برسرکار رکھنے کے لئے عملی تدبیر ان ہی دو لفظوں الرقیم اور فتیة سے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ

---

[1] الزم قراءة الكتاب الذى اوحى اليك۔ رازی نے ''اتل'' کی تفسیر کی ہے، اسی لئے پڑھتا رہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

کہفی زندگی میں کتاب کے ساتھ مشغولیت ومطالعہ کا تعلق جاری رکھا جائے اور بجائے تنہائی کے چاہئے کہ ''کہفی زندگی'' کو چند رفیقوں کے ساتھ گزارا جائے' گویا خواجہ حافظ کی مشہور تمنائی زندگی

دو یار زیرک و زبادہ کہن دومنے فراغتے و کتابے و گوشہ چمنے

کے جواز کی سند قرآن سے پیدا کی گئی تھی۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ ایسے دو اہم نتیجوں کے لئے قرآن کے صرف یہ دو لفظی اشارے پڑھنے والوں کو اگر ناکافی محسوس ہو رہے ہوں تو یہی ہونا بھی چاہئے تھا ماسوا اس کے یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ دونوں الفاظ ان نتیجوں کے لحاظ سے جن کا نکالنا ان سے مقصود ہے حد سے زیادہ مجمل اور مشتبہ بھی ہیں آخر ''الرقیم'' کے لفظ کی تفسیر ''الکتاب'' مان بھی لی جائے کہ صحیح ہے تو زیادہ سے زیادہ اس کا اقتضاء یہی ہو سکتا ہے کہ کہفی زندگی میں کتابی اشتغال کا اشارہ اس سے ملتا ہے مگر یہ بات کہ اشتغال ومطالعہ کے لئے آیا خاص نوعیت کی کتابوں کا انتخاب ہو یا بری بھلی پست و بلند' رطب و یابس' جھوٹی سچی جس قسم کی کتابیں بھی ملتی چلی جائیں سب ہی کو یہ مشورہ حاوی ہے؟ ظاہر ہے ''الرقیم'' کی تفسیر ''الکتاب'' کے مطلق لفظ سے کوئی فیصلہ ممکن نہیں۔ حالانکہ فتنوں کے جن ایام میں کہفی زندگی کی ضرورت پیش آتی ہے تجربہ اور مشاہدہ بتا رہا ہے کہ دوسرے امراض کے ساتھ ساتھ ''خود بینی'' و ''خود رائی'' کی عام وبا بھی آبادیوں میں پھوٹ پڑتی ہے۔ سوچنے سمجھنے اور اپنی سوچی سمجھی باتوں کے ادا کرنے کا تھوڑا بہت سلیقہ بھی جن لوگوں میں پایا جاتا ہے' یہ دیکھا جا رہا ہے کہ نظریہ سازیوں اور اسکیم بازیوں کے گورکھ دھندوں میں خود بھی وہ مبتلا ہیں اور ''فتنہ زدہ انسانیت'' کو بھی ان ہی خود آفریدہ وتراشیدہ تجویزوں کی طرف دعوت بھی دے رہے ہیں۔ نبوت کی زبان میں ''عہد فتنہ'' کی اس وبائے عام کی تعبیر **عجاب کل ذی رای برایہ** ❶ سے کی گئی ہے۔ یہ بڑا دردناک حال ہوتا ہے جب آدم کی اولاد قرآنی تمثیل:

---

❶ اپنی اپنی رائے پر ہر سوچنے والے کو ناز وغرور پیدا ہو جاتا ہے۔۱۲

کالذی استھوتہ الشیطین فی الارض حیران۔

''اس شخص کے مانند جسے بھوتوں نے زمین میں سراسیمہ بنا رکھا ہوا ہے۔''

کے طلسم میں پھنس کر بھٹکتی پھرتی ہے۔ تقریروں کا طوفان ابلتا ہے' تحریروں کے انبار لگ جاتے ہیں۔ گو بظاہر دل آویزیوں سے عموماً اس زمانہ کی یہ تقریریں وتحریریں لبریز ومعمور ہوتی ہیں لیکن صحیح فکر کے ساتھ ان کا منطقی جائزہ جب بھی لیا گیا ہے یہی ثابت ہوا کہ جن کو پکارا جاتا ہے' جیسے زندگی کے بنیادی حقائق سے وہ نا آشنا و بیگانہ ہیں' نا آشنائی و بیگانگی میں پکارنے والوں کا حال بھی ان سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ بجائے بنیاد کے نظر آتا ہے کہ صرف سطح کے بیرونی تموجات و مظاہر میں خود بھی الجھے ہیں اور ان ہی سطحی تھپیڑوں میں چاہتے ہیں کہ دوسروں کو بھی الجھادیں۔ ان ہی غیر مآل اندیشانہ کوششوں کا نتیجہ پہلے بھی یہی ہوا ہے اور اب بھی یہی ہو رہا ہے اور آئندہ بھی یہی ہوتا رہے گا کہ نجات کی کشتی جو آج سمجھی جاتی ہے کل وہی موت کی کھائی نظر آنے لگتی ہے' نت نئے ادلتے بدلتے نظریات بھانت بھانت کی بوقلموں سکیموں اور سیمائی تجویزوں کی ٹھوکروں سے فتنے کے ان دنوں میں ''انسانیت'' تہہ و بالا' الٹتی پلٹتی رہتی ہے' ان خود بینوں کی کسی کروٹ پر نہ خود چین ملتا ہے اور نہ دوسروں کو چین لینے دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ بدتمیزی کے ان طوفانی ایام میں اگر مطالعہ کے دائرے کو ہر قسم کی کتابوں کے لئے وسیع کر دیا جائے گا تو وقت گزاری کے لئے ممکن ہے یہ اچھا مشغلہ ثابت ہو' مگر یہ سوچئے کہ کہفی زندگی ایسی صورت میں ''کہفی زندگی'' باقی رہے گی یا وسعت مطالعہ کی یہ زندگی باہر سے خواہ جو کچھ بھی نظر آئے' درحقیقت فتنہ ہی کی زندگی بن کر رہ جائے گی۔

مگر ''الرقیم'' اور اس کی تفسیر ''الکتاب'' کے اجمالی اشارہ کو قصہ کہف کے بعد والے اس پہلے قرآنی حکم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اس حکم کے الفاظ کو پھر پڑھ لیجئے اور سوچئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں بھی کتاب ہی کے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے' لیکن کیا ہر کتاب کا؟ وہی کتاب جن کے لکھنے والے انسانی زندگی کو اپنی بحث کا موضوع بنا کر لکھتے چلے جا رہے ہیں مگر یہ طے کئے بغیر لکھتے چلے جا رہے ہیں کہ اس زندگی کی ابتداء کیا ہے' انتہا کیا ہے اور ابتداء کی بنیاد پر اس کا مدعا کیا ہے یا کیا ہو سکتا ہے؟

بہر حال "الرقیم" یا "الکتاب" کا لفظ بھی مجمل یا جس حد تک بھی تشنہ ہو' لیکن **ما اوحی الیک من کتاب ربک** (جو وحی کی گئی تجھ پر تیرے رب کی کتاب سے) کے الفاظ میں بھی "اجمال" و "ابہام" کا کوئی پہلو باقی رہ گیا ہے؟

یقیناً آدمی کے پالنے والے خالق کائنات ہی کی کتاب ایسی کتاب ہو سکتی ہے جس میں پڑھنے والوں کو اس وقت بھی روشنی مل سکتی ہے جب دنیا کا گوشہ گوشہ فتنوں کی تاریکیوں میں ڈوب گیا ہو' ہم اسی کتاب سے اپنی زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا صحیح غیر مشتبہ علم حاصل کر سکتے ہیں اور اسی میں ان غیر فانی' اٹل' امٹ اور لازمی محال سچائیوں کو پا سکتے ہیں جو زمانے کے انقلابی جھگڑوں سے نہ بدلے جا سکتے ہیں اور ماضی ہو یا حال واستقبال' زمانے کے کسی حصہ میں نہ وہ کبھی غلط ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہی مطلب ہے۔

لا مبدل لکلمته

"نہیں ہے کوئی بدلنے والا ❶ اس کی باتوں کا"

کے الفاظ کا جنہیں اس حکم میں آپ پا رہے ہیں۔ آخر غیب ہو یا شہادت' گزرا ہوا زمانہ ہو یا آنے والا' جس کا علم محیط ہر ایک کو حاوی ہو اس کی باتوں کو کون بدل سکتا ہے اور غلطی کی ان میں گنجائش ہی کیا پیدا ہوتی ہے اسی لئے تو آخر میں فرمایا گیا ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا۔

"ہرگز نہ پائے گا تو اس کے سوا یکسوئی کی کوئی جگہ"

جس کا حاصل یہی ہے کہ کہفی کہیے یا یکسوئی کی ایسی زندگی جو واقعی کامیاب ونتیجہ خیز ہو' ان لوگوں کو بھی نہیں مل سکتی جو مخلوقات کے ساتھ خالق کی باتوں سے بھی گھبرا کر ایسی زندگی گزار رہے ہیں یا گزارنے کا ارادہ کر رہے ہیں جس میں نہ مخلوق ہی کی بنائی کتابوں سے تعلق رکھا جائے نہ خالق کی اتاری ہوئی کتاب سے استفادہ کیا جائے۔

---

❶ مراد اس تبدیلی سے تفنن کی جہالت وناتجربہ کاری کی وجہ سے قانون میں ہوتی رہتی ہے ورنہ مریض کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق علاج میں ردوبدل طب کے علم کا عین اقتضاء ہے بلکہ عدم تبدیلی ایسی صورت میں طبیب کی جہالت کی دلیل ہے اور یہی مسئلہ نسخ کی بنیاد ہے۔

ان کو چونکا دیا گیا ہے کہ یکسوئی کی اس زندگی کے اس قالب میں بھی یکسوئی کی زندگی میسر نہیں آ سکتی' باہر سے ممکن ہے یکسوئی کی زندگی وہ معلوم ہو' لیکن دوسروں کے نہ سہی خود اپنے دماغی بھپاروں اور ذہنی ابخروں کے دروازے تو ان پر کھلے ہی رہیں گے اور جب تک ''انسانی کاسہ سر'' میں مغز کی جگہ پتھر ہی نہ بھر دیئے جائیں۔ اپنے اندر ابلنے والے اوہام ووساوس کے سیل رواں کو کون روک سکتا ہے؟ تجربہ ان پر ثابت کردے گا کہ ''ملتحد'' سمجھ کر جہاں انہوں نے پناہ ڈھونڈھی تھی وہاں بھی خود ان ہی کا دماغ خیالات کا ایک ''جہاں'' لئے کھڑا ہوا ہے اور تب ثابت ہوگا کہ رب کی بخشی ہوئی آگاہیوں کے سوا صحیح کہفی زندگی آدمی کو نہ خلوت ہی میں مل سکتی ہے اور نہ جلوت میں۔

ان لوگوں کے لئے جو حق کی خلوت گاہ میں آرام لینا چاہتے ہوں جس کی تعبیر قرآن نے ''ملتحدا'' کے لفظ سے کی ہے امام رازیؒ کی یہ تفسیر بھی خاص توجہ کی مستحق ہے ''اتل'' کا لفظ جس کا سادہ ترجمہ ''پڑھتارہ'' کیا گیا ہے اسی کی شرح کرتے ہوئے امام نے لکھا ہے:

اتل یتناول القراء ۃ ویتناول الاتباع ایضا۔ (تفسیر کبیر ص ۷۰۹ ج ۵)

''پڑھنا اور پڑھنے کے ساتھ اسی کے ساتھ چلنا کا لفظ دونوں پر مشتمل ہے''

''تلاوت'' جو ''اتل'' کا مادہ ہے اس کے لغوی معنی سے جو واقف ہیں وہ امام کی تفسیر کا انکار نہیں کرسکتے۔ بات بہت طویل ہو جائے گی ورنہ ضرورت یہی تھی اور جی بھی یہی چاہتا تھا کہ امام رحمۃ اللہ علیہ کے اس مجمل بیان کی کچھ شرح کی جاتی مگر یہ علیحدہ مستقل مضمون ہے اس وقت میرے سامنے ''الرقیم'' کے بعد ''فتیۃ'' کا لفظ ہے ''نوجوانوں کی ٹولی'' ترجمہ کرکے جاہا گیا تھا کہ کہفی زندگی میں ''رفقاء'' کا اشارہ اسی سے پیدا کیا جائے جیسا کہ میں نے عرض کیا خود اسی مقصد کے لئے یہ لفظ ناکافی تھا۔ پھر رفاقت کی زندگی کے متعلق اس قسم کے سوالات مثلاً کس قسم کے رفقاء کا انتخاب کیا جائے؟ اور ایسے رفیق جن سے کہفی زندگی کے منافع سے مستفید ومتمتع ہونے میں مدد مل سکتی ہے ان کو کن نشانیوں اور علامتوں سے ہم پہچان سکتے ہیں؟ اور اس سے بھی زیادہ رفاقت کے مسئلہ کا یہ سوال کہ ''رفقاء'' کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہئے؟ کیا رفاقت کے لئے یہ ضروری ہے کہ زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ہم ان کے اور وہ ہمارے ہم نوا اور ہم

آہنگ ہوں اور باہم ایک دوسرے کے ظاہراً و باطناً ہم رنگ ہوں؟ ظاہر ہے کہ اس ایک لفظ سے ان سوالوں کا جواب نہیں مل سکتا مگر مذکورہ بالا پہلے حکم کے بعد پڑھیے اس دوسرے حکم کو یعنی:

تاکید صبر:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ.

''اور تھامے رکھ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح و شام اور مراد بنائے ہوئے ہیں اسی کے رخ کو۔''

اس دوسرے حکم میں سب سے پہلے توجہ کا مستحق حکم کا پہلا لفظ اصبـــــر کا ہے جس کا ترجمہ ''تھامے رہ'' کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ''صبر'' کا مطالبہ عموماً نا مناسب و ناموافق حالات ہی میں کیا جاتا ہے اسی بنیاد پر اگر یہ سمجھا جائے کہ کامل ہم آہنگی اور یک جہتی و یک رنگی کی توقع ''رفاقت کی زندگی'' میں نہ کرنی چاہئے تو لفظ کا بھی اقتضاء یہی ہے۔ گویا شروع ہی میں ''رفاقت کی زندگی'' اختیار کرنے والوں کو چونکا دیا گیا ہے کہ اس رہ میں قدم رکھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ ''صبر'' کے جذبہ کو ہر رفیق دوسرے رفیق کے متعلق زندہ اور بیدار کر کے رفاقت کے رشتہ کو قائم کرے' کیونکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اول سے آخر تک ایک ایک نقطہ میں اتحاد کی اُمید تو شاید ایسے دو آدمیوں میں بھی نہیں کرنی چاہئے جو ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہوں' بلکہ نوعی اقتضاؤں کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے جیسے ظاہری شکل و صورت میں ہر آدمی کو قدرت نے دوسرے آدمی سے جدا کر دیا ہے اور اتنا جدا کر دیا ہے کہ چال' ڈھال' آواز' لہجہ میں بھی بنی آدم کے دو فرد بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے بلکہ اپنے ان ہی بیرونی اختلافات کی وجہ سے آدمی پہچانا جاتا ہے' حالانکہ نوعی اقتضاؤں کے اعتبار سے دیکھئے گا تو ہر ہر شخص کی آنکھ' کان' ناک بلکہ ہر ہر عضو ہر ایک میں اسی جگہ نظر آتے ہیں جہاں پر دوسروں میں ہم ان کو دیکھتے ہیں۔ حالانکہ قدرت چاہتی تو جیسے آنکھیں چہرے پر لگائی گئی ہیں' بجائے چہرے کے کسی میں ان ہی آنکھوں کو سر کے پچھلے حصے میں لگا دیتی' مگر با ایں ہمہ وحدت و کثرت کا یہ عجیب و غریب کرشمہ ہے اور ٹھیک جو حال بیرونی شکل و

شباہت، خدوخال کے شخصی اختلافات کا ہے، تجربہ آپ کو بتائے گا کہ اندرونی احساسات و رجحانات، افتادِ طبع، طریقہ فکر وغیرہ جیسے باطنی امور میں بھی ہر فرد کسی نہ کسی قسم کی انفرادی خصوصیت اپنے اندر ضرور رکھتا ہے خواہ ابتداء میں ان انفرادی خصوصیتوں کا پتہ نہ چلے۔ اور جب واقعہ کی صورت حال یہی ہے تو رفاقت کی زندگی کے ہر ہر شعبہ کے ہر ہر پہلو میں باہم رفقاء میں کامل ہم آہنگی کی امید ظاہر ہے کہ غلط اور قطعاً غلط امید اور ایسی امید ہوگی جس کی بنیاد پر دھوکے کی تکلیف سے تجربہ کے بعد دوچار ہونا پڑے گا۔ اور جو رفاقت کے تعلقات کو نباہنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ''آخر وقت تک'' رفاقت'' کے ثمرات و منافع سے مستفید ہوتے رہیں، ان کے لئے صحیح مشورہ یہی ہو سکتا ہے کہ موافقت کے ساتھ ساتھ بالکل ممکن ہے کہ رفاقت کی اس ''زندگی'' میں ناموافقت کے ناگوار حالات سے بھی سابقہ پڑے، اس لئے قرآن نے اصبر کے ساتھ انتخاب رفقا کے اس حکم کو شروع کیا ہے، اس سے کم از کم میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے گویا اس میں جواب ہے اس سوال کا کہ ''رفقا'' کے ساتھ تعلقات کی کیا نوعیت ہونی چاہئے؟

انتخاب رفقاء:

دوسری مہم اس مسئلہ میں رفقاء کے انتخاب کا معیار ہے، یعنی رفاقت میں جن رفقاء کے انتخاب کا حکم دیا ہے ان کو ہم نشانیوں اور علامتوں سے پہچانیں؟ اسی کے جواب کو آپ آگے ان الفاظ میں پا سکتے ہیں، فرمایا گیا ہے:

الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ.

''جو پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح و شام، مراد بنائے ہوئے ہیں اس پالنے والے کے رخ کو۔''

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اس قسم کے مواقع پر شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآنی الفاظ کا کوئی خودساختہ خلاصہ لوگ نکال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مثلاً مذکورہ بالا الفاظ کا مطلب یہ نکال لیا جاتا ہے کہ رفاقت کیلئے حکم دیا گیا ہے کہ دین داروں کا انتخاب کیا جائے لیکن کم از کم قرآنی الفاظ کے ساتھ تو اس قسم کی لاپروائیاں بڑی محرومی ہے۔

یہ سچ ہے کہ جن میں یہ صفات پائے جاتے ہیں وہ دین دار ہی ہوتے ہیں لیکن ہر دیندار میں ان صفات کا پایا جانا جہاں تک میرا خیال ہے ضروری نہیں' دینی زندگی رکھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ ہر زمانے میں پایا گیا ہے جو آئین وقانون کی شکل میں زندگی کی دینی تنظیم ہی کو مذہب کا آخری مطالبہ سمجھتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ بہشتی زندگی بطور طبعی نتیجہ کے اس کے سامنے اسی طرح آ جائے گی جیسے تریاق کا استعمال صحت کے نتیجے تک مریض کو پہنچا دیتا ہے۔ ان کی نظر صرف قانون کی اہمیت تک محدود رہتی ہے اور قانون کے مقنن سے بجز قانونی تعلق کے نہ کوئی رشتہ وہ رکھتے ہیں اور نہ رکھنا چاہتے ہیں' جیسے مریض صرف طبیب کی بتائی ہوئی دواؤں سے اپنا تعلق رکھتا ہے اور صحت کے لئے جانتا ہے کہ براہ راست طبیب سے تعلق پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اور اسی کے مقابلہ میں دینداروں کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جن کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت وہی ہوتی ہے جسے نشانی اور علامت ٹھہراتے ہوئے مذکورہ بالا الفاظ میں قرآن نے ان کو روشناس کیا ہے۔

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ۔

''پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح وشام۔''

یہ ان لوگوں کی شناخت کی پہلی قرآنی علامت اور نشانی ہے۔ علامہ شوکانیؒ ان الفاظ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

كناية عن الاستمرار على الدعاء في جميع الاوقات (ج۳ص۱۷۲)

''سارے اوقات میں دعا کرتے رہنا اسی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔''

جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ عربی زبان کے محاورہ کا اقتضاء بھی یہی ہے' حاصل جس کا یہی ہوا کہ پرورش کرنے والی قوت رب کے ساتھ اپنے احتیاجی تعلق کے احساس کو ہمہ دم مسلسل' بغیر کسی انقطاع کے اپنے اندر زندہ اور بیدار رکھنا اور اسی احساس کے زیر اثر چھوٹی بڑی ضرورت میں اسی کی طرف پلٹنا اور اسی کو پکارتے رہنا یہی ان کی زندگی کا مشغلہ اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنا ہوا ہوتا ہے اور فقر تام' احتیاج مطلق' فقط سوال' صرف بھیک کی اسی پستی میں جو

بلندی ان کو حاصل ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کمتری سے جو برتری پیدا ہوتی ہے۔

یریدون وجهه (مراد بنائے ہوئے ہیں وہ اسی رب کے رخ کو)

کے الفاظ میں اسی کی تصویر پیش کی گئی ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ اپنی دعا اور پکار کے جواب میں جو کچھ بھی ان کو ملتا ہے اس میں اپنی آئینی زندگی کے منطقی نتیجہ سے زیادہ ان کو اپنا رب اور اسی رب کا فضل واحسان نظر آتا ہے۔ ان کی نگاہ کسی حال میں وجه الله (رب کے رخ) سے نہیں ہٹتی حتیٰ کہ بہشت بھی ان کے سامنے جب آئے گی تو وہ بھی رضوان اللہ ہی کا قالب ان کو محسوس ہوگا۔ وہ محسوس کریں گے کہ وہی اپنی رضامندیوں کے ساتھ ان کے آگے بے نقاب ہو کر آ گیا ہے۔

الغرض رب کے ساتھ فقر واحتیاج کا دوامی تعلق اور ہر حال میں "وجه الله" ہی کو مراد بنائے ہوئے رہنا' ان ہی دو علامتوں سے ان رفقاء کی قرآن میں شناخت کرائی گئی ہے جن کی ضرورت کا اشارہ اصحاب کہف کے قصہ میں "فتنہ" کے لفظ سے کیا گیا تھا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ "کہفی زندگی" جس کا مشورہ فتنہ کے خاص زمانہ میں دیا گیا ہے اس میں ایمانی زندگی کے بچانے میں کچھ امداد گر مل سکتی ہے تو اسی قسم کے دیندار رفیقوں سے مل سکتی ہے جن کی زندگی کا دین ناگزیر اندرونی اقتضاء بن گیا ہو ورنہ باہر سے لادے اور عائد کئے ہوئے آئین وقانون کی شکل میں اپنی زندگی کو جو نباہ رہے ہوں فتنہ کے طوفانی دور کے ان تھپڑوں کی چوٹ کو صحیح معنوں میں وہ مشکل ہی سے برداشت کر سکتے ہیں۔ بہرحال رفاقت کے لئے رفقاء کے انتخاب کا کیا معیار ہونا چاہئے؟ انتخاب کے اسی معیار کی نشاندہی مذکورہ بالا دو علامتوں سے جہاں تک میرا خیال ہے قران میں کی گئی ہے۔

نوعیت تعلقات:

باقی راہ کے ان رفیقوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ اجمالی اشارہ خود "اصبر" کے لفظ سے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مل رہا ہے' اسی اجمال کی تفصیل پر غور کیجئے اسی حکم کے ان آخری الفاظ میں آپ کو ملے گی۔ فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔

''اور نہ پھریں تیری آنکھیں ان رفیقوں سے چاہتے ہوئے دنیا (پست زندگی) کی زینت کو۔''

اس آیۃ کریمہ میں الحیوۃ الدنیا سے پہلے ''زینۃ'' کالفظ جو پایا جاتا ہے پہلے اسے سمجھ لیجئے۔ بات یہ ہے کہ اپنی موجودہ زمینی زندگی الحیوۃ الدنیا میں جن چیزوں کے استعمال پر آدمی مجبور تو نہ ہو' مگر التذاذی احساسات کی تسکین وتشفی کا سامان ان سے فراہم ہوتا ہو' موجودہ معاشی اصطلاح جس کے لئے (Luxury) بنائی گئی ہے' میرا خیال یہی ہے کہ قرآن میں ان ہی چیزوں کو زینۃ الحیوۃ الدنیا کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے' زینت کی مد کی ان چیزوں کے استعمال پر یہی نہیں کہ قرآن معترض نہیں ہے' بلکہ اعتراض کرنے والوں ہی کو اس کتاب میں جھڑکا اور ڈانٹا گیا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں:

تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔

''مراد بناتے ہوئے حیات دنیا کی زینت کو''

یعنی الحیوۃ الدنیا کی زینت کو مراد اور مقصود بنانے کی ممانعت کا منشاء یہی ہوسکتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے کہ اپنی زندگی کا آخری نصب العین زینت کی ان چیزوں کو نہ بنانا چاہئے' بالفاظ دیگر ان ہی کی جستجو اور تلاش میں اپنا سب کچھ لگا دینا' ساری توانائیوں کو ان ہی میں گم کر دینا' ان ہی کے لئے جینا' ان ہی کے لئے مرنا' جیسا کہ معیار زندگی کی بلندی (RASE OF STANDARD OF LIVING) یا قریب قریب اس قسم کی خوشنماء دل آویز تعبیروں میں عہد جاہلیت کے جدید رہنما اسی مقصد کو انسانیت کا واحد نصب العین بنا کر کھلے کھلے صاف صاف لفظوں میں آج کل پیش کر رہے ہیں۔

خیر یہ تو الحیوۃ الدنیا کی ''زینت'' کو مراد بنا لینے یا ترید زینۃ الحیوۃ الدنیا کا مطلب ہوا۔ اب آیئے اور جو تعلیم اس حکم میں دی گئی ہے اسے سمجھئے۔ ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں۔

لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ۔

''اور نہ پھریں تیری آنکھیں ان رفیقوں سے''

کے الفاظ میں ممانعت کی گئی ہے کہ رفاقت کی زندگی میں رفقاء کی طرف سے نظر نہ ہٹالی جائے' لیکن یہ ممانعت مطلق غیر مشروط نہیں' بلکہ آگے کے الفاظ۔

تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔

''مراد بناتے ہوئے حیات دنیا کی زنیت کو''

کا جو مفاد ہے' یقیناً اس حال [1] کے ساتھ ممانعت کا یہ حکم مقید و مشروط ہے' حاصل جس کا یہی ہوا کہ الحیوۃ الدنیا کی زینت کو مراد و مقصود بنانے کے لئے رفقاء سے نظر ہٹانے کی ممانعت کی گئی ہے' گویا وہی بات جو ''اصبر'' کے لفظ سے اجمالاً سمجھ میں آتی ہے' اسی کی تفصیلی فہمائش ان الفاظ سے کی گئی ہے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں' کم از کم میری فہم ناقص اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اپنے ذاتی رجحان وافتاد طبع اور شخصی فطرت کے خصوصی اقتضاؤں کے زیر اثر زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً لباس' طعام وغیرہ جیسی باتوں میں ضرورت کے حدود سے آگے بڑھ کر زینت کی مد کی چیزوں کو دینی رفاقت کی زندگی میں کوئی رفیق اگر استعمال کرتا ہو یا استعمال کرنے کا کسی وجہ سے عادی ہو تو ممانعت کے مذکورہ بالا مقید و مشروط حکم کی بنیاد پر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دینی رفاقت کے رشتہ کے منافی اس رفیق کے طرز عمل کو نہیں قرار دینا چاہئے تھا کہ رفقاء سے مطلقاً نظر ہٹانے کی ممانعت کر دی جاتی اور یہ حکم دے دیا جاتا کہ زندگی کے کسی شعبہ میں جائز نہ ہوگا کہ رفقاء کے احساسات کی پابندی سے کوئی رفیق اپنے آپ کو آزاد خیال کرتے ہوئے گریز کی راہ اختیار کرے۔ اسی بنیاد پر بغیر کسی دغدغہ کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دینی دائروں کے نسبتاً بعض کرخت طبقات میں ''زینت'' کے استعمال کو بے دینی نہ سہی لیکن دین کی اعلیٰ معیاری زندگی کے لئے نامناسب یا ناموزوں خیال

---

[1] کیونکہ بالاتفاق نحوی ترکیب کی وجہ سے مفسرین نے اس حصہ کو لا تعد عینك عنهم کے حال کا قائم مقام قرار دیا ہے دیکھو بیضاوی وغیرہ۔

کرنے کا رجحان ❶ جو پایا جاتا ہے کم از کم قرآن سے تو اس رجحان کی ہمت افزائی مشکل ❷ ہے بلکہ صحیح قرآنی مسلک اس باب میں وہی ہے جس کی ترجمانی شیخ سعدیؒ نے اپنے مشہور شعر:

حاجت بہ کلاہ برکی داشتنت نیست
درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

میں فرمائی ہے۔ ''درویش صفت'' کے لفظ سے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی غرض وہی ہے کہ ایمان وعمل صالح کی جس زندگی کی حفاظت کے لئے رفاقت اختیار کی گئی ہے' اس زندگی کا نصب العین جس طرز عمل سے متاثر و مجروح ہوتا ہو' اس میں تو خواہ کچھ ہی ہو جائے کسی رفیق کے ذاتی رجحانات کے ساتھ رواداری کا طریقہ اختیار کرے۔ کچھ گرانی بھی محسوس ہو تو رفاقت کے تعلقات کو نباہنے اور باقی رکھنے کے لئے ''اصبر'' کے قرآنی حکم کی تعمیل کی سعادت حاصل کرنی چاہئے۔

نکتہ:

مگر جیسے قرآن کے اس مشروط و مقید حکم سے مذکورہ بالا نتیجہ پیدا ہوتا ہے اور مذہبی دوائر کے کرخت طبقات کے لئے اس میں پیغام بصیرت ہے' اسی طرح مسلمانوں کا وہ جدید وسیع المشرب گروہ جس نے شاید اپنے دین کو ایسا بحرمحیط ''قلزم ذخار'' فرض کرلیا ہے جو بے دینی کے بدترین عناصر کی شرکت سے بھی مکدر نہیں ہوتا' گویا ان کا دین نمک کی ایسی کان ہے جس میں پہنچ کر ہر قسم کی لامذہبیت بھی مذہب ہی بن جاتی ہے۔ ان کی مثال مولانا رومیؒ کے اس پہلوان کی ہے جو چاہتا تھا کہ گودنے والا اس کے سینہ پر شیر کی تصویر بنا دے' لیکن ایسا شیر بنا دے جو

❶ کرسی کی اتفاقی نشست یا سگریٹ نوشی وغیرہ چیزوں کو دیکھ کر ولایت سے محرومی کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے دین دار دوستوں کو خاکسار نے خود پایا ہے' کہتے تھے کہ کرسی پر بیٹھنے والا یا سگریٹ پینے والا صاحب دل نہیں ہوسکتا' حالانکہ جن کے متعلق فیصلہ کیا گیا تھا وہ یدعون ربھم بالغدٰوۃ والعشی کے مصداق تھے اور وجہ اللہ کے سوا ان کا کوئی قبلہ مقصود نہ تھا۔

❷ خاکسار کی کتاب اسلامی معاشیات میں اس کی تفصیلی مباحث آپ کو مل سکتے ہیں۔

آنکھیں رکھتا ہو نہ کان' نہ سر' نہ دم مگر باوجود اس کے وہ شیر بھی باقی رہے۔ ❶

واقعہ یہ ہے کہ معیار زندگی کی بلندی و برتری وغیرہ جیسی معصوم تعبیروں کے مغالطے میں پھنس کر خود بھی اپنے وجود کا آخری نصب العین کی زینت ہی کو اس طبقہ نے ٹھہرا لیا ہے اور انتہائی سادگی کے ساتھ اسی نصب العین کے متعلق چاہتا ہے کہ ہر مسلمان کی زندگی میں شریک ہو جائے اور طرفہ ماجرا یہ ہے کہ میوزک ہال میں قرآن گانے والوں کا یہ بھولا بھالا گروہ اسی کے ساتھ یہ بھی باور کئے بیٹھا ہے کہ وجہ اللہ کو مراد بنا کر جینے اور مرنے کا قرآنی نصب العین نہ ان کے سامنے سے اوجھل ہوا ہے اور نہ وہ اس نصب العین سے ہٹنے کے جرم کے مجرم ہوئے ہیں۔

کیسی عجیب بات ہے' پہاڑ پر چڑھنے والوں اور اسی پہاڑ سے اترنے والوں' دونوں کی منزل عقل کے ان مسکینوں کو ایک ہی نظر آ رہی ہے! اپنے پالنے والے رب کے ساتھ احتیاج کے دوامی تعلقات کو مسلسل ترو تازہ رکھتے ہوئے جو اسی رب برتر و بزرگ کی طرف چڑھتا چلا جا رہا ہے اور باقی کے ساتھ مربوط ہو کر اپنے فانی وجود کی بقاء کی ضمانت حاصل کر رہا ہے' وجہ اللہ کو نصب العین بنانے والوں کی یہ عروجی کوشش جس انجام کو کوشش کرنے والوں کے سامنے لائے گی' کیا وہی انجام ان لوگوں کے سامنے جو التذاذی احساسات کی تسکین و تشفی بخشنے والوں کی فراہمی کو اپنے وجود کا آخر مقصود و منشاء ٹھہرا کر خود بھی ان ہی میں دھنستے چلے جا رہے ہیں کہ انسانی توانائیوں کا سارا ظاہری و باطنی' اندرونی و بیرونی سرمایہ رنگ و بو کے چند فانی مظاہر اور ہوائی ارتعاشات کی چند الٹی سیدھی' پست و بلند لغزشوں میں دھنس دھنسا کر ختم ہو جائے۔

بہرحال تعبیر خواہ کچھ بھی اختیار کی جائے اور نام اس کا جو کچھ بھی رکھ دیا جائے لیکن ''معیار زندگی کے ارتفاع و برتری'' کے اس بلند بانگ دعوے کا صحیح منطقی تجربہ زیب و زینت کی ان چند چیزوں کے سوا آپ کو اور کچھ نہ دے گا' جن سے تھوڑی دیر کے لئے ہمارے احساسات کو لذت ملتی ہے یا مل سکتی ہے۔ نہ سوچنے کی اور بات ہے اور سچ تو یہ ہے کہ انسانی زندگی میں

---

❶ تفصیل قصہ کی مثنوی شریف میں پڑھیئے۔ حاصل یہ ہے کہ جس عضو کے بنانے کے واسطے گودنے والا سوئی چبھوتا تو پہلوان چلا اٹھتا اور کہتا کہ بغیر اس کے کیا شیر کی تصویر نہیں بن سکتی؟ گودنے والے نے سوئی پٹک کر آخر میں کہا ''شیر بے دم و سر و شکم دید۔ ایں چنین شیرے خدا ہم نافرید۔''

''برتری و بلندی'' کے اس پست ترین اضافی نصب العین کو شریک کرنے کے بعد ''یزداں بکمند آور'' کی ہمت مردانہ زیبائش و آرائش جذبہ زنانہ میں تحلیل ہو جانے کے سوا یقین مانئے کہ آئندہ کی ہر توقع، حال کی ہر جنت کو جہنم ہی بناتی چلی جائے گی۔ جمہوریت کی بہشت اشتراکی حدود میں پہنچ کر جیسے آج جہنم کے نام سے رسوا ہو رہی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ رسوائی کے اسی دردناک انجام سے کل اشتراکیت کو بھی دوچار ہونا نہ پڑے گا؟

کن لوگوں سے بچا جائے:

اور جانے بھی دیجئے، بذات خود جن خطرناک نتائج کو عہد جدید کا یہ دجالی نصب العین اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، آپ کی نظر اگر وہاں تک نہیں پہنچ سکتی اور نقلی غلاف ان پر جو چڑھائے گئے ہیں، ان کو آپ پھاڑ نہیں سکتے، تعبیری ملمع کاریوں کی سطحی چمک دمک سے آپ کی نگاہیں خیرہ ہو رہی ہیں اس لئے خود ''قول'' کی تنقید کی آپ میں جرات باقی نہیں رہی ہے تو آیئے قرآن بجائے ''قول'' کے آپ کے سامنے دیکھئے اس کے ''قائل'' ہی کو پکڑے لئے کھڑا ہوا ہے۔ پڑھئے اگر آپ پڑھ سکتے ہیں ''لا تطع'' (یعنی مت ماننا ان لوگوں کی باتوں کو) اس امتناعی حکم کو صادر کرتے ہوئے آگے جو فرمایا گیا ہے، اور اسی پر یہ مضمون ختم ہوا ہے، یعنی

مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔

''جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ہے اور وہ پیچھے چل پڑا اپنی ''ہوا'' کے اور کام ہے اس کا ''فرط'' (غیر متوازن بے ڈھنگا)

معیار زندگی کی بلندی و برتری کا صور انسانی آبادیوں میں آج جو پھونک رہے ہیں اور اسی کا شور دنیا میں مچائے ہوئے ہیں، ان کی پیشانی کی یہ قرآنی لکیریں کیا ایسی لکیریں ہیں جن کے لئے کچھ زیادہ غور و تامل کی ضرورت ہے۔ وہ جو بھی ہوں اور جہاں بھی کھڑے ہوں ان کے تمام خصوصیات میں شاید سب سے نمایاں یہی خصوصیتیں ہیں جنہیں ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے اور ان ہی قرآنی الفاظ سے ان کو پہچان سکتا ہے۔

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ حدیثوں میں جیسے ''المسیح الدجال'' کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ک، ف،

ز'' کفراس کی پیشانی کی ایسی نمایاں خصوصیت ہوگی جسے پڑھنے والے اوران پڑھ دونوں ہی پڑھ لیں گے کچھ یہی حال ان الفاظ کا نظر آتا ہے جنہیں پڑھنے والے اوران پڑھ دونوں ہی اس قول کے قائلین کی پیشانیوں میں چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں۔

دیکھئے یہ فقرہ تین اجزاء پر مشتمل ہے اور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر پچھلا جز پہلے جز کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔

مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا۔

''جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا''

یہ اس فقرے کا پہلا جز ہے۔ ارادی طغیانیوں اور اختیار واقتدار کی بدمستیوں کے عذاب کی یہ عام قرآنی تعبیر ہے۔ ان مجرموں کو پہلی سزا قدرت کی طرف سے یہی ملتی ہے کہ زندگی کے بنیادی حقائق کی تلاش وجستجو کا جو احساس انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے وہی احساس بتدریج معطل ومفلوج ہوتے ہوئے تباہی کے ان حدود تک پہنچ جاتا ہے جن کے مختلف مدارج کو قرآن ختم' درین' غشاوۃ' ضلال' اغفال کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ قرآن میں انسانی نفسیات کے جو مسائل ہیں ان میں ذہنی اور فکری سزاؤں کی ان شکلوں اور ان کے باہمی امتیازات کو خاص اہمیت حاصل ہے جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

بہرحال سزایابی کی اس نفسیاتی گرفت کا لازمی نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ جینے کا جو دستور بھی ذہنی عذاب کی اس حالت میں بنانے والے بنائیں گے اس کا زندگی کے بنیادی حقائق سے کوئی تعلق نہ ہوگا جیسا کہ معلوم ہے۔ عربی زبان میں اسی قسم کے بے بنیاد' بادر ہوا' من مانی باتوں کو ''ھوی'' کہتے ہیں۔ فقرہ بالا کے دوسرے جز:

وَاتَّبَعَ هَوٰهُ۔

''اور پیچھے چل پڑا وہ اپنی ''ھویٰ'' کے''

کے الفاظ سے اسی لازمی نتیجہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آخر میں اس مسکین مسافر کے پروگرام کا نام آپ کیا رکھیں گے جو سفر کی ان ساری باتوں سے یعنی کہاں سے آرہا ہے' کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے؟ ان سب سے ناواقف بھی ہو' لیکن باوجود اس کے یہ بھی سمجھ رہا ہو کہ

کسی باضابطہ پروگرام کے تحت اپنے سفر کو وہ پورا کر رہا ہے اول اور آخر کے اوراق جس کتاب کے پھاڑ دیئے گئے ہوں' ایسی کتاب کا جو مطلب بھی بیان کیا جائے گا' ایسا مطلب بیان کرنے والے کے من گھڑت' خودتراشیدہ خیالات کے سوااور بھی کچھ ہوسکتا ہے؟

تیسرا جز فقرہ کا:

وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔

''اور ہے کام اس کا ''فرط''

ہر وہ بات یا چیز جو اپنی قدرتی حدومقدار سے ہٹ گئی ہو یا بالفاظ دیگر ہر بے ڈھنگے' غیر متوازن امر کو عربی میں ''فــر ط'' کہتے ہیں اور جب بنیاد سے الگ ہوکر ''ہوائی ضابطہ'' کے تحت زندگی گزاری جائے گی تو یقین مانئے کہ اس کا انجام فرط اور غیر متوازن ہی شکل میں سامنے آئے گا' آج دنیا افراط وتفریط کے ان ہی ہچکولوں میں جھول رہی ہے۔

''معیار زندگی کی برتری'' کے نصب العین والوں ہی کو دیکھئے! سرمایہ داری کے خبط میں فیصلہ کیا گیا کہ ایک امیر کے لیے سارے غرباء کو مرنا پڑے تو ان کو مر جانا چاہئے۔ اور اشتراکیت کا بھوت جب سوار ہوا ہے تو اب دھمکایا جا رہا ہے کہ ایک غریب کے لئے سارے امیروں کو غریب بنا دیا جائے گا۔ اور عدم توازن یا فرطیت کی یہ کیفیت زندگی کے کسی ایک شعبہ ہی کے ساتھ مختص نہیں ہے' بلکہ جس راہ میں بھی ان کا قدم ''ہوائی دستور'' کے زیر اثر اٹھا ہے' قرآن کی بیان کی ہوئی صفت ''فــر ط'' کی خصوصیتوں ہی کے ساتھ اٹھا ہے۔ ضخیم کتاب بن جائے گی اگر فرط کے لفظ کی تفسیر کو واقعات کی روشنی میں کوئی سمجھانا چاہے گا' لیکن اب مزید گنجائش کم از کم اس مضمون میں زیادہ تفصیل کی میرے لئے باقی نہیں رہی۔

جن خاص حالات میں کہفی زندگی ایمان وعمل صالح کو بچا لینے کا واحد ذریعہ بن کر رہ جاتی ہے اب تک اسی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے ہم سورۂ کہف کی اس آیت تک پہنچے ہیں جس میں ''الحیوۃ الدنیا'' وپست زندگی کی زینت کو مراد ومقصود بنا کر جینے والوں کو ان نشانیوں اور علامتوں سے شناخت کراتے ہوئے یعنی ان کے دلوں کو اپنی یاد سے ان کا پروردگار غافل بنا دیتا ہے' وہ اپنی حرص وہوا کی اقتضاؤں کے پیچھے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں' ان کے

سارے کام حدود سے متجاوز اور فرط ہوتے ہیں۔ شناخت کی یہ علامتیں اور نشانیاں جن میں پائی جاتی ہیں ان کے متعلق ایک تو منفی حکم "لاتطع" (مت اطاعت کرنا ان کی) کا دیا گیا تھا، جس پر بحث کر چکا ہوں۔ حاصل یہی ہے کہ ان ہی کو دیکھ کر قدم اٹھانا اور زندگی کے ہر پہلو میں ان ہی کے عملی نمونوں اور عملی مشوروں کی طرف تاکتے اور جھانکتے رہنا، اس کی ممانعت فرمائی گئی ہے ایمانی وفاداریوں کے ساتھ جو جینا اور ان ہی پر مرنا چاہتے ہیں چاہیے کہ ان قرآنی علامتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں اور شائستہ و متمدن اقوام، مہذب و تعلیم یافتہ نسلوں یا ازیں قبیل جس قسم کی بھی خوشگوار تعبیروں، طمطراق عنوانوں سے روشناس کراتے ہوئے بلانے والے ان کی طرف کیوں نہ بلا رہے ہوں، لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن کی بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق ان کا واقعی حال کیا ہے اگر یہ نشانیاں ان میں پائی جاتی ہیں تو "مومن" کا فرض ہے کہ "لاتطع" (مت اطاعت کرنا اس کی) کے ربانی فرمان پر عزم و ارادے کی پوری قوت کے ساتھ ڈٹ جائے اور جب تک ان کی خواہشوں پر مذکورہ بالا سہ گانہ قرآنی علامتوں کے داغ اور دھبے نظر آ رہے ہوں ان کی اطاعت سے چاہیے کہ "مومن" بھاگتا ہی چلا جائے۔

تبلیغ حق خواہ کوئی مانے یا نہ مانے:

مگر پرہیز و گریز ہی کی حد تک کا فرض اس سلسلہ میں کیا اسی نقطہ تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے؟ واقعہ تو یہی ہے اور تجربہ و مشاہدہ یہی بتا رہا ہے کہ "پرہیز و گریز" کے اس عزم پر بھی ٹانگوں کا ٹھہرنا آسان نہیں ہے، بجز خاص خاص سعید اور توفیق یافتہ روحوں کے "لاتطع" (مت اطاعت کرنا) اس قرآنی حکم کی تعمیل میں صحیح معنوں میں شاید ہی کوئی کامیاب نظر آئے۔

لیکن کیا کیجئے کہ مومن کا وجود خواہ کیسی ہی کڑی اور کٹھن گھڑیاں ہوں، لازمی وجود بن کر نہیں رہ سکتا، لازمی سے میری مراد ہے کہ اپنی ذات کی حد تک منافع کو محدود رکھنا ایمان کی شان ہی یہ نہیں ہے۔ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی کھینچنا ایمانی بیعت کا بڑا اہم اقتضاء ہے۔ اب آگے قرآن کو پڑھئے اطاعت کے منفی و سلبی حکم کے بعد:

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ.

''کہہ! جو حق ہے تمہارے پالنے والے کی طرف سے۔''

جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حالات کیسے ہی گزر رہے ہوں اور کچھ بھی ہو رہا ہو' لیکن بہرحال اور زندگی کی جو حقیقی سچائیاں ہیں ان کا اعلان بھی کئے چلا ہی جانا چاہیے۔ تقریر سے ہو یا تحریر سے یا قول کا جو بھی ذریعہ ہو مومن مکلف ہے کہ وہ ان سچائیوں اور صداقتوں کو دہراتا رہے مگر اس تبلیغی فرض کا مکلف بناتے ہوئے خلاف دستور قرآن میں اسی کے بعد:

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ.

''پھر جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے (نہ مانے) انکار کر دے۔''

کے الفاظ جو پائے جاتے ہیں' ان سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حق کے مبلغ اور پہنچانے والے کو خواہ مخواہ اس کی امید نہ لگانی چاہئے کہ دنیا جن نفسیاتی حالات سے گزر رہی ہے ان میں میری بات سن ہی لی جائے گی۔ گویا اس عہد میں صرف پہنچا دینا ''الحق'' کا کہہ دینا یہی بڑا کام ہے شاید اس خاص موقع پر یہ اضافہ اسی لئے کیا گیا ہے کہ اپنی ناکام اور نامرادی کو دیکھ کر جھنجھلانے اور مایوس ہو کر بیٹھ رہنے کی کیفیت ان لوگ میں پیدا نہ ہو جو حق کے پہنچانے کا کام ان نازک و ناساز گار اور بدترین ناموافق حالات میں انجام دیتے ہیں۔ [1]

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ کہفی زندگی کی ضرورت جن حالات میں پیش آتی ہے' ان حالات کی پیدائش کے اسباب' ان کے نتائج و عواقب پھر خود کہفی زندگی کے لوازم و آثار' اس زندگی کے فرائض و واجبات' یہ اور اسی قسم کے تمام سوالات جن کا کہفی زندگی سے تعلق ہو سکتا تھا' اگر سوچا جائے تو بقدر ضرورت ان باتوں کے جوابوں کو ہم ان آیتوں میں پا سکتے ہیں' جن پر اب تک

[1] فعلیك بخویصة نفسك۔ (خود اپنی خبر تجھے لینی چاہئے) بعض حدیثوں میں خاص حالات کے ذکر کے بعد جو اس کا حکم دیا گیا ہے یا قرآن میں ''علیکم انفسکم لا یضر کم من ضل اذا اهدیتم'' (تمہیں اپنی نگرانی کرنی چاہئے' جو گمراہ ہوا' وہ تمہیں نقصان نہ پہنچائے گا اگر تم خود ہدایت یافتہ ہو) کا حکم جو پایا جاتا ہے ان سب کا یہی مطلب ہے کہ کامیابی کے لحاظ سے اس زمانے میں دوسروں کو دیکھنے کی ضرورت نہیں' اگر آدمی خود کامیاب ہو جائے تو یہی غنیمت ہے۔ باقی قل الحق یعنی حق کو دوسروں تک پہنچانا اس حد تک تبلیغ کا حکم کسی خاص زمانے کی حد تک محدود نہیں ہے

بحث ہو چکی ہے۔ اسی لئے اب تک یہ التزام کیا گیا تھا کہ ایک ایک آیت کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے والوں کے آگے پیش کر دیا جائے۔ اسی التزام کی وجہ سے مضمون میں کافی طوالت پیدا ہو گئی۔ لوگ ایک حد تک اکتا بھی چکے ہیں لیکن جس غرض سے یہ تذکیری سلسلہ قلم بند کیا گیا ہے، وہ غرض کم از کم لکھنے والے کا خیال یہی ہے کہ بغیر اس طوالت کے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ مشکل یہ ہے کہ قرآن فہمی کے سلسلے میں مسلمان عموماً اس کے عادی بنا دیئے گئے ہیں کہ قرآنی آیتوں کی تلاوت کے بعد ان آیتوں کو تو وہیں چھوڑ دیا جاتا ہے اور قرآنی روایات وقصص کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس مضمون میں بالکل اس عام طریقہ کے برخلاف چونکہ صرف قرآنی آیتوں ہی کی حد تک عموماً محدود رہنے کی کوشش کی گئی ہے ممکن ہے کہ یہ بھی باعث گرانی بعض لوگوں کے لئے ثابت ہوا ہو۔ میں ان سے معافی کا خواستگار ہوں اور اب میں انہیں اس کی خوشخبری سناتا ہوں کہ قرآن کی ایک ایک آیت اور اس کے ایک ایک لفظ پر غور وفکر کا باران پر نہ ڈالا جائے گا کیونکہ مقصد پورا ہو چکا ہے جہاں تک میرا خیال ہے آئندہ سورۃ کہف میں بعض ذیلی سوالوں کا جواب دیا گیا ہے جن کے لئے ایک اجمالی مضمون کافی ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ پڑھنے والے قرآن سے اجمالی مضمون کا مقابلہ بھی کرتے چلے جائیں۔

"الحق" کو پہنچانا چاہئے، ماننے اور نہ ماننے کے خیال سے بے تعلق ہو کر پہنچانے کے لئے پہنچانا چاہیے، کہفی زندگی کے اس آخری وایجابی حکم کے بعد قرآن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نہ ماننے والے ظاہر ہے کہ اپنے "فرطی" یعنی حدود سے متجاوز کاروبار کی وجہ سے ظلم کے مرتکب ہوں گے، کیونکہ ظلم نام ہی ہے قدرت کے نشان زدہ حدود سے ہٹ جانے کا جس کے بعد ظالم کا قدرت اور اس کے مقررہ قوانین سے ٹکراتے ہوئے زندگی بسر کرنا ناگزیر ہے۔

اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ دوسری زندگی میں ظالموں کا یہ طبقہ پائے گا کہ اس کے ہر احساس سے اور اس کی ہر خواہش سے قدرت اور اس کے قوانین متصادم ہیں۔ ظلم کی زندگی کے اس قدرتی نتیجہ کے قالب کا نام قرآن کی زبان میں جھنم، النار وغیرہ ہے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں۔

ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے قرآن ظالمانہ زندگی کے اس نتیجہ سے مسلسل چونکاتا چلا گیا ہے

یہاں بھی حسب دستور اس نتیجہ کا اظہار ''النـــار'' (آگ) کے لفظ سے کیا گیا ہے۔ اتنی بات تو عام ہے لیکن اسی کے ساتھ اس خاص موقع پر ایک نئی چیز بھی 'النـــار' کے ذکر کے بعد ملتی ہے جو اس مقام کے سوا اور قرآن میں کہیں نہیں ملتی۔ کہتے ہیں سـرادق کا یہ لفظ خاص عربی لفظ بھی نہیں ہے بلکہ فارسی میں سراپردہ کا جو لفظ ہے اسی کی یہ معرب شکل ہے۔ بڑی بڑی ڈیوڑھیوں اور شاہی ایوانات کے داخلہ کے ابتدائی پھاٹک پر بہت بڑا پردہ جو پڑا رہتا ہے اس کو فارسی میں سراپردہ کہتے ہیں۔

پس سـرادق النـار یعنی جہنم کے سراپردہ کا مطلب یہی ہے یا ہوسکتا ہے کہ جہنم بذات خود تو نہیں لیکن جہنم سے اسی قسم کا تعلق رکھنے والی چیز جو ڈیوڑھیوں اور شاہی ایوانوں سے داخلہ کی پھاٹک کے سراپردہ کی ہوتی ہے' کچھ اسی قسم کی کوئی شے جہنم کا سرادق یا سراپردہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ ظلم کی زندگی بسر کرنے والوں کے لئے دوسری زندگی میں جہنم تو خیر تیار ہی ہے لیکن دوسری زندگی سے پہلے قرآن نے خبر دی ہے کہ جن ظالموں کا ذکر اوپر گزرا یعنی وہی جن کی شناخت سہ گانہ علامتوں سے کرائی گئی تھی' ان کو جہنم کا یہی سراپردہ گھیر چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے سامنے نہ جہنم ہے اور نہ جہنم کا سراپردہ پھر قرآن کی اس خبر کی تصدیق کی شکل اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کو بھی علامتوں اور نشانیوں ہی سے پہچانا جائے۔ قرآن نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک خاص بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اپنے لفظوں میں ہم اگر سمجھنا چاہیں تو اسے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اپنی آرزو اور خواہش کے مطابق یہ دیکھو کہ قدرت کی طرف سے ان کو کیا مل رہا ہے؟ اگر یہ نظر آتا ہو کہ مانگ رہے ہوں وہ پانی اور مل رہا ہو پانی کی جگہ کھولتا ہوا پگھلا ہوا تانبا تو جب یہ ہونے لگے اسی وقت سمجھ لینا چاہئے کہ جہنم کا سراپردہ ان پر چھوڑ دیا گیا اور اس کے احاطے میں وہ داخل ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پانی کی آرزو اور خواہش تو ایک مثال ہے۔ مقصد وہی ہے کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں قدرت کی طرف سے واقعات کا ظہور اس کے خلاف ہونے لگے وہ امن کے آرزو مند ہوں تو جنگ کے شعلے بھڑکنے لگیں' ارزانی پیدا کرنا چاہیں تو گرانی بڑھنے لگے' وہ چاہتے ہوں کہ زندگی کی ضرورتوں کی بڑی سے بڑی مقدار مہیا کی جائے لیکن دیکھا یہ جا رہا ہو کہ عوام تو عوام ان کے خواص بھی معمولی ضرورتوں کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ امیروں اور

دولت مندوں کو بھی روزانہ ایک انڈا یا پاؤ بھر گوشت تک مہیا کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہو۔ یہی **سرادق النار** (جہنم کے سراپردہ) کے احاطے میں داخل ہو جانے کی علامت ہے۔ جو کچھ دکھلایا جا رہا ہے اسے دیکھئے اور سمجھے کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

یہ تو حق کے نہ ماننے والوں کا انجام تھا لیکن حق کو قبول کر کے جو زندگی گزاریں گے یا گزار رہے ہیں جیسا کہ گزر چکا کہ **الحیوۃ الدنیا** میں زینت کے استعمال سے ان کو منع تو نہیں کیا گیا ہے لیکن آرائش و زیبائش' آرام و آسائش کی ان ہی چیزوں کو مراد بنا کر اپنے وجود کا واحد نصب العین ان ہی کے حصول کو بنا لینا' ظاہر ہے کہ ایمانی زندگی میں اس نصب العین کی گنجائش نہیں ہے۔ سوال یہی ہوتا ہے کہ مومن اس نصب العین سے دست بردار ہونے کا صلہ کیا پائے گا؟ اس کے جواب میں یہ فرماتے ہوئے کہ ایمان اور اسی کے مطابق حسن عمل کو قدرت ضائع نہیں ہونے دے گی اور زینت کے نصب العین سے زندگی کے موجودہ عبوری دور میں دست بردار ہونے والے آخرت کی دوامی زندگی میں **عدن** (مسرت) والے باغوں کو پائیں گے جن کی شادابی و سیرابی' تازگی و بالیدگی کو مسلسل ہمیشہ بہنے والی نہروں سے باقی رکھا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زندگی کو حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بسر کرنے کی کوشش کرنے والے خدا اور اس کے سارے قوانین کو اپنی مرضی کے مطابق جس ماحول میں پائیں اسی کا نام جب "**الجنة**" اور جنت کی زندگی ہے' تو زیب و زینت کا کون سا درجہ ایسا ہو گا جس سے استفادہ کا دروازہ اپنے اوپر جنت والے نہ کھلا پائیں گے۔ یقیناً یہاں زینت کے بعض مظاہر سے متمتع ہونے کا موقع اگر نہ بھی ملے تو الآخرۃ میں ان سے کہیں زیادہ بہترین قالب اور شکلوں میں جن کا ہم آج تصور بھی نہیں کر سکتے' زیبائش و آرائش' آرام و آسائش کی چیزیں ان کے سامنے آئیں گی۔ اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ زیب و زینت کے بعض مظاہر کا جنت کی زندگی کے متعلق جو ذکر کیا گیا ہے اگر غور کیا جائے تو زندگی کی ناگزیر ضرورتوں کے بعد جن چیزوں میں زینت کو ہم نمایاں کرتے ہیں سب ہی پر زینت کے یہ جنتی مظاہر حاوی نظر آ سکتے ہیں۔ ❶

---

❶ مطلب یہ ہے کہ ضروریات حیات میں خرچ کرنے کے بعد بھی دنیا میں لوگوں کے پاس زائد سرمایہ باقی رہ جاتا ہے تو پھر مکان' سواری فرش و فروش جیسی چیزوں کی آرائش میں اس زائد سرمایہ (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

اسی طرح قدرتاً ایک ذیلی سوال یہ بھی پیدا ہوتا کہ الحیوۃ الدنیا کی زینت مراد بنا کر جینے والوں میں یہ ذہنیت جسے قرآن نے ان کی طرف منسوب کیا ہے یعنی اپنے پالنے والے پروردگار کی یاد سے ان کے دلوں میں غفلت کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ جسے سب سے زیادہ یاد رکھنا چاہئے اس کو کیوں بھول جاتے اور نتیجتاً حرص وہوس کی پیروی کی بیماری میں مبتلا ہو کر زندگی کے طبعی نظام میں افراط وتفریط کی کیفیت کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟

دو مثالی شخصیتوں کی تمثیل:

جہاں تک میرا خیال ہے آگے دو مثالی آدمیوں کا قصہ جو اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے اس میں اسی سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ مومن اور غیر مومن کی دو صفیں ان حالات میں جو قائم ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں کے طبقاتی خصوصیات کو سمجھانے کے لئے دو آدمیوں کا حال بیان کرو' جن میں سے ایک شخص کے متعلق کہا گیا ہے کہ انگور کے دو باغوں کا مالک حق تعالیٰ نے اس کو بنا دیا تھا اور ان دو تاکستانوں یعنی انگوری باغوں کو کھجور کے درختوں سے گھیر دیا گیا تھا' گویا

(گزشتہ سے پیوستہ) کو صرف کرتے ہیں' یعنی رہنے سہنے برتنے کی چیزوں میں جمال پسندی کے شوق کو نمایاں کیا جاتا ہے یا پھر لباس یعنی بدن کے ساتھ انسانی تعلق جن چیزوں کا ہوتا ہے ان کی تحسین سے اس جذبہ کی تسکین کا سامان لوگ مہیا کرتے ہیں۔ سورۃ کہف میں اس خاص مقام پر جنتی زندگی کے تذکرہ کے سلسلہ میں یہ اضافہ جو کیا گیا ہے کہ "سندس و استبرق" کے سبز جوڑے ہیں "ارائك" چھپر کھٹوں پر جنت والے چین کریں گے۔ ظاہر ہے کہ مظاہر زینت کے ان دونوں قسموں ہی کے تو یہ نمونے ہیں۔ آدمی حسن و جمال کو ان امور کے سوا اپنے اعضاء دست و پا' چشم و آبرو' خدوخال میں بھی پسند کرتا ہے' اسی مقام پر دیکھئے۔ حلوا اساور من ذهب (آراستہ کئے جائیں گے سونے کے اساور) اس اساور کا ترجمہ لوگ کنگن کر کے گزر جاتے ہیں۔ حالانکہ بقول راغب اصفہانی اصلاً یہ لفظ عربی کا ہے بھی نہیں' ثانیاً جیسے سونے کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ ان ہی اساور کو فضه (چاندی) اور کسی کو لؤلؤ (موتی) کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے جیسا کہ قواریر من فضة (سیسے ہوں گے چاندی کے) سے سمجھا ہے کہ جنت میں تیسرا عنصر ہوگا جس میں شیشے کی شفافیت اور چاندی کی سی چمک دمک جمع ہو جائے گی۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے ان اساور میں بھی سونے' چاندی' موتی کی مجموعی خوبیاں اکٹھی ہوں گی اور ان کے استعمال سے اعضاء کے حسن و جمال میں جو اضافہ ہوگا اسی کی طرف جو لکھا گیا ہے وضو والی حدیثوں میں بھی ہے کہ خاص قسم کی چمک ان اعضاء میں نمایاں ہوگی جو وضو میں دھوئے جاتے ہیں جس کی تعبیر غرًا محجلین کے الفاظ میں کی گئی ہے۔ ۱۲

ان تاکستانوں کی باڑ بھی بجائے خاردار جنگلی درختوں کے ایسے درختوں سے تیار کی گئی تھی جو خود بھی پھل لانے والے درخت تھے۔ پھر ان دونوں باغوں کے متعلق یہ بھی خبر دی گئی ہے کہ ان دونوں کے بیچ میں قدرت کی طرف سے نہر بھی جاری کی گئی تھی' باغ کی سیرابی و آبیاری کی ضمانت کی طرف جس سے اشارہ کیا گیا ہے۔ ایسے دو باغ جن کے بیچ میں قدرتی چشمہ پھوٹ پڑا ہے اس کی خشکی اور بے ثمری کا بھلا کیا اندیشہ ہوسکتا ہے؟ نیز ان ہی باغوں کے درمیان کھیتی بھی تھی اور باغ ہو یا کھیت پیداوار میں کوئی کم نہ تھا۔ اسی کے ساتھ و کان لہ ثمر کے تلفظ میں قراۃ کا اختلاف ہے' بہر حال مستند اہل لغت کے حوالہ سے امام رازیؒ وغیرہ مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ان باغوں کے سوا زر و نقرہ کے مسکوک و غیر مسکوک ذخیرے کا بھی مالک تھا۔ الغرض کافی مال و دولت کا بھی مالک علاوہ کھیتوں اور باغوں کے تھا' جن کی آمدنی ممکنہ خطرات سے محفوظ تھی۔ اس کی ان خصوصیات کا تذکرہ کرنے کے بعد بیان کیا گیا ہے کہ ایمانی صف کے ایک آدمی سے یہی باغ اور مال و دولت والا گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میں دولت میں بھی تم سے بڑھا ہوا ہوں اور میرے ساتھ جو لوگ ہیں اور جس طبقہ سے ہمارا تعلق ہے وہ عزت و جاہ میں بھی تم سے کہیں زیادہ و بلند و برتر ہیں۔ قرآن میں وھو ظالم لنفسہ کے الفاظ اسی باغ والے دولت مند کی طرف منسوب کئے گئے ہیں جس کا مطلب یہی ہوا کہ قدرتی طبعی مقام سے اپنے آپ کو وہ ہٹائے ہوئے تھا۔ بظاہر اس سے یہی کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ باغ اور اس کی تروتازگی' بارآوری اور دولت و ثروت کا جو ذخیرہ اس کے پاس تھا اور انسانوں کی جو جماعت اس کے ساتھ جمع ہوگئی تھی ان ساری باتوں کو بجائے حق تعالیٰ کے فضل و کرم کے اپنی جسمانی و دماغی کوششوں کا نتیجہ قرار دیتا تھا۔

شرک کی جدید قسم:

اس سارے قصے میں قرآن کے یہی الفاظ خاص طور پر مستحق توجہ ہیں۔ آگے اسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا وہ منکر نہ تھا اور رب کے نام سے خدا کو موسوم کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا قرآن میں اس کی طرف ''شرک'' کے عقیدے کو منسوب کیا گیا ہے۔

حالانکہ اس پورے قصے میں اس کے کسی مشرکانہ فعل بت پرستی وغیرہ کا ذکر نہ صراحتہً ملتا ہے اور نہ اشارتاً جہاں تک میرا خیال ہے جس شرک کو اس کی طرف قرآن نے منسوب کیا ہے وہ بت پرستی والا شرک نہیں ہے' بلکہ ہم شرک کی اس شکل کو ان لوگوں میں دیکھ سکتے ہیں جو خدا کے منکر بھی نہیں ہوتے۔ یعنی یہ بات کہ'' عالم کو خدا نے پیدا کیا ہے'' اس کا انکار نہیں کرتے مگر اسی کے ساتھ کہتے ہیں کہ اپنی قسمت کے ہم خود'' بلڈر'' اور معمار ہیں۔ گویا خلق و پیدائش کی حد تک خدا کی ضرورت ان کے نزدیک ختم ہو جاتی ہے۔ آگے کائنات اور اس کے قوانین ہیں جن کے ساتھ انسان کشمکش میں مصروف ہے۔ اس کش مکش میں کامیاب ہونے کے لئے خدائی امداد سے اپنے آپ کو مستغنی خیال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خدا کے ساتھ شریک کرنے کی یقیناً یہ ایک مستقل اور شاید بدترین شکل ہو سکتی ہے۔ جس زمانے سے ہم گزر رہے ہیں اس میں شرک کی دقیانوسی شکل جس کی بنیاد اوہام پر قائم تھی یعنی بت پرستی والے شرک سے زیادہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شرک کی یہی جدید شکل عام ذہنیتوں پر مسلط ہے بجائے اوہام کے اس کو حکمت و دانش کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے گویا پرانے شرک کے مقابلہ میں شرک کی یہ ایک سائنٹفک قسم ہے۔ اس نوعیت کی مشرکانہ ذہنیت کے جو شکار ہیں لوگ ان کو کہتے ہیں کہ وہ ملحد اور دہریے ہیں۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ خدا کے وہ منکر ہیں۔ حالانکہ بجائے انکار کے ان کی ذہنیت کی صحیح تعبیر'' اغفال قلب عن ذکر الله '' ہی ہو سکتی ہے یعنی منکر نہیں بلکہ خالق تعالیٰ کی یاد سے ان کے دلوں کو غافل بنا دیا گیا ہے۔

بہر حال اپنے متعلق اسی ظالمانہ احساس کے ساتھ یعنی یہ جو کچھ بھی ہے سب میری کدوکاوش' میری عقل و دانش' غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اسی احساس کے ساتھ قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ باغ میں داخل ہوا اور جن سائنٹفک بنیادوں پر اپنے معاشی نظام کو اپنے خیال کے مطابق اس نے قائم کیا تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا میں خیال کرتا ہوں کہ یہ نظام میں نے جو قائم کیا ہے لازوال ہے۔ ما اظن ان تبید هذه ابدا کے دعویٰ کا جو حاصل ہے۔ یہ خیال کہ یہاں کی ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ ختم ہو جاتی ہے بظاہر اسی عام عقیدے کا الساعة (مقررہ وقت) کے لفظ سے ذکر کر کے اس نے یہ بھی کہا کہ اس مقررہ وقت کا خطرہ میں خیال کرتا

ہوں کہ میرے قائم کردہ معاشی نظام کے ساتھ پیش نہ آئے گا۔

جس کی وجہ وہی تھی کہ ان حکیمانہ اصول وضوابط پر اس کو اعتماد تھا جن پر اپنے نزدیک اس نے معاشی نظام کی بنیاد قائم کی تھی۔ آخر میں اپنی اسی سائنٹفک مشرکانہ ذہنیت کا مظاہرہ اس نے ان الفاظ میں کیا کہ وہ مقررہ گھڑی اس نظام پر کبھی آ گئی تو اپنے مخاطب مردمومن کو خطاب کر کے اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس انقلابی عہد میں بھی تم سے بہر حال بہتر اور اچھا ہی رہوں گا۔ مطلب اس کا یہی ہوسکتا ہے کہ جس دل ودماغ، عقل وفراست، محنت وسعی کے بل بوتے پر اس معاشی نظام کو قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہوں جب کامیابی کے یہی سارے ساز وسامان میرے ساتھ ہوں گے تو انقلاب کے اس طوفان میں بھی ان ہی حکیمانہ کارروائیوں سے کام لوں گا اور تمہاری یہ تسبیح وتہلیل، نماز وروزہ، جیسے آج تم کو میرے مقابلے میں آگے نہ بڑھا سکے، اس انقلابی عہد میں بھی یہی ہوگا آگے نہ بڑھا سکیں گے۔ اس کے الفاظ ''لا جدن خیر امنھا منقلبا'' کا مفاد بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے بلکہ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ منقلب یا انقلابی عہد میں موجودہ حالت سے بھی زیادہ بہتر رہوں گا جس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ مشق وتجربہ میں جب زیادہ حذاقت اور پختگی ہو جائے گی تو اپنی عقل وفراست سے زیادہ بہتر کام لے سکوں گا۔

قرآن میں اس کے بعد مردمومن کی جوابی تقریر نقل کی گئی ہے جس میں سب سے پہلے اغفال قلب کی سزا بھگتنے والے شرک کی اس نئی قسم کے شکار انسان کو مخاطب کر کے سب سے پہلے اس کا خالق اور پیدا کرنے والا یاد دلایا گیا ہے جسے وہ بھلائے ہوئے تھا۔ مردمومن نے کہا کہ گرد اور دھول سے نکلنے والی غذاؤں سے جس کی قدرت سے نطفہ تیار ہوا اور اسی نطفہ کو تیری شکل میں ترقی دے کر تجھے جس نے آدمی بنایا اس کی ناشکری تو کیوں کرتا ہے؟ اور یہ کہتے ہوئے بھائی تیرے جی میں جو آئے سوچ اور جو جی میں آئے کر لیکن میں تو اپنے خدا کو بھلا نہیں سکتا اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرا سکتا۔ پھر جس مغالطے میں مبتلا ہو کر شرک کی جس نئی لعنت میں وہ گرفتار تھا، اسی مغالطے پر تنبیہ کرتے ہوئے مردمومن نے ایک عجیب سبق دیا۔ کہتے ہوئے کہ باغ جس پر تجھے ناز ہے اس میں داخل ہو کر تجھے سوچنا چاہئے کہ باغ، باغ کی زمین، پانی

جس سے وہ سیراب ہوتا ہے' اس کے درخت کے بیج سے نکلنے والی شاخیں' پھل' پھول ان میں سے کوئی ایسی چیز ہے جسے تو نے وجود بخشا اور پیدا کیا ہے؟ یقیناً یہ سب کچھ اسی کی مشیت اور ارادے کے مظاہر ہیں جس نے عالم کے اس نظام کو پیدا کیا ہے۔ باقی تجھے اپنی عقل وفراست سمجھ بوجھ اپنی محنت ومشقت اور سعی وکوشش کی قوتوں کے متعلق جو یہ خیال ہے کہ ان ہی کی مدد سے ان قدرتی پیداواروں کی تنظیم میں تو کامیاب ہوا ہے تو اسی کے ساتھ تجھے یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ تجھ میں یہ قوتیں کہاں سے پیدا ہوئی ہیں؟ یقیناً اپنے اندر ان قوتوں کو تو نے خود نہیں بھرا ہے بلکہ یہ ساری توانائیاں تجھ میں وہیں سے آئی ہیں جو کائنات کی ساری قوتوں اور طاقتوں کا سرچشمہ ہے مرد مومن کے الفاظ:

وَلَوْ لَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

''اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب داخل ہوا تو اپنے باغ میں تو کہتا کہ سب اللہ کا چاہا ہوا ہے (اور جن قوتوں سے باغ کی تنظیم ہوئی) نہیں ہے کوئی قوت مگر اللہ ہی ہے۔''

کم از کم ان لفظوں کا مفاد میرے ذہن میں تو یہی آیا ہے اور ہے بھی یہی واقعہ کہ سارا عالم ''ماشاء الله'' (جو کچھ چاہا اللہ نے) اور آدمی اپنے اندر جن توانائیوں اور طاقتوں کو پاتا ہے ان سب کی حقیقت لا قوة الا بالله کے سوا اور کچھ نہیں ہے' گو آفاق وانفس دونوں کو صرف ان دو فقروں میں بند کر دیا گیا ہے۔

بہرکیف عہد جدید کا جدید شرک اور اس کے نئے قالب کے مقابلے میں ایمان کی حفاظت کے لئے آپ ہی سوچئے کہ اس سے زیادہ منطقی حکیمانہ طریقہ تفہیم اور کیا ہوسکتا ہے' شرک کی اس نئی قسم کے مشرکوں کی سمجھ اگر اس سے بھی درست نہ ہو تو پہلے ہی فرمایا گیا ہے کہ تم ''الحق'' کو کہہ دیا کرو۔ ماننے نہ ماننے کے مخمصے میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو مبتلا نہ کرو۔ مومن کی ایمانی تسلی کے لئے یقیناً قرآن کا یہ تمثیلی قصہ برف کی سل کی حیثیت رکھتا ہے جس کا ہر مقدمہ بدیہی اور نتیجہ فطری ہے اور اس مثالی قصہ کو اشخاص اور خاندانوں کے ساتھ ساتھ چاہا جائے تو اقوام وامم پر بھی تھوڑی سی وسعت نظر سے کام لیتے ہوئے منطبق کیا جا سکتا ہے۔ آج زمین کے اس کرے پر

ایسی قوموں اور امتوں کی کیا کمی ہے جن کے قبضے میں اناج اور غلہ، پھل اور میوے پیدا کرنے والے بڑے بڑے وسیع علاقے پائے جاتے ہیں اور جن کے مقبوضات میں بڑے بڑے دریا مثلاً پرانے متمدن ملکوں میں دجلہ وفرات، سیحون جیحون، گنگا و جمنا، گوداوری و کرشنا اور نو دولت ممالک میں مسی سی پی، لوکن (امریکہ) والگاہ اور نیپر ❶ (روس) وغیرہ پہلے بھی تھے اور آج تک بہہ رہے ہیں، جن میں زرعی اور بستانی پیداواروں اور صنعت وحرفت اور تجارت کی راہوں سے سرمایہ کے سمندروں کو ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

☆☆☆

---

❶ یہ دلچسپ لطیفہ ہے کہ جیسے گنگا و جمنا کو ہندوستان والے ''ماتا'' کہتے ہیں اسی طرح روس میں ''دالگا ماتا'' اور نیپر کو ''نیپر پتا'' کہتے تھے اور شاید اب بھی کہتے ہوں۔

باب پنجم

تشریحات سورۂ کہف

حیات دنیا کی پہلی تمثیل کا حاصل:

اشخاص ہوں یا اقوام' مومن اور غیر مومن کے درمیان جو مکالمہ ہوا ہے' دونوں پر اسے آپ منطبق کر سکتے ہیں۔ آخر میں مکالمہ کو ختم کرتے ہوئے مرد مومن اور نئے قسم کے اس مشرک سے کہا کہ سرمایہ کی کمی اور آبادی کی اقلیت کے ساتھ طنز کرتے ہوئے اپنی برتری اور بڑائی کے جس فخر کا اظہار میرے سامنے تم نے کیا ہے۔ اس کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ باغ اور اس کی زرعی وثمری پیداوار سے جو معاشی آسانیاں آج قدرت کی طرف سے تمہارے لئے مہیا کی گئی ہیں اسی قدرت والے خدا سے میں توقع رکھتا ہوں کہ تم سے بہتر جنت (باغ) مجھے بھی عطا کرے گا گویا تم سے بھی زیادہ آسان' سہل معاشی ذرائع ہمارے لئے خدا مہیا کرے۔ مرد مومن نے صرف اس توقع کا ذکر کیا' علاوہ اس نتیجہ کے دنیاوی زندگی میں بھی معاشی سہولتوں کی توقع ایمانی زندگی کے منافی نہیں ہے۔ ایک بات اس موقع پر سوچنے کی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مالی قلت اور آبادی کی اقلیت کا جو طعنہ مرد مومن کو دیا گیا تھا اس طعنے کے مقابلہ میں سرمایہ کی فراوانی اور آبادی کی اکثریت کی توقع کا اظہار کیوں نہیں کیا گیا۔ جب امید ہی لگائی تھی تو مقابلتاً ان دونوں باتوں کی بھی امید لگا سکتا تھا۔ بظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ معاشی سہولتوں کے مہیا ہو جانے کے بعد خواہ مخواہ محض فخر وغرور کے لئے سرمایہ اور آبادی کی کثرت کی فکر میں گھلنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

خیر یہ تو مرد مومن نے اپنے متعلق کہا۔ اسی کے ساتھ چونکاتے ہوئے اس مشرک مرد غیر مومن کو اس نے توجہ دلائی کہ جس باغ اور معاش کی جن سہولتوں پر ناز کر رہے ہو اور اپنی کوششوں

کا نتیجہ ان کو سمجھتے ہو ڈر و کہ آسمانی ''حسبان'' [1]

یعنی ان کے متعلق حساب دینے کی گھڑی تمہارے سر پر نہ آجائے اور جس قدرت کا یہ عطیہ ہے حساب لینے کے بعد وہی قدرت باغ کی زمین کو نشو و نما کی صلاحیتوں سے محروم کر دے اور تمہیں پانی کے جس ذخیرے پر اعتماد ہے یا ذخیرہ ختم کر دیا جائے اس طور پر ختم کر دیا جائے کہ آب برآری کی ساری تدبیریں پانی کے برآمد کرنے میں ناکام ثابت ہوں۔

تاریخ کے صفحات آسمانی ''حسبان'' کے ان دونوں مثالوں سے لبریز ہیں' کتنے زرخیز ممالک آج بنجر میدانوں کی شکل میں پڑے ہوئے۔ مردمومن نے ان ہی تاریخی مثالوں کی طرف گویا اشارہ کیا۔ یہاں تک مکالمہ ختم ہو گیا۔ آگے قرآن میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ مردمومن کی پیشنگوئی یا آسمانی ''حسبان'' کی دھمکی اس عصر کی یا ماڈرن مشرک کے سامنے واقعتہً آ گئی۔ معاشی سہولتوں' سرمایہ کی بہتات' برتری و بلندی کے سارے تماشے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور کف افسوس ملتے ہوئے اب اس کو احساس ہوا کہ عقلی و جسمانی جدو جہد کو جاری رکھتے ہوئے بھی میرا قائم کردہ معاشی نظام تہ و بالا جو ہو گیا تو اس کی وجہ بجز اس مشرکانہ ذہنیت کے اور کیا ہو سکتی ہے جس میں مبتلا ہو کر میں نے یہ باور کر لیا تھا کہ قدرتی کاروبار میں خود میری عقل و فراست سوجھ بوجھ سعی و محنت بھی شریک ہے اور اب اس کی سمجھ میں آیا کہ کائنات کی ولایت و نگرانی صرف خدا ہی کی ذات کے ساتھ مختص ہے۔ اپنی مشرکانہ ذہنیت پر بیچارہ پچھتاتے ہوئے جیسا کہ قرآن میں نقل کیا گیا' کہتا تھا۔

یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّیْۤ اَحَدًا۔

''اے کاش! نہ شریک کرتا میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو''

اور یہی فقرہ جیسا کہ میں کہتا چلا آ رہا ہوں اس سارے قصے میں سب سے زیادہ اہم ہے عرض کر چکا ہوں کہ غیر خدائی قوتوں کی پوجا پاٹ والے شرک کا پورے قصے میں نہ اشارۃً ذکر ہے اور نہ صراحۃً۔ مفسرین بھی حیران ہیں کہ جس شرک پر پچھتا رہا تھا اس کی نوعیت کیا تھی۔ شرک

[1] حسبان کے چند معانی ارباب تفسیر نے لکھے ہیں لیکن لفظاً و معناً میرے خیال میں یہی مطلب ہے جو میں نے درج کیا ہے زیادہ مناسب ہے۔

خفی کے نام سے مسلمانوں میں ایک اصطلاح جو مروج ہے جس میں یہ مانتے ہوئے کہ کائنات کے ذرہ ذرہ کی کارفرمائیاں براہ راست حق تعالیٰ کے ارادہ ومشیت کی تابع ہیں اور اس معاملہ میں خالق کائنات کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں ہے' خیر وشر اللہ تعالیٰ کی ہی طرف سے ہے لیکن باوجود اس یقین وایمان کے اسباب کے راہ سے پیدا ہونے والی چیزوں کے متعلق اسباب کی دخل اندازی کا خیال بھی دلوں میں گزر جاتا ہے' ان ہی اسباب میں ارادہ واختیار کا وہ عنصر بھی ہے جس کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو لیکن ہمارے اختیاری اعمال وافعال پر اثر اندازی کا تعلق انسانی وجود کے اس عنصر سے بھی ہے۔ کچھ ان ہی باتوں کا نتیجہ یہ شرک خفی ہے۔ مومن کے لئے جس کی حقیقت سچ پوچھئے تو وسوسہ اور خطرہ ہی کی ہوتی ہے۔ لیکن ایمان کے اعلیٰ مدارج کا تقاضا یہی ہے کہ اس وسوسہ کے لئے بھی قلب میں گنجائش نہ چھوڑی جائے۔ بالفاظ دیگر شرک خفی میں بھی استقلالی حیثیت خدا اور اس کے حکم وارادہ ہی کو حاصل ہوتی ہے اور اسباب وعلل کا خیال محض ایک ضمنی عارضی خیال کی حیثیت سے آجاتا ہے۔ برخلاف اس کے اس باغ والے آدمی پر شرک کی جس ذہنیت کو ہم مسلط پاتے ہیں' اس میں شرک خفی کے قطعی برعکس ساری کارفرمائیوں کو اسباب ہی کی طرف منسوب کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے اور خدا کا انکار تو نہیں کیا جاتا لیکن دنیا کے کاروبار میں اس کی مشیت وارادے کا خیال ہی نہیں آتا' یا آتا ہے تو اسی طرح جیسے شرک خفی میں اسباب وعلل کی طرف بھی کبھی موحد کا دھیان منتقل ہو جاتا ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ شرک کی تمام قسموں میں یہ اس کی بدترین قسم ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ دجالی فتنہ سے رسول اللہ ﷺ نے جس سورۃ کا تعلق بتایا ہے خصوصیات کے ساتھ اسی سورۃ میں شرک کی اس قسم کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ اس فتنہ کے ایام میں اس قسم کی مشرکانہ ذہنیت میں لوگ عام طور پر مبتلا ہو جاتے ہیں [1] ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنے دل و

---

[1] ہندوستان کے مسلمانوں میں اس ذہنیت کے ساتھ شروع شروع میں جو نمایاں ہوئے ابتداً عام مسلمانوں کی طرف سے ''نیچری'' کا خطاب ان کو دیا گیا تھا' وجہ اس کی یہ تھی کہ عالم کے سارے کاروبار کو یہ لوگ نیچر کی طرف منسوب کرتے تھے گو خدا کے منکر نہ تھے لیکن کائناتی کارفرمائیوں میں خدا کی چنداں ضرورت ان کے نزدیک باقی نہ تھی' کہتے تھے کہ یہ سب کچھ تو نیچر کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ مسلمان (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

دماغ کا جائزہ لے اور دیکھے کہ شرک کی اس ماڈرن اور عصری شکل سے وہ کتنا متاثر ہے۔ کم از کم ایک مومن کو اس کے سوا اور کچھ سوچنا نہ چاہئے کہ دنیا ہو یا آخرت کسی میں بہترین نتائج اور بہترین انجام کی ضمانت صرف اس یقین میں پوشیدہ ہے کہ عالم کی ولایت اور کارفرمائی صرف حق تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ محدود مختص ہے اور یہی مفاد و مطلب ہے قصہ کے آخری فقرہ کے الفاظ کا کہ:

هُنَالِكَ الْوَ لَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ط هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَ خَيْرٌ عُقْبًا۔

''وہاں معلوم ہوتا ہے کہ سچی ولایت (عالم کی) صرف اللہ ہی کے لئے ہے' بہتر ثواب (نتیجہ کے لحاظ سے بھی) اور بہتر ہے عاقبت (انجام) کے لحاظ سے بھی۔''

حیات دنیا کی دوسری تمثیل:

مذکورہ بالا مشرکانہ ذہنیت کے سوا اللہ کی یاد سے غافل ہو جانے والے دلوں میں جو دوسری کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ وہی ہے جس کا مشاہدہ غافلوں کی جماعت میں ہم کر رہے ہیں یعنی شکم قبر تک کی زندگی کا جو محدود وقفہ ہے۔ اسی محدود وقفہ پر ساری انسانی توانائیاں گردش کرنے لگتی ہیں اور آدمی کی زندگی جو پیدا ہونے کے بعد درحقیقت ختم نہیں ہوتی اس کے متعلق حد سے زیادہ تنگ نقطہ نظر پر یہ اصرار اسی غفلت کا خمیازہ ہے' جسے بخوشی اللہ کے بھولنے والے بھگت رہے

(گزشتہ سے پیوستہ) ان کے اس دعویٰ سے بھڑکتے تھے لیکن جرم انکا کیا ہے؟ صاف لفظوں میں جیسا کہ چاہیے خود اعتراض کرنے والوں کے سامنے بھی اس سلسلے میں کوئی متعین بات نہ تھی حالانکہ یہ شرک کی وہی ماڈرن شکل ہے جس میں خدا کو معطل ٹھہرا کر غیر خدائی قوتوں کے ساتھ عالم کے نظام کو وابستہ سمجھا جاتا ہے۔ یقیناً نمک حرامی' خیرہ سری' گستاخی' شوخ چشمی میں پوجا پاٹ والے مشرک سے بھی شرک کی یہ نئی شکل بڑھی ہوئی ہے؟ کیونکہ پوجا پاٹ والے مشرک افعال کی حد تک خدا ہی کی طرف ہر فعل کو منسوب کرتے تھے صرف عبادت و دعا میں غیر اللہ کو شریک ٹھہراتے تھے' قرآن میں بکثرت پرانے مشرکوں کی طرف ربوبیت والی توحید کا عقیدہ منسوب کیا گیا ہے' گویا ''ایاك نستعین'' (تجھ ہی سے ہم اعانت طلب کرتے ہیں) اس پر قائم رہتے ہوئے ''ایاك نعبد'' (تجھ ہی کو ہم پوجتے ہیں) سے پرانے مشرک ہٹے ہوئے تھے' لیکن شرک کی اس جدید قسم میں استعانت والی توحید بھی باقی نہیں رہی ہے۔ نئے مشرکوں میں دعا و عبادت وغیرہ کی اہمیت اس لئے باقی نہیں رہی ہے کہ خدا کو عالم کے کاروبار میں جب دخل ہی نہیں ہے تو اس سے مانگنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہی۔

ہیں۔شرک کے بعد یہ دوسرا نتیجہ اغفال قلب کا تھا۔اسی کو سمجھاتے ہوئے زندگی کے موجودہ عبوری دور الحیوۃ الدنیا کو قرآن نے اس تمثیل سے سمجھانا چاہا ہے کہ بارش برستی ہے' زمین پر بکھرے ہوئے دانے بارش کے پانی سے مل کر لہلہا اٹھتے ہیں مگر چند ہی روز کے بعد خشک گھاس بھوسا بن کر اڑ جاتے ہیں اور سارا تماشا اسی پر ختم ہو جاتا ہے ظاہر ہے کہ آدمی زندگی کے موجودہ عبوری دور کا بھی یہی حال ہے کچھ مال و دولت' بال بچے اس کے اردگرد جمع ہو کر دوسروں کے لئے اس کی زندگی قابل رشک بنا دیتے ہیں لیکن موت سارے قصے کو درہم برہم کر دیتی ہے' فہمائش یہ کی گئی ہے کہ المال والبنون (سرمایہ اور اولاد) کے وقتی طمطراق میں اپنی کدوکاوش اور محنت ومشقت کے پسینے کے ایک ایک قطرے کو لگا دینا اور ان پہلوؤں سے قطعی بے تعلق ہو کر لگا دینا جن کے نتائج باقی رہنے والے ہیں اور مستقبل کی ساری روشنی ان ہی کے ساتھ وابستہ ہے کہاں تک عقل کا تقاضا ہو سکتا ہے؟ بارش والی تمثیل کے آخر میں خاص طور پر قابل توجہ اس کے یہ آخری الفاظ ہیں:

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا۔

''اور ہے اللہ ہر بات پر قادر''

بظاہر اس میں اشارہ کیا گیا ہے کہ خشک دانے زمین پر بکھرے ہوتے ہیں لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ پانی برسا کر قدرت ان ہی خشک دانوں کو ہرا بھرا کر کے نمایاں کرتی رہتی ہے اور پھر خشک کر دیتی ہے۔جس قدرت کے اس عمل کو مسلسل آدمی دیکھتا رہتا ہے۔اسی قدرت کے متعلق اس بد گمانی میں مبتلا رہنے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ موت کے بعد پھر زندگی کو دوبارہ وہی قدرت نمایاں نہیں کر سکتی؟ آخر زندگی کو شکم مادر و شکم قبر ہی کے وقفے تک محدود قرار دینے پر اصرار کرنے والے اپنے اس تنگ نقطہ نظر کی تصحیح کے لئے قدرت کے متعلق کس مشاہدے کو پیش کر سکتے ہیں۔خصوصاً جب اس کی مخالفانہ شہادتوں سے دنیا بھری ہوئی ہے۔

بہر حال جن لوگوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ مر کر تم فنا نہیں ہوتے مگر وہ یہی کہتے جاتے ہیں کہ ہم تو فنا ہی ہو کر رہیں گے' ان کو تسلی دی جاتی ہے کہ ہر پیدا ہونے والا آدمی بہر حال باقی رہتا ہے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ نہیں ہم معدوم اور نیست و نابود ہو جائیں گے ان ہی کو قرآن نے آگے مطلع

کیا ہے کہ اپنی مرضی سے پیدا ہونے والے جس طرح پیدا نہیں ہوتے اسی طرح اپنی خواہش کے مطابق کوئی اپنے آپ کو فانی و معدوم کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوسکتا بلکہ جو کچھ زندگی کے موجودہ دور میں اس نے کیا ہے اس کے نتائج آئندہ زندگی کی شکل میں اس کے سامنے اس وقت آئیں گے جب عالم کا موجودہ نظام پلٹ دیا جائے گا۔ جو چیزیں اس وقت ساکن ہیں وہ اس انقلابی دور میں متحرک ہو جائے گی اور جو اندر ہے وہ باہر ہو کر سامنے آ جائے گا اور اس وقت دیکھنے والے دیکھیں گے کہ ان کے سارے کرتوت چھوٹے ہوں یا بڑے جو بظاہر ناپید ہو چکے تھے ایک ایک کر کے ان کے آگے کھڑے ہیں اور یہ بے بنیاد وہم جن لوگوں نے تراش لیا تھا کہ موت سارے قصوں کو ختم کر دیتی ہے' پائیں گے کہ یہ صرف ان کا وہم اور فقط ایک نفسیاتی دھوکہ تھا جواب دہی کی ذمہ داریوں سے گریز کا ایک خود ساختہ زبردستی کا حیلہ تھا۔

وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْ حَاضِرًا۔

''اور پائیں گے جو کچھ انہوں نے کیا تھا سب ان کے سامنے حاضر ہے''

کے الفاظ میں اسی واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے قرآن نے اس سے بھی مطمئن کر دیا ہے کہ قدرتی نتائج عمل کرنے والوں کے سامنے جب آئیں گے تو وہ قدرتی نتائج ہی ہوں گے کمی و بیشی کی جن میں گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

آدم علیہ السلام و شیطان کا قصہ اور اس کے نئے اجزاء:

''اور نہ ظلم کرے گا تیرا پروردگار کسی پر'' کے طبعی قانون کا ذکر کر کے اس سورۂ میں بھی آدم اور شیطان کے قصے کا اعادہ کرتے ہوئے جیسا کہ قرآن کا قاعدہ ہے اس خاص مقام کی مناسبت سے اس قصے کے متعلق چند نئے اجزا کا تذکرہ کیا گیا جنہیں سورۂ کہف کے سوا اور ہم کہیں نہیں پاتے حالانکہ اس قصہ کو جیسا کہ معلوم ہے مختلف سورتوں میں اجزاء کی کمی و بیشی کے ساتھ قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے جہاں تک میرا خیال ہے قصہ کے یہی جدید عناصر جنہیں ہم یہاں پاتے ہیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں اور ان ہی پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس موقع پر اس قصہ کا اعادہ کیوں کیا گیا ہے۔

آدم اور شیطان کا قصہ تو مشہور ہی ہے یعنی فرشتوں کو جب آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو شیطان اکڑ گیا اور سجدہ کرنے سے اس نے انکار کیا۔ یہ حصہ قصہ کا تو یہاں بھی موجود ہے لیکن جدید عناصر جن کا اضافہ یہاں کیا گیا ہے میرے خیال کے مطابق وہ یہ ہیں۔

۱۔ شیطان ''جن'' کے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا' یعنی ''کان من الجن'' کا جو مفاد ہے۔

۲۔ شیطان تنہا نہیں ہے بلکہ اس کی ذریت (نسل یا بال بچے) بھی ہیں۔

قصے کے ان دونوں نئے اجزا کی طرف مفسرین کا ذہن بھی منتقل ہوا ہے اور بڑی طویل طویل دور از کار ① داستانوں میں لوگ مشغول ہو گئے' لیکن ان دونوں سے بھی زیادہ توجہ کی مستحق جہاں تک میرا اندازہ ہے تیسری نئی بات جو یہاں پائی جاتی ہے اس کی طرف لوگوں کا دھیان شاید نہیں گیا۔ مطلب یہ ہے کہ عام طور پر آدم و شیطان کے قصے میں آدم کے مقابلے میں شیطان کی آڑفونی کے ذکر کا پہلو غالب ہے' حضرت آدم کی تحقیر اور اپنی برتری و بلندی پر اس نے اس موقع پر جو زور دیا تھا زیادہ تر اس کو قرآن میں نمایاں کیا گیا ہے لیکن اس سورۂ میں بجائے اس کے سجدے کے حکم کے بعد:

فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۔

''پس خدا کی بات کو پھاڑ کر شیطان نکل بھاگا۔''

کے الفاظ میں صرف شیطان کے طرز عمل کی تعبیر کی گئی ہے جس کا حاصل بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اپنے خالق کے حکم سے سرتابی کے جرم کا شیطان نے جو ارتکاب کیا تھا اور خدا کی بات سے لاپروائی اختیار کرتے ہوئے اپنے خود تراشیدہ خیالات اور اپنی رائے پر اسے اصرار تھا شیطان کے جرم کے اسی پہلو کی طرف اس خاص موقع پر قرآن خصوصیت کے ساتھ توجہ دلانا چاہتا ہے۔

① انتہا یہ ہے کہ ذریت اور نسل کے سلسلے میں شیطان کی دلہن تک کی جستجو لوگ کرنے لگے' امام شعبیؒ جن کے مزاج میں ظرافت تھی صحابہ کے دیکھنے والوں میں ہیں' ان کا لطیفہ مشہور ہے۔ کسی نے شیطان کی عروسی (دلہن) کا نام پوچھا تو بولے اس بارات میں فقیر شریک نہ تھا کہ نکاح کے وقت نام سننے کا موقع ملتا۔ بعضوں نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ اپنی دلہن شیطان نے خود اپنے آپ کو بنایا اور اسی ذریعہ سے اس کی اولاد پیدا ہوئی۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب غور کیجئے ان امور پر جو اس قصہ کے بعد اس سورۃ میں پائے جاتے ہیں۔

شرک براہ غفلت:

واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی یاد سے غافل بن جانے کے بعد شرک کی نئی بیماری میں مبتلا ہونے کے ساتھ اپنی ساری کوششوں کو مادر وشکم قبر کی درمیانی وقفہ والی زندگی ہی میں کھپا دینے کے اصول پر آج جو اصرار کر رہے ہیں' ان کی اطاعت سے اہل ایمان کو قرآن نے جو منع کیا ہے بظاہر اس قصہ سے اسی ممانعت کے وجوہ واسباب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے' ایمان والوں اور مسلمانوں میں ان غافلوں کی ریس کی جو ہوک اٹھتی ہے اس کی بنیاد ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ غافلوں کا یہ گروہ بھی نظر آتا ہے کہ آدمیوں ہی کا گروہ ہے۔ آدمی کو دیکھ کر اس کے رنگ کو اگر آدمی اختیار کرے تو ہم جنسی کا یہ قدرتی تقاضا ہے لیکن ہم جنسی کے لئے صرف ظاہری شکل و صورت کا اشتراک کیا کافی ہے؟ آدم و شیطان کے قصے کے امتیازی اجزاء جن کا خصوصیت کے ساتھ یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ شیطان جو ''جن'' کے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ باوجود جن ہونے کے صفاتی تبدیلیوں کی وجہ سے ملائکہ (فرشتوں) میں شریک ہو گیا تھا اس لئے اس حکم میں جو فرشتوں کو دیا گیا تھا وہ بھی شریک تھا' مگر اس کے بعد اپنے ملکی صفات وخصوصیات کو کھو بیٹھا اور خالق تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں اپنی خود تراشیدہ رائے اور بافیدہ خیالات کا تابع بن گیا ہے اور جیسے صفاتی تبدیلیوں نے شیطان کو ملائکہ کی جماعت میں شریک کر دیا تھا اسی طرح بہت سے آدم زاد جو شکلاً وصورۃً آدم زاد معلوم ہوتے ہیں لیکن انہوں نے بھی خدا کی باتوں کو بے وزن ٹھہراتے ہوئے اپنی سوچی ہوئی باتوں سے علم و عمل کا نظام قائم کیا' ظاہر ہے کہ ذاتاً آدم کی اولاد ہونے کے باوجود صفاتاً وہ شیطان ہی کی ذریت اور نسل میں داخل ہو جاتے ہیں' جیسے جنی شیطان صفات ہی کی وجہ سے کچھ دن کے لئے ملائکہ میں شریک ہو گیا تھا۔

اور یہ بھی سبق اس سے ملتا ہے کہ کائنات کی ابتداء انتہا انسانی وجود کے مدعا وغیرہ سوالات

کے جواب کی تعلیم خود خالق کائنات کی طرف سے ہمیں حضرات رسل و انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ جو ملی ہے اور اسی کی بنیاد پر جس عملی زندگی کا مطالبہ ہم سے کیا گیا ہے اس کی بے وقعتی کرتے ہوئے جب اللہ کی یاد سے ان غافل قلوب کے تصورات وخیالات کے وزن کو ہم محسوس کرنے لگیں تو اس کا مطلب یہی تو ہوا کہ شیطان اور شیطان کی ذریت و نسل جو صورتاً وشکلاً آدمی معلوم ہوتے ہیں ان ہی کی ولایت اور نگرانی کو ہم قبول کر رہے ہیں۔

فرمایا گیا کہ جو دشمن ہیں محض صورت وشکل کے اشتراک کی وجہ سے ان ہی کو تم دوست بنا رہے ہو اور جو تمہارا خالق و مالک رزاق و رب ہے اس کی باتوں کو بے وقعت ٹھہرا رہے ہو۔

بِئۡسَ لِلظّٰلِمِیۡنَ بَدَلًا۔

''(فطرت کے نشان زدہ حدود سے ہٹنے والے) ظالموں نے کتنا برا بدل اختیار کیا ہے۔''

کے الفاظ میں اسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آگے سمجھایا گیا ہے اور کتنی واضح صاف معقول منطقی بات ان کے آگے رکھی گئی ہے کہ خالق کائنات کی باتوں کے مقابلہ میں ان صفاتی شیطانوں اور صوری انسانوں کی باتوں کے متعلق اپنے اندر غیر معمولی کشش اور وزن جو تم محسوس کر رہے ہو آخر اس کی بنیاد کیا ہے؟ جو فلسفہ یہ بگھارتے ہیں اور جس فلسفہ کی بنیاد پر عملی زندگی کا نظام انہوں نے قائم کیا ہے کیا اس فلسفہ کی بنیاد کسی علم پر قائم ہے فرمایا:

مَاۤ اَشۡهَدۡتُّهُمۡ خَلۡقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ۔

''میں نے ان کو اس وقت اپنے سامنے بلا کر کھڑا نہیں کر لیا تھا جب آسمانوں اور زمین کی آفرینش ہو رہی تھی۔''

ظاہر ہے کہ اس وقت ان کا کیا' ان کے آباء واجداد کا بھی پتہ نہ تھا' خود آدم پیدا نہ ہوئے تھے۔ پھر جو کہتے ہیں کہ عالم کی ابتداء یوں ہوئی' پہلے یہ ہوا' وغیرہ وغیرہ بجز لحافیات ❶ کے وہ اور بھی کچھ ہے؟

---

❶ لحافیات میری ذاتی اصطلاح ہے مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ابتداء وانتہاء وغیرہ جیسے امور جو قطعی طور پر انسانی حواس کی گرفت سے خارج ہیں ان ہی کے متعلق بجائے اعتراف جہل کے (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

اسی طرح عالم کے کاروبار سے حق تعالیٰ کو بے تعلق ٹھہراتے ہوئے جو یہ مدعی ہیں کہ اس سارے کاروبار کی باگ ہمارے قبضہ اقتدار میں ہے اور قدرت ان ہی کے بل بوتے پر دنیا کو چلا رہی ہے اطلاع دی گئی ہے کہ جو صرف یہی نہیں کہ بذات خود گمراہ ہیں بلکہ شیطان کی زینت بن کر دوسری قوموں کو سیدھی راہ سے بھٹکا کر گمراہ کر رہے ہیں ان ہی کو خدا کیا اپنا مددگار اور قوت بازو بنا سکتا ہے؟

مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا۔

''اور گمراہ کرنے والوں کو میں نہیں ہوں قوت بازو بنانے والا''

کا کھلا ہوا مطلب یہی ہو سکتا ہے اور اسی لئے کہ اس موقع پر اسی ماڈرن شرک کا ذکر اوپر سے ہوتا چلا آ رہا ہے یہ خیال گزرتا ہے کہ آگے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ایک دن وہ بھی ہو گا جب ان سے کہا جائے گا کہ کائناتی کارفرمائیوں میں جن لوگوں کو میرا ساجھی اور شریک تم لوگ اپنے خیال میں ٹھہراتے تھے انہیں پکارو مگر ان کی طرف سے کوئی جواب پکارنے والوں کو نہیں ملے گا۔ اعلان کیا گیا ہے کہ اس دن موبق (ہلاکت کی وادی) کو اپنے اور شرکاء کے درمیان پائیں گے۔

خدا کے بجائے موجدین کی اہمیت:

ظاہر ہے کہ پوجا پاٹ والے شرک کے قدیم دقیانوسی طریقہ میں جیسے بعض نادیدہ وہمی ہستیوں یا فرشتوں، جنوں، بھوتوں، یا مرے ہوئے انسانوں کی روحوں وغیرہ کو مختلف ناموں سے موسوم کر کے عبادت و دعا، نذر و منت جیسی باتوں میں خدا کا شریک ٹھہرایا جاتا تھا یا اب بھی ٹھہرایا جاتا ہے، اسی طرح دنیا کے کاروبار میں خدائی کارفرمائیوں سے زیادہ اہمیت نیچر والے جدید ماڈرن شرک میں ان ہی لوگوں کو جو حاصل ہو جاتی ہے جو قدرتی قوانین کا علم حاصل کر کے نئے اختراعات اور جدید ایجادات و اکتشافات کو پیش کر رہے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ انسان سے باہر جو کچھ ہے سب کچھ خدا کا ہے اور عقل و خرد، حکمت و دانش کا سارا سرمایہ جو آدمی کے اندر ہے

(گزشتہ سے پیوستہ) محض شاعرانہ تمثیلوں کے سہارے کسی قسم کا فیصلہ ایسی بات ہے کہ منہ پر لحاف ڈال کر آدمی پڑ جائے اور وہ وسوسہ جو دماغ میں آتا جائے اسی کو واقعہ ٹھہرا لیا جائے۔ مابعد الطبعیات کے اکثر مسائل کی نوعیت یہی ہے اسی لئے ان مسائل کا نام ہی میں نے لحافیات رکھ دیا ہے۔۱۲

جس کی مدد سے نت نئی ایجادیں اور حیرت انگیز مصنوعات دنیا میں پیش ہو رہے ہیں آدمی کے اندر کا یہ سرمایہ بھی اسی کا بخشا ہوا اور پیدا کیا ہوا ہے جو آدمی کا پیدا کرنے والا ہے مگر بایں ہمہ یہ دیکھا جا رہا ہے کہ خدا جس کا سب کچھ ہے ان ہی ایجادوں کے متعلق اس کا نام لینے والا کوئی نہیں ہے لیکن جن کا کچھ نہ تھا ان ہی کے چرچوں سے دنیا گونج رہی ہے جس کا پانی تھا' آگ تھی' آگ پر پانی جب چڑھا دیا جائے تو وہ اسٹیم (بخار) بن جائے گا جس نے یہ خاصیت ان چیزوں میں ودیعت فرمائی ہے اس کو سب بھولے ہوئے ہیں اور آب و آتش کے باہمی تعلق سے اسٹیم کی جو طاقت پیدا ہوتی ہے قدرت کے اس قانون کو جان کر انجن کے پیش کرنے والے اسٹیفنسن کے ذکر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی زبان کبھی نہیں تھکے گی اور ایک اسٹیفنسن ہی کیا آج اڈیسن' مارکونی جیسے موجدین اور نیوٹن' آنسٹائن جیسے اکتشافیوں' نئے افکار' نئے تصورات پیش کرنے والوں کا قلوب پر جو وزن پڑا ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے شاید یہ دعویٰ واقعہ کا اظہار ہوگا کہ خدا نہیں تو خدا کے شریک غالب سے ان کا مرتبہ کسی طرح کسی حیثیت سے جدید مشرکوں کے قلوب میں کم نہیں ہے اور جیسے لات و منات' عزیٰ و ہبل شرک کے نظام قدیم کے شرکاء تھے نیچر والے شرک جدید میں بجنسہ یہی مقام آج ایجاد و اختراع' تحقیق و اکتشاف کے ان سرخیلوں کا ہے اسی موقع پر قرآن میں۔

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْآ اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا۔

''اور دیکھا مجرمین نے آگ کو تب خیال کرنے لگے کہ اب تو اسی آگ میں ان کو (بہرحال) گرنا ہی ہے اور (بچنے کے لئے) اس سے بازگشت کی کوئی صورت وہ نہ پائیں گے۔''

کا ایک نظارہ جو پیش کیا ہے' خدا ہی جانتا ہے کہ پرانے جاہلی شرک کرنے والے شرکاء اور مشرکین کے سامنے زندگی کی کس منزل میں یہ تماشا بے نقاب ہوگا' لیکن تعلیم یافتہ مشرکوں کے شرکاء کے لحاظ سے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے سامنے شاید یہ صورت ہو چکی ہے' پہلی جنگ عظیم کے بعد شرک جدید کے علاقوں میں یہی دیکھا جا رہا ہے کہ تابڑ توڑ ایک مصیبت کے بعد دوسری مصیبتوں' ایک آفت کے بعد دوسری آفتوں کا لامحدود سلسلہ ہے جو شروع ہونے کے بعد

ختم کرنے کی انتہائی کوششوں کے باوجود بجائے ختم ہونے کے آگے ہی بڑھ رہا ہے جو جہنم بھڑک اٹھی ہے بجائے بجھنے کے اپنی شدت میں تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی ہے' پکارنے والے شرک جدید کے ان ہی شرکاء کو پکار رہے ہیں' چلا رہے ہیں کہ اپنی عقل وسیاست و دور اندیشی اور دقیقہ سنجی' پالیسی' ڈپلومیسی کے سلیقوں سے کام لو' الجھے ہوئے قصوں کو سلجھاؤ لیکن وہ بیچارے ان کی کیا مدد کریں گے؟ حال جب یہ ہے کہ چھوٹے شرکاء تو خیر چھوٹے ہی ہیں' آئنسٹائن جیسے امام الائمہ کی پوزیشن والے بھی بلی سے بھاگے ہوئے چوہے کی طرح ایک بل سے نکل کر دوسرے بلوں کی تلاش میں آج سرگرداں ہیں اور تیرہ سو سال پہلے جو بات سنائی جا رہی تھی وہی دیکھی جا رہی ہے کہ پکارنے والے اور جنہیں پکارا جا رہا ہے دونوں اپنے آپ کو موبق (ہلاکت کی کھائی) کے کنارے کھڑا پا رہے ہیں اور تقریباً یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ تباہی اور بربادی کی جہنم ان کی نگاہوں کے سامنے آ چکی ہے اب اس سے مصرف اور بازگشت کی کوئی امکانی صورت باقی نہیں رہی ہے۔

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ جدل یعنی سخن بافی ❶ یا سخن پروری کی عادت اپنے جذبات اور اپنے من مانے خیالات کے مطابق آدمی میں جو پائی جاتی ہے اور تعلیم بات بنانے کے اس سلیقہ میں اور چار چاند لگا دیتی ہے اسی عادت بد کا حوالہ دیتے ہوئے شرک جدید کے ان قصوں کے بعد معا یہ جو فرمایا گیا ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ط وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا۔

''اور گردش دیئے ہیں ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر نمونے سے اور تھا الانسان جدل میں بہت بڑھا ہوا۔''

اس میں کل مثل یعنی ''ہر نمونے'' کا جو لفظ ہے' ظاہر ہے کہ ان ہی نمونوں سے اس کا تعلق ہونا چاہئے جس کا دین اور مذہب سے رشتہ ہو' پھر مذہب اور دین کے متعلق آج کوئی جدید نقطہ

❶ اہل لغت نے لکھا ہے کہ دراصل رسی بانٹنے کو کہتے ہیں اسی ابتدائی معنی کے لحاظ سے ''سخن بافی' جدل کی ایک اچھی تعبیر معلوم ہوئی۔

نظر اور طریقہ فکر اگر پیدا ہوا ہے اور قرآن میں ہم اس کے متعلق اشارات پاتے ہیں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے بلکہ اتنا عظیم انقلابی طریقہ فکر جس کا تجربہ شرک کی موجودہ عصری ذہنیت کرا رہی ہے اس سے خاموشی یہی بات ھـذا الـقـرآن یعنی اس آخری آسمانی کتاب کے لئے جس کے بعد کوئی کتاب اترنے والی نہ تھی محل حیرت ہوسکتی تھی کچھ نہیں صرف۔ "ماشاء الله لاقوة الا بالله" کے چند لفظی فقرے میں آفاق وانفس (آدمی کے باہر اور آدمی کے اندر) کے متعلق جتنی استوار و محکم منطقی تعبیر میں حقیقت واشگاف کی گئی ہے کیا اس کے بعد اس تعلیمی شرک کا کوئی رگ وریشہ باقی رہ سکتا ہے؟ اسی لئے سوال ہوتا ہے کہ قرآن اور قرآن کے ان سکینت آفرین ایمان افروز بیانوں کی روشنی میں گو قدیم شرک کی دیواریں اس میں شک نہیں کہ خود کو ماننے والوں کے اندر بھی ہل چکی ہیں لیکن جدید شرک کے بازار کی رونق اگر بڑھ نہیں رہی ہے تو کم بھی نہیں ہوئی ہے اور سردست اس کی کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

پھر اس کا انجام آخر کیا ہوگا؟ قرآنی ہدایت کی تیز وتند روشنی کے ہوتے ہوئے بھی دنیا اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں کیوں مار رہی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ پہلے بھی دیکھا گیا ہے اور اب بھی دیکھا جا رہا ہے کہ حق کے مقابلہ میں جدلی منہ زوریوں سے کام لینے والے بالآخر تمسخر اور استہزاء پر عموماً اتر آتے ہیں اور استہزاء وتمسخر کا قدرتاً یہ نفسیاتی اثر ہے کہ حقائق و واقعات پر سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کے سلیقہ سے ایسے لوگ محروم ہو جاتے ہیں۔ جو ٹھٹھوں اور قہقہوں میں باتوں کے اڑا دینے کے عادی ہو گئے ہوں۔ کان رکھتے ہوئے وہ نہیں سنتے اور آنکھوں کے باوجود انہیں کچھ نہیں سوجھتا۔ اسی موقع پر یہ اطلاع دیتے ہوئے۔

وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا۔

"انہوں نے میری آیتوں کو اور جن باتوں سے ان کو چونکا دیا گیا (سب کو) مذاق اور تمسخر بنالیا۔

تغافل کا نتیجہ:

ان مسخروں کے ظلم اور خدا کی باتوں سے ان کی لاپروائیوں کا تذکرہ کر کے یہ جو قرآن میں

فرمایا گیا ہے:

اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْا وَ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَ قْرًا۔

''قرآن کو وہ سمجھیں (اس معاملہ میں) ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ ٹھونس دی ہے''

بظاہر انسانی نفسیات کے اسی باطنی مہلک عارضہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ عجب مرض ہے قاعدہ ہے کہ استہزائی خفقان کا دورہ جب کسی پر پڑتا ہے تو قلم اور زبان دونوں سے اس دورے کے ایام میں دیکھا جاتا ہے کہ چبھتے ہوئے چست فقرے بے ساختہ نکل رہے ہیں اپنی طباعی اور غیر معمولی ذہانت کے دھوکے میں غریب مسخرہ اس کی وجہ سے خود بھی مبتلا ہو جاتا ہے اور خام کاروں کی طرف سے دادوں کا سیلاب جب امنڈتا ہے تو دوسروں کو بھی وہ وقت کا مجتہد نظر آتا ہے اور خود اپنے متعلق بھی بیچارہ اسی فریب کا شکار ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً اس باطنی اور نفسیاتی سزا کی زنجیریں کستی ہی چلی جاتی ہیں وہ سمجھتا ہے کہ میں کھل رہا ہوں حالانکہ اور زیادہ بندھتا چلا جاتا ہے۔ یہ بڑی خطرناک ذہنی کیفیت ہے۔ ''قبول حق'' کی گنجائش ان حالات میں تقریباً سلب ہو جاتی ہے اور علاج کی کوئی صورت اس کے سوا باقی نہیں رہتی جس کا ذکر یہاں بایں الفاظ فرمایا گیا ہے۔

قدرتی گرفت کی دو شکلیں:

اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ❶ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا۔

''یہ کہ پہلوں کا طریقہ ان کے سامنے آئے یا قسط وار عذاب ان کے آگے آئے۔''

قدرتی مواخذہ کی مستقل شکلوں کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے سنۃ الاولین (پہلوں کا طریقہ) اس کا مطلب وہی ہے جو عام مفسرین نے لکھا ہے کہ جیسے گزشتہ مایوس العلاج اقوام اور امتوں کا کلی صفایا کر دیا گیا۔ اولین کی تاریخی سنت کے نمونوں کی بکثرت مثالیں

❶ سنۃ الاولین ھو عذاب الاستیصال ''اویاتیھم العذاب قبلا'' بضم القاف والباء جمیعاً وھو جمع قبیل بمعنی ضروب من العذاب تتواصل ''امام رازی نے مذکورہ بالا الفاظ میں تفسیر کی ہے اور راغب نے بھی مفردات میں ''قبلا'' کی یہی شرح کی ہے۔

خود قرآن میں موجود ہیں اور دوسری شکل اس اجتماعی مواخذہ کی یہ ہے کہ بتدریج مختلف مصائب وآلام کی ایک قسط کے بعد دوسری قسط کا نشانہ ان کو بنالیا جاتا ہے تا ایں کہ بالآخر نیست و نابود ہو کر اس قسم کی مجرم قومیں شاید ہمارے زمانے کے دجالی فتنہ اور ان کی پیدا کی ہوئی طغیانیوں کے ساتھ مواخذہ کی دوسری صورت کا ظہور شروع ہو چکا ہے اور جب شروع ہوا ہے تو بہر حال انجام تک پہنچ ہی کر رہے گا۔

اور سچ پوچھئے تو ارحم الراحمین کی رحمت عامہ اور اس کی صفت غفوریت کے تقاضوں کے یہ کرشمے ہیں کہ گرفت میں قدرت کی طرف سے بجائے عجلت کے تاخیر وتمہیل سے کام لیا جارہا ہے اور میرا کوئی ذاتی احساس یا صوفیانہ حسن ظن ہی نہیں ہے بلکہ:

وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا۔

"اور اب اگر تو ان کو "الہدیٰ" کی طرف بلائے گا بھی تو وہ کبھی راہ پر نہیں لگ سکتے۔"

کی فیصلہ کن اطلاع کے ساتھ قرآن ہی میں یہ فرمانے کے بعد:

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ۔

"اور تیرا بہت بڑا بخشنے والا رب رحمت والا ہے جو کچھ انہوں نے کیا اگر ان کو اس پر پکڑ لے تو عذاب کو ان پر فوراً لے آئے۔"

یہ اعلان کیا گیا ہے:

بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا۔

"بلکہ (ان کی گرفت کے لئے) ایک خاص وقت کا وعدہ ہے ہرگز نہ پائیں گے اس سے کوئی پناہ کی جگہ۔"

ظاہر ہے کہ جن کے متعلق قطعی فیصلہ کی صورت میں حق تعالیٰ کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی ہو کہ وہ راہ پر نہیں لگ سکتے اور ہدایت نہیں پا سکتے' ان ہی کے متعلق یہ خیال کہ توبہ واستغفار کی گنجائش پیدا کرنے کے لئے ان کو ڈھیل دی جارہی ہے کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا بلکہ گرفت میں عدم تعجیل حق تعالیٰ کی اس رحمت عامہ کا تقاضا ہے جس سے کوئی محروم نہیں ہے اور اس کی اسی

رحمت واسعہ کا یہ نتیجہ ہے کہ غفوریت یعنی گناہوں کے نتائج کو دبا دینے کی الٰہی صفت سے ان کو بھی مستفید ہونے کا موقع عطا کیا جاتا ہے جن کو توبہ اور بازگشت کی توفیق کبھی میسر نہ آئے گی۔ لیکن خدا کی غفوریت ان کی شرارتوں اور نافرمانیوں کے نتائج کو کب تک اور زندگی کی کن کن منزلوں میں دبائے رکھے گی۔ اس کا صحیح علم تو خدا ہی کے پاس ہے باایں ہمہ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ نیک کاروں اور بدکاروں مجرمین و غیر مجرمین دونوں کو برابر کر دیا جائے۔ اس لئے بہر حال خدا کے انصاف اور عدل کے تقاضے بھی پورے ہوں گے اور وہی مــوعــد (وعدہ کا وقت و مقام خاص) ہے۔ جس منزل پر پہنچنے کے بعد فرماں برداروں اطاعت شعاروں کا انجام دیکھا جائے گا کہ نافرمانوں اور باغیوں کے انجام سے جدا قطعاً جدا ہوگیا جو کچھ ایک کے سامنے آ گیا وہ اس سے قطعاً مختلف تھا جس سے دوسرے طبقہ کو رودررو ہونا پڑا۔ اسی کے بعد چونکہ:

وَتِلْكَ الْقُرٰى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا۔

"اور یہ بستیاں تباہ کر دیا جنہیں ہم نے جب انہوں نے ظلم کیا اور ان کی تباہی کے لئے بھی موعد (وعدہ کا خاص زمانہ) ہم نے مقرر کیا تھا۔"

کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جن سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ موعد اور وعدے کا تعلق ہر ایک شخص کی انفرادی زندگی سے ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے اپنی انفرادی زندگی کے نتائج بہر حال آ کر رہیں گے اور ان نتائج سے بچ کر نکل بھاگنے میں "موئل" یا جائے پناہ کی تلاش کرنے میں کوئی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ انفرادی زندگی کے ان نتائج کے ظہور کا حقیقی مقام مستقل دوامی زندگی کی وہ منزل ہے جس میں موجودہ عبوری گزشتنی و گزاشتنی دور کے بعد آدم کی اولاد داخل ہوگی۔

ایک لخت عذاب:

لیکن قوموں کے اجتماعی جرائم کے متعلق کچھ دیر پہلے آپ سن چکے کہ قرآن مجید میں مواخذہ اور گرفت کی دو شکلیں بتائی گئی ہیں۔ یعنی سنۃ الاولین (اگلوں کا طریقہ) جس کا مطلب جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے یہ ہے کہ اچانک ان پر ایسا عذاب آجاتا ہے جس کے بعد اس قوم کا کلی

صفایا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہو جاتا ہے' عرض کر چکا ہوں کہ اولین (اگلوں) کی اس سنت (طریقہ) کے تاریخی نمونوں اور مثالوں کے ذکر سے قرآن معمور ہے' قوم نوح' عاد' ثمود' ایکہ وغیرہ وغیرہ کی گرفت قدرت کی طرف سے اسی رنگ میں ہوئی اور اجتماعی مواخذہ کی دوسری شکل وہ ہے جسے "او یاتیھم العذاب قبلا" (یا آئے عذاب ان پر قسط وار تھوڑا تھوڑا کر کے) کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ جس فتنے سے سورۂ کہف کا تعلق ہے میں نے کہا تھا کہ اس فتنہ کی طغیانیوں کے مقابلہ میں مواخذہ اور گرفت کی اسی دوسری شکل کی ابتداء بظاہر ہو چکی ہے اور یہ دوسرا فقرہ جس میں ظالم قوتوں کی تباہ شدہ آبادیوں کی طرف اشارہ کر کے قرآن نے جس ''مہلک'' یعنی پیش آنے والے ہلاکت خیزیوں کی دھمکی دی ہے اور اطلاع دی ہے کہ اس کا بھی ایک موعد (وعید کا وقت) مقرر ہے۔ اس کا تعلق اخروی زندگی والے مواخذے کے مقابلہ میں اجتماعی زندگی کی اس گرفت اور مواخذے سے ہے جس کا ظہور زمین کے اس کرہ پر ہونے والا ہے۔ آخر میں پوچھتا ہوں کہ ظالموں کی جن برباد شدہ اجڑی ہوئی بستیوں کی طرف عبرت حاصل کرنے کے لئے قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے۔ یہ بستیاں جب زمین کے اسی خاکی کرہ پر برباد ہوئیں تو اس فقرے میں جس ''مہلک'' یا ہلاکت خیزیوں کی خبر دی گئی ہے اس کے متعلق اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ حادثہ بھی خاک دان ارضی پر ہی پیش آئے گا۔

قسط وار عذاب:

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے سنة الاولین کے قبلا (قسط وار) ہی کی شکل میں مہلک کی یہ وعید پوری ہوگی اور عذاب کی جن قسطوں کا آغاز ہو چکا ہے بہر حال وہ انجام تک پہنچ کر ہی رہے گا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اسی سورۂ کہف کی ابتدائی آیات میں جس من لدنی عذاب شدید کی دھمکی دیتے ہوئے خبر دی گئی ہے کہ ماعلی الارض زمین پر جو کچھ ہے سب کو میں صعید جرز (چٹیل اجاڑ میدان) بنا دینے والا ہوں' ان ابتدائی باتوں کا سورۂ کے آخری اجزا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یقیناً جو کچھ اب تک دکھایا جا چکا ہے۔ قرآنی پیشینگوئیوں کے سمجھنے اور سمجھانے کیلئے وہی کافی ہے۔

باب ششم

موسیٰ وخضر علیہما السلام' ذوالقرنین اور یاجوج وماجوج

(۱) قصہ موسیٰ وخضر علیہما السلام:

اب ہمارے سامنے یکے بعد دیگرے سورۂ کہف کے وہ دونوں قصے آتے ہیں جن میں ایک قصہ موسیٰ وخضر علیہما السلام کے عنوان سے مشہور ہے اور دوسرا قصہ ذوالقرنین نامی عہد ماضی کے کسی حکمران کا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہی دونوں قصے کیا سارے قرآنی قصص اس آخری آسمانی کتاب میں پائے جاتے ہیں' ان سے العیاذ باللہ محض داستان سرائی یا قصہ خوانی نہ مقصود ہے اور نہ کبھی ایسا سمجھا گیا ہے۔ پہلے بھی مانا گیا ہے اور آج تک یہی مانا جاتا ہے کہ ان قصوں کے پیرایہ میں پڑھنے والوں کو اسرار وحکم کے اسباق' عبرت وبصیرت کے درس پڑھائے گئے ہیں' گویا حدیث دیگراں کے لباس میں ''دلبری کے اسرار'' کو فاش کیا گیا ہے۔ اسی مسلمہ نقطہ نظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوچنا چاہئے کہ جس خاص مقام ومحل پر ان قصوں کو ہم پاتے ہیں اس کے لحاظ سے کن نتائج تک ان دونوں قصوں سے ہم پہنچ سکتے ہیں اور ان سے اپنی عملی زندگی میں کس حد تک مستفید ہو سکتے ہیں؟

قصہ کا ماحصل:

پہلا ماجرا جو سمجھا جاتا ہے کہ حضرت خضر اور موسیٰ علیہما السلام کے درمیان پیش آیا تھا۔ اس کا خلاصہ اگر نکالا جائے تو شاید یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام سے جو یہ خواہش کی تھی:

هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا.

''کیا میں آپ کے ساتھ اس غرض سے چل سکتا ہوں کہ رشد (یعنی سوجھ بوجھ) کی جو باتیں آپ کو سکھائی گئی ہیں وہ آپ مجھے بھی سکھا دیں۔''

مطلب جس کا بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے تقاضوں کے تحت رشد یا سوجھ بوجھ کے

کسی خاص سلیقہ کی ضرورت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے محسوس کی اور اس کے لئے خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو رشد اور سوجھ بوجھ کے ان پہلوؤں کے متعلق گویا ایک قسم کا عملی درس دینا چاہا جن کے وہ خواہش مند تھے۔

پہلا عملی درس:

کشتی والے نمونے سے جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے خود ہی تصریح کی یہ بتانا اور سمجھانا مقصود تھا کہ ایسے مواقع بھی کبھی پیش آ جاتے ہیں جن میں ظالم کو اس کی ظالمانہ چیرہ دستیوں سے ہٹانے کے در پے ہونا وقت کے اقتضاء کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ ایسے زمانہ میں مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ ظالم اپنی ظالمانہ کارروائیوں کا نشانہ جس چیز کو بنانا چاہتا ہو اسی میں بظاہر کچھ ایسے نقائص اور عیوب چاہئے کہ عمداً اور قصداً پیدا کر دیئے جائیں جن کی وجہ سے ظالم کے حرص و آز کی نگاہوں سے تو وہ چیز گر کر اس کے سامنے سے ہٹ جائے لیکن بذات خود وہ شے بھی باقی رہ جائے اور جو کام اس سے نکل رہا ہو اس میں خلل پیدا نہ ہو۔

الغرض ظالم کو ظلم سے ہٹانے کی گنجائش جہاں نہ معلوم ہوتی ہو تو اس وقت یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز پر اپنے (ظلم و تعدی) کی مشق ظالم کرنا چاہتا ہو اسی کو ظالم کے سامنے سے ہٹا دیا جائے خواہ اس کی وجہ سے کچھ عیب اور نقص ہی کا نقصان مظلوموں کو کیوں نہ برداشت کرنا پڑے۔ اور ہے بھی عقل کی یہی بات کہ کلیتہً جس چیز سے محرومی کا خطرہ جہاں محسوس ہو رہا ہو وہاں نقص اور عیب ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو خود اصل چیز کا بچ جانا اسی کو غنیمت خیال کرنا چاہئے۔ شگاف یافتہ ہی سہی لیکن غریب ملاحوں کی وہ کشتی بچ تو گئی اور ملاحوں کا کام بھی اس سے نکلتا رہا۔ حالانکہ خرق اور شگاف کا عیب اگر اس میں نہ پیدا کر دیا جاتا تو دریا کے اس پار کا ظالم حکمراں غریب ملاحوں سے زبردستی چھین کر ہمیشہ کے لئے اس کشتی اور کشتی کے اور منافع سے ان کو محروم کر دیتا۔

دوسرا عملی درس:

اس کے بعد دوسرا عملی درس حضرت خضر علیہ السلام نے غلام یا اس کے صاحبزادے کو ختم کر

کے دیا جس کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دریافت فرمانے پر کہ ایسی شخصیت جو اندورنی گندگیوں سے پاک بھی تھی (نفس زکیہ کے الفاظ سے ان کی یہی مراد تھی) اور اس بے چارے نے کسی کی جان بھی نہ ماری تھی' اس کی گردن بلاوجہ آپ نے کیوں اڑا دی؟ یعنی کہا تھا:

اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً ۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ۔

''آپ نے قتل کر دیا ایک پاک (زکیہ) نفس کو کسی جان کے بدلہ کے بغیر''

اس موسوی اعتراض کا جواب دیتے ہوئے حضرت خضر علیہ السلام نے ان کے سامنے جس حقیقت کا انکشاف فرمایا تھا اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ دوسری بات' یعنی اس نے کسی کی جان نہیں ماری تھی' اس الزام سے تو شاید وہ بری تھا لیکن پاک باطن اور نفس زکیہ ہونے کا دعویٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے متعلق جو کیا تھا' اسی غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے خضر علیہ السلام نے اس واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کو مطلع کیا کہ پیدا تو ہوا تھا مومن والدین سے یعنی ایمان والی خاتون کی گود میں اس کی پرورش ہوئی تھی اور نشو ونما بھی اس کی ہوئی تھی ایک مومن باپ ہی کے زیر سایہ' دودھ بھی پیا تھا اس نے اسی مومنہ ماں کا' اور عقل وشعور ہوش وحواس کے درجے تک بھی پہنچا تھا اپنے مومن باپ کی دستگیریوں ہی سے' اسی کی انگلیاں پکڑ کر سن تمیز ورشد کے پانے میں کامیاب ہوا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اسباب پیش آئے اور کسی ایسے ماحول میں جا کر پھنس گیا کہ بجائے احترام وتعظیم کے اس کے اندر طغیان اور سرکشی کے جذبات والدین کے مقابلے میں ابھرتے ہوئے ترقی کر کے اس حد تک پہنچ گئے کہ مومن والدین کا یہ بچہ کفر یعنی ارتداد کے جرم تک کا مجرم بن گیا اور اپنے طغیان وسرکشی' کفر وارتداد کا دباؤ ڈال ڈال کر اپنے ان مومن والدین کو بھی پریشان کر رہا تھا یا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ آئندہ پریشان نہ کرے۔ حاصل جس کا یہی ہوا کہ اخلاقی اور اعتقادی غلاظتوں میں وہ لت پت تھا اور مستحق ہو چکا تھا کہ اس کے عدم کو اس کے وجود پر ترجیح دے دی جائے۔ قصاص یعنی قتل کے جرم میں تو قاتل عموماً اس لئے قتل کیا جاتا ہے کہ دوسروں کو آئندہ اس جرم کی جرات نہ ہو لیکن اپنی اخلاقی واعتقادی گندگیوں میں گرتے ہوئے جو یہاں تک پہنچ گیا ہو کہ اور تو اور والدین جنہوں نے اس کو پوسا پالا تھا ان کے لئے اس کا وجود صرف خطرہ بن کر رہ گیا ہو۔ کسی ایمانی گھرانے کے ایسے ماؤف عضو کا علاج

ہی اس کے سوا اور کیا تھا کہ اس کو کاٹ کر جدا کر دیا جائے' تا کہ اپنے جرم ارتداد کی سزا بھی بھگت لے اور دوسرے بھی اس کی اخلاقی واعتقادی سمیتوں سے محفوظ ہو جائیں اور اس کا زہر دوسروں تک نہ پہنچے۔

حضرت خضر علیہ السلام نے اس سلسلہ میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ اس ایمانی خانوادے کو گندے' نجس' سڑے ہوئے وجود سے پاک ہی کرنا میرا مقصود نہ تھا بلکہ اسی کے ساتھ۔

اَرَدْنَآ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا۔

''ہم نے (یہ بھی) چاہا کہ ان دونوں مومن والدین کو بجائے (اس گندے لڑکے کے) ان کا رب ایسا لڑکا دے جو اس سے پاکیزگی میں بھی بہتر ہو اور ''رحم'' میں بھی قریب تر ہو۔''

پہلی بات یعنی خیرا منه زکوٰة (مقتول لڑکے سے یہ لڑکا جو بطور بدل دیا جائے وہ پاکیزگی میں بہتر ہو) اس کا مطلب تو ظاہر ہی ہے کہ اخلاقی واعتقادی گندگیوں سے وہ پاک ہو لیکن دوسری صفت اس نعم البدل لڑکے کی واقرب رحما جو بتائی گئی ہے' عام مفسرین اور ترجمہ والے یہ لکھ کر گزر جاتے ہیں کہ ماں باپ کے ساتھ رحم وکرم کے برتاؤ کرنے میں قریب تر ہو لیکن قرآنی الفاظ کے سب سے مستند محقق علامہ راغب اصفہانی نے لفظ ''رحم'' کے ذیل میں یہ ارقام فرمایا ہے۔

الرحم رحم المرأة' ومنه استعير الرحم للقرابة لکونهم خارجين من رحم واحدة' يقال رَحِمٌ وَ رَحْمٌ قال تعالى و اقرب رحما۔

''رحم' عورت کے رحم (بچہ دانی) کو کہتے ہیں' رشتہ اور قرابت کو بھی اسی لئے رحم کہنے لگے کہ سارے رشتہ دار ایک ہی رحم سے برآمد ہوتے ہیں اسی لئے رَحِمٌ وَ رَحْمٌ کے الفاظ مستعار لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واقرب رحما فرمایا۔''

علامہ راغب اصفہانی کی مذکورہ بالا معنوی تشریح کی روشنی میں میری سمجھ میں تو اقرب رحما کا مطلب یہی آتا ہے کہ رحمی رشتوں کے اقتضاؤں کے جو قدرتی حدود ہیں ان سے یہ نعم البدل بچہ قریب تر ہوگا۔ بالفاظ دیگر حاصل یہ ہوا کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ رحم وکرم اور حسن سلوک

کے برتاؤ میں اپنی حد میں سے بجائے دور ہونے کے قریب تر رہے گا۔ ان رشتہ داروں میں ظاہر ہے کہ سب سے پہلے اپنے والدین ہی کو داخل سمجھنا چاہیئے۔ بہر حال مفسرین نے صرف والدین کے ساتھ حسن سلوک کے تعلقات کو اس بچے کے متعلق عموماً جو محدود کر دیا ہے بظاہر اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ قرآن میں خصوصیت کے اس دعوے کی تصحیح کے لئے کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ اس لئے سمجھنا چاہیئے کہ عام رشتہ داروں میں والدین کے ساتھ بھائی، بہن اور کنبے کے دوسرے لوگ بھی شریک ہیں۔ آئندہ حضرت خضر علیہ السلام کے عملی درس کے اس نمونے سے جس نتیجہ کو پیدا کر کے ہم دکھانے والے ہیں اس کے لئے اقرب رحما کے الفاظ کی یہ شرح خاص اہمیت رکھتی ہے۔ پڑھنے والوں کو چاہیئے کہ ابھی سے اس کی اجمالی اہمیت کو محسوس کریں۔

تیسرا عملی درس:

باقی تیسرا عملی نمونہ حضرت خضر علیہ السلام نے اس آبادی میں پہنچ کر پیش کیا تھا جس کے باشندوں نے ان دونوں بزرگوں (موسیٰ وخضر) کی درخواست پر بھی مہمان بنانا ان کو منظور نہ کیا اور ہر ایک نے گویا اپنے دروازے سے ان کو دھتکار کر صرف یہی نہیں کہ جسمانی تکلیف پہنچائی بلکہ ان کی توہین بھی کی لیکن با ایں ہمہ اسی آبادی کی ایک دیوار جو گرنا ہی چاہتی تھی بغیر کسی معاوضہ اور مزدوری کے خضر علیہ السلام نے اس کو درست فرما دیا اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا۔

''اگر تم چاہتے تو اس کی مزدوری لے سکتے تھے۔''

کے الفاظ کے ساتھ گویا ان پر اعتراض کیا تو جواب میں حضرت خضر علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ اس آبادی کے دو یتیم بچوں کا موروثی کنز (خزانہ) اس دیوار کے نیچے دبا ہے۔ ان بچوں کا باپ صالح اور نیک آدمی تھا حق تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اس نیک آدمی کے ان یتیم بچوں تک یہ سرمایہ اس وقت پہنچ جائے جب وہ ہوش گوش والے ہو جائیں اور اس وقت اپنے باپ کے موروثی مال سے مستفید ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان بچوں میں اپنے مورثی کنز سے استفادہ کی پوری صلاحیت جب تک نہ

پیدا ہو جائے' حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ مرد صالح کے متروکہ مال کی حفاظت کا انتظام میرا فرض تھا جسے میں نے انجام دیا خواہ جس آبادی کے یہ بچے تھے وہاں کے باشندوں نے میرے ساتھ کیسا ہی برا سلوک کیا ہو' اس لئے اس فرض کی انجام دہی میں مزدوری اور اجر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' وہ ہمیں مہمان رکھتے یا نہ رکھتے بہر حال اپنا فرض مجھے انجام دینا چاہئے تھا۔ یہی سبق ہے جو حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے تیسرے عملی نمونے سے دیا۔

بہر حال خضری درس کے تینوں عملی نمونوں کا قرآن میں جن الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے' اپنے الفاظ میں میں نے اسی کا حاصل پیش کیا ہے جو عربی جانتے ہیں وہ اصل قرآنی آیات سے اور عربی نہ جاننے والے ترجمہ سے اس خلاصے کو مقابلہ کر کے دیکھ سکتے ہیں اس کے بعد اب میں ان پانچ نتائج اور عبرت وبصیرت کے ان اسباق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جن کی طرف میرا ذہن اس قصے سے منتقل ہوا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ مجرموں کے مواخذہ اور گرفت میں بجائے عجلت اور جلد بازی کے قدرت تاخیر اور ڈھیل سے کیوں کام لیتی ہے' اس کے اسباب و وجوہ کو بیان کرتے ہوئے آخر میں جو یہ اعلان کیا گیا تھا۔

بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا۔

"بلکہ (ان کی پکڑ کے لئے) جس وقت کا وعدہ کیا گیا ہے جب وہ وقت آ جائے گا تو اس سے بچنے کی جگہ نہ پائیں گے"

مطلب جس کا یہی تھا کہ الحاد و بے دینی کا موجودہ دجالی فتنہ جو اس دین کے شکم سے پھٹ کر نکل پڑا ہے جس کی بنیاد ولدیت (یعنی مسیح ابن مریم خالق کائنات کے بیٹے ہیں) کے افترائی واختلافی عقیدے پر قائم کی گئی تھی' اس فتنے کے دردناک انجام کی جو خبر دی گئی ہے اور "من لدنی باس شدید" (عالم اسباب سے بالاتر سخت ترین جنگ) جس کی بدولت بالآخر زمین اور اس کا سارا بناؤ سنگھار "صعید جرز" (اجاڑ میدان) کی شکل اختیار کر لے گا۔ یہ انجام اور قدرت کا یہ جہاں سوز انتقام آئے گا تو بہر حال' لیکن کب آئے گا؟ اس وقت کو کوئی معین نہیں کر سکتا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس کے لئے کس وقت کا وعدہ کیا گیا ہے اور اس کا موعد کیا ہے۔

حالات حاضرہ سے تطبیق:

ایک طرف اس کا خیال رکھئے کہ قصہ ''موسیٰ وخضر علیہما السلام'' کا تذکرہ ٹھیک اسی اعلان کے بعد کیا گیا ہے اور دوسری طرف ہم اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس فتنے کے بانی اور ائمہ جن کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور ہے۔ ایک طرف ان کا حال یہ ہے کہ دنیا کی ہر کار آمد پیداوار خواہ اجتماعی ہو یا انفرادی' انسانی ہو یا غیر انسانی ہر ایک کی ٹوہ میں یہ رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں ہر ایسی چیز جس کے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے فاسد اغراض اور گندے مقاصد میں اس سے کام لے سکتے ہیں' اس پر چھاپا مارنا' درمیان سے اس کو اچک لینا اور قبضہ تصرف میں لا کر اس سے بالواسطہ کام لینا اس معاملہ میں ان کی مہارت اور چابکدستیاں حد کمال کو پہنچی ہوئی ہیں۔ کہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ فرشتہ بھی اس سلسلے میں ان کے ہتھے اگر چڑھ جائے تو دانستہ طور پر اس سے بھی ایسا کام یہ شاید نے لیں گے کہ دیکھ کر غریب شیطان بھی شاید انگشت بدنداں ہو کر رہ جائے۔

اسی کے ساتھ نسلوں کے بگاڑنے' ان میں سرکشی وطغیان کے جذبات کو ابھارنے' الحاد اور بے دینی کی حدود سے قریب کرنے کے لئے نت نئے ذرائع ووسائل کی امداد سے ایک ایسا ماحول انہوں نے پیدا کر لیا ہے جس میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی ہر قدم رکھنے والا وہ باقی نہیں رہتا جو قدم رکھنے سے پہلے تھا' مقصد یہ ہے کہ کسی بچے کے لئے کائنات کی محبوب ترین ہستیاں' یعنی ماں باپ کا وجود آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ خبطیوں اور دیوانوں کا وجود بن کر رہ جاتا ہے۔ اکبر مرحوم نے تو صرف کتابوں کا تذکرہ کر کے یہ شعر لکھا تھا

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کر لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

لیکن سچ یہ ہے کہ کتابوں کے ساتھ ساتھ ریڈیو' سینما' افسانے' تصویریں اور کیا کیا بتایا جائے کہ کن کن ہتھکنڈوں [1] سے کام لے کر ایسے مسموم ماحول کا سانچہ تیار کر لیا گیا ہے جس میں

---

[1] مثلاً بعض اوہام یا شاعرانہ خیالات جن میں ایک ارتقا کا نظریہ بھی ہے' مردہ بے جان مادے سے عالم کے زندہ نظام کو نکالنا اور یہ باور کرانا کہ ارسطو اور نیوٹن جیسے دانش مند اچانک مٹی کے ڈھیلے سے ابل پڑے' ظاہر ہے کہ آسان نہ تھا۔ اسی لئے مردہ مادہ اور حیاتی مظاہرے کے درمیان کروڑوں اور (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

ڈھل ڈھل کر نکلنے والوں کی اکثریت بے ساختہ دیکھنے والوں کے دماغ میں

فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا۔

''اندیشہ ہوتا ہے کہ اپنے طغیان وسرکشی کفر (ارتداد) سے اپنے مومن والدین کو یہ مغلوب کرلیں گے''۔

کے قرآنی الفاظ کی یاد تازہ کردیتی ہے۔

ادھر خالص مادی رجحانات کے اس دور میں شعوری طور پر انسانی زندگی کو شکم مادر و شکم قبر کے درمیانی وقفہ ہی تک محدود ہو جانے کے خیال کو اس دجالی تہذیب اور جاہلی تمدن نے ایسا مسلط کر رکھا ہے کہ اب اجر و معاوضہ صرف وہی ہے جس سے زندگی کے اس محدود وقفہ میں استفادہ آدمی کر سکتا ہو' اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر وہ کام جس میں اجر و معاوضہ کے اس معیار کی ضمانت نہ ہو قطعاً لاحاصل کام اور فعل عبث قرار پا چکا ہے۔

یہ اور قریب قریب اسی ذیل کے دوسرے زہریلے جراثیم جو اس فتنے کے اندر پھوٹ پھوٹ کر بنی آدم کے گھرانوں میں پھیل چکے ہیں اور پھیل رہے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے اگر موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے اس قصے اور جن عملی نمونوں پر یہ قصہ مشتمل ہے اس سے عبرت و بصیرت کے یہ اسباق حاصل کئے جائیں کہ کہفی زندگی میں جن مشاغل کا مشورہ اس سورۂ میں دیا ہے یعنی پہلی بات تو یہی کہ

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتٰبِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا۔

''پڑھتا رہ اس کو جو تیرے رب سے تجھ پر وحی کی گئی' کوئی اس کی باتوں کا بدلنے والا نہیں اور نہ پائے گا تو گوشہ انزوا اس کے سوا۔''

(گزشتہ سے پیوستہ) بے شمار مدارج کے پردے چھوڑ دیئے گئے تاکہ عوام کا حافظہ یہ بھول جائے کہ مٹی کے ڈھیلے سے یہ ارسطو کو نکال رہے ہیں۔ بہرحال نظریہ ارتقا کا ایک نتیجہ یہ بھی نکالا گیا ہے ہر پچھلی نسل اگلی نسلوں سے ترقی یافتہ ہوتی ہے علامت قیامت میں ان تلد الامة ربتها (جنے گی لونڈی اپنی مالکہ کو) ہوسکتا ہے کہ اس میں دماغی معکوسیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔

حاصل جس کا یہی تھا کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن علوم و معارف کی وحی ہوئی ان ہی کی تلاوت اور ان ہی پر اپنی زندگی کو منطبق کرنے کی کوششوں میں ان رفقاء کے ساتھ مشغول رہنا جن کے متعلق اسی کے بعد فرمایا گیا ہے کہ:

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ.

''پکارتے رہتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام اور مراد بنائے ہوئے ہیں اسی کے چہرے کو۔''

اور دوسری بات وہی جس کا حکم:

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ.

''بول اسی سچائی کو جو تیرے رب سے تجھ تک پہنچی ہے' پھر جس کا جی چاہے مانے' جس کا جی چاہے نہ مانے۔''

کے الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

دجالی فتنہ کے پیش نظر ہندوستان قدیم میں دینی مدرسوں کا قیام عین بصیرت پر مبنی تھا

بظاہر دیکھنے میں کہفی زندگی کے یہ مشاغل آسان ہی کیوں نہ نظر آتے ہوں لیکن فتنے کے جن دنوں میں ان مشاغل کا مکلف ان لوگوں کو بنایا گیا ہے جو ایمان اور عمل صالح کی زندگی کے ساتھ جینا بھی چاہتے ہیں اور اسی پر مرنا بھی چاہتے ہیں۔ تجربہ اور مشاہدہ بتا رہا ہے کہ حالات نے اس آسان زندگی کو بھی حد سے زیادہ دشوار بنا دیا ہے اور کچھ نہیں اس فتنے کی ان ہی تین نمایاں خصوصیتوں کو سوچئے جن کی طرف مذکورہ بالا سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے۔ دور کیوں جایئے' بطور مثال آپ کے سامنے اس کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں کہ جب یورپ و امریکہ سے موجودہ دجالی فتنہ کا سیلاب مشرق کی طرف امنڈا اور اس کے روح کش' ایمان ربا تھپیڑوں کی زد میں شاید سب سے پہلے ہمارا ملک ہندوستان ہی آیا اور مسلمانوں کی حکومت اس ملک میں تہہ و

بالا ہوگئی۔ چاہنے والوں نے پہلے تو یہی چاہا کہ ظلم ہی کا ازالہ کیا جائے لیکن تجربے نے بتایا کہ ظالم کے ہٹنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ تب کہفی زندگی کے مذکورہ بالا مشاغل کے لئے دینی مدارس کا نظام ملک کے مختلف گوشوں میں قائم کیا گیا اور ایسے زمانہ میں قائم کیا گیا جب اسی ہندوستان میں یورپ کے علوم جدیدہ کی تعلیم کے لئے ملک کے طول وعرض میں سکولوں اور کالجوں کا جال مختلف یونیورسٹیوں کے تحت بچھایا جا رہا تھا۔ ان جدید جامعات اور کلیات و مدارس کے طویل وعریض لفافوں کے مقابلے میں غریب عربی مدارس کی جو حیثیت تھی وہ تو خیر تھی ہی' ماسوا اس کے عربی کی ان تعلیم گاہوں کے قیام میں نہ اخباروں میں پروپیگنڈے سے کام لیا گیا' نہ پریس کی دنیا میں ہلچل پیدا کی گئی' دیواروں اور نمایاں مقامات پر نہ لمبے چوڑے پوسٹر آویزاں اور چسپاں کئے گئے' نہ شہروں اور قصبوں میں کانفرنسوں اور سالانہ اجتماعات کے تماشوں کا نظم کیا گیا' نہ ان کے لئے اپنا خاص لٹریچر تیار کیا گیا بلکہ انتہائی کس مپرسی کے حالات میں گمنام قصبوں اور دیہاتوں کی مسجدوں کے گوشوں میں کچھ پڑھنے والے اور پڑھانے والے سمٹ گئے تھے' تعلیمی نصاب نقائص وعیوب سے معمور تھا' نہ عصری تقاضوں کے مطابق علوم وفنون کی کتابیں اس میں شریک تھیں اور نہ دنیا کی موجودہ علمی زبانوں میں سے کسی زبان کو اس نصاب میں جگہ دی گئی۔ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتٰبِ رَبِّکَ (یعنی محمد رسول اللہ ﷺ پر جن علوم کی وحی کی گئی تھی) ان کے ساتھ عہد قدیم کے بعض قدیم فرسودہ فنون کی کتابیں اور وہ بھی انتہائی بے دلی کے ساتھ ان عربی مدرسوں میں پڑھائی جا رہی تھیں۔ الغرض ظاہر ہو یا باطن اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ان مدارس میں شگاف ہی شگاف اور خرق ہی خرق دیکھنے والی آنکھوں کو نظر آ رہے تھے۔ اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ اور شاید اب تک ہے کہ یورپ و امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک و اقالیم تک ہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خود ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان سے یا کم از کم ان کی قدر و قیمت سے ناآشنا ہی رہا[1]

[1] اس دلچسپ لطیفہ کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ جامعہ عثمانیہ کے پرووائس چانسلر (نائب امیر جامعہ) مرحوم قاضی محمد حسین صاحب بھی کچھ دن رہے تھے' قاضیوں کے خاندان سے نسلی تعلق تھا' اس لئے قاضی کا لفظ اپنے نام کے ساتھ لازماً لکھا کرتے تھے' پنجاب کے رہنے والے تھے' ہندوستانی یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد یورپ گئے اور ریاضی میں رینگلر کی ڈگری حاصل کی۔ مسلمانوں میں چند ہی (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

میں دوسروں کے متعلق کیا کہوں، اپنے دینی مدارس کی ان شکستہ حالیوں اور پڑھنے پڑھانے والوں کی شکستہ بالیوں، ان کی کس مپرسیوں، ناقدریوں کو دیکھ دیکھ کر خود میرا جی بھی ہمیشہ کڑھتا رہا اور جو عیوب ونقائص ان میں ہیں ان کو میں اب بھی عیوب ونقائص ہی سمجھتا ہوں لیکن جیسے کھلے دماغ کے ساتھ ان کوتاہیوں کا مجھے اعتراف ہے، اسی کے ساتھ اس واقعہ اور مشاہدہ کا بھی کیسے انکار کروں کہ ہمارے ان مدارس کے جن شگافوں اور کوتاہیوں کو دیکھ دیکھ کر بہی خواہوں کی طرف سے نوحہ خوانیوں اور ماتم سرائیوں کا سلسلہ اس قسم کے الفاظ وتعبیروں میں جاری تھا کہا جاتا تھا کہ یہاں سے پڑھ پڑھ کر نکلنے والے

نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل — نہ سرکار میں کام پانے کے قابل
نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل — نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل

اور اسی لئے بعض فیصلہ کرنے والوں نے فیصلہ تک کر دیا تھا کہ

بس لوٹ دو بساط کہ یاں مات ہو چکی — ان سے تو اب تلافی مافات ہو چکی

جہاں تک میرا خیال ہے، بجائے معاندانہ تعریضوں، رقیبانہ طنز اور طعنوں کے اس قسم کی تنقیدوں کی نوعیت بھی اگر وہی قرار دی جائے جو موسیٰ علیہ السلام کے اس اعتراض کی تھی۔ جب کشتی کے شگاف اور خرق کو دیکھ کر انہوں نے خضر علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا۔

''کیا تم نے کشتی میں شگاف اس لئے پیدا کر دیا کہ کشتی والوں کو ڈبو دو، تم نے بڑا نامناسب کام کیا۔''

(گزشتہ سے پیوستہ) افراد نے یہ امتیازی ڈگری اور وہ بھی ریاضی جیسے فن میں حاصل کی تھی کہنا یہ ہے کہ بسا اوقات سلسلہ ذکر میں دیوبند کے مدرسہ کا نام جب آتا تو قاضی صاحب انتہائی معصومیت کے ساتھ پوچھا کرتے کہ مولانا! یہ مدرسہ پنجاب میں شاید اس جگہ ہے جہاں نمک کے پہاڑ ہیں؟ کہتے کہ ہاں ہاں بچپن میں ایک دفعہ اس جگہ میں گیا بھی تھا۔ میں نے کئی دفعہ ان کو مطلع بھی کیا لیکن حافظہ کی سخت جانی کی وجہ سے نمک کے پہاڑ کا مغالطہ ان کے دماغ سے نہ نکلا۔ حالانکہ وہ بیچارے صرف مسلمان دوست ہی نہیں اسلام دوست آدمی بھی تھے۔ غفر اللہ لہٗ

لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ مذکورہ بالا عیوب ونقائص سے پاک کر کے ان مدارس کو بھی عصر جامعات اور کلیات کے مطابق اگر بنا دیا جاتا اور جن صلاحیتوں کے فقدان کا مرثیہ ان کے متعلق پڑھا جارہا تھا' اگر ان صلاحیتوں کے پیدا کرنے کا سامان بھی کر دیا جاتا تو دینی فتنے کے پچھلے تاریک وتاردنوں میں بچی کھچی نجات کی کچھ کشتیاں ان لوگوں کو جو میسر آتی رہی ہیں جو ایمان وعمل صالح کی زندگی کے ساتھ قبر کے کناروں تک پہنچنے میں اب تک کامیاب ہوئے ہیں کیا ہم نجات کی کشتیوں کو پا سکتے تھے؟ یہ ان ہی کسمپرس دینی مدارس کا طفیل ہے کہ اسلامی گھرانوں کے چند ایسے افراد کی دینی تربیت و پرداخت کا موقع مل گیا جو سرفرازی اور سربلندی کے عصری سامانوں سے اگر لیس ہوتے تو بجائے پرانے قصبات کی اجڑی ہوئی مسجدوں' سونی خانقاہوں کے مانئے کہ لندن کے انڈیا آفس اور پارلیمان میں وہ نظر آتے یا کم از کم ہندوستان کی اسمبلیوں' کونسلوں' ہائی کورٹوں کی زیب وزینت بن کر وہ ختم ہو جاتے۔

بلکہ تجربہ یہ بھی بتا رہا ہے کہ دین کے جن مدارس میں وقت کے تقاضوں کی رعایت کی گئی حکومت کی نگاہوں میں وہ چڑھ گئے' پھر ان کے ختم ہی کر دینے کا ارادہ کیا گیا یا ان کو بھی اپنے اغراض ومقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا گیا۔ چل تو وہ رہے ہیں اب بھی دینی مدارس ہی کے نام سے لیکن جاننے والے ہی جانتے ہیں کہ ان مدارس سے فارغ ہونے والے کام کس کے آرہے ہیں۔ یہ سامنے کے واقعات اور مشاہدات ہیں ہر دیکھنے والی آنکھ ان نتائج کو دیکھ رہی ہے اور اس وقت سمجھ میں آتا ہے کہ کھفی رنگ کے دینی مدارس کے خضر صفت بانیوں سے خرق وشگاف کے ان عیوب ونقائص کو ان میں کن مصلحتوں کے تحت باقی رکھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مسلمان ماؤں کے بچوں کو ان کی گودوں سے چھین چھین کر عصری جامعات اور یونیورسٹیوں میں داخل کر کے طغیان وسرکشی' الحاد وارتداد کے کافرانہ جراثیم ان کے دل ودماغ میں ایک طرف پرورش کرنے والے پرورش کر رہے ❶ تھے تو دوسری طرف ان کے مقابلے میں ہمارے یہی کھفی مدارس تھے جنہوں نے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے ایک طبقے کو خواہ ان کی تعداد جتنی بھی

---

❶ ڈاکٹر اقبال مرحوم ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلاتے رہتے تھے' مسلمانوں کو چونکاتے کہ:

الحذر از دستبرد روزگار ۔ گیر فرزندان خود را در کنار

کم ہوا اعتقادی واخلاقی گندگیوں سے پاک رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ میں کلی طہارت وزکوٰۃ و پاکیزگی کا مدعی نہیں ہوں، لیکن با ایں ہمہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ کہفی سلسلہ کی تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے والوں میں ایسے افراد عموماً پیدا ہوتے رہے ہیں جو قرآنی الفاظ خیر امنہ زکوٰۃ (بہتر ہو اس سے (اعتقادی اور اخلاقی) پاکیزگی میں) کے مصداق بن سکتے ہیں، یعنی اعتقادی واخلاقی پاکیزگی جیسی چاہئے اس کے وہ مالک ہوں یا نہ ہوں لیکن فتنہ زدہ، دجالی یونیورسٹیوں کے طیلسانیوں کی اکثریت کے مقابلہ میں نسبتاً اضافی پاکیزگی کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اور گو معاشی نقطہ نظر سے جدید تعلیم گاہوں کے پڑھنے والوں کی حالت بظاہر بہتر ہی کیوں نہ نظر آتی ہو لیکن دین کے متعلق ان کی کافی تعداد نے اپنے طرز عمل سے خود یہ ثابت کر کے دکھایا کہ اسلام کے لئے ان کا عدم ان کے وجود سے بہتر تھا جس قسم کے شکوک وشبہات کی چنگاریاں عام مسلمانوں میں ان کی طرف سے اڑائی گئیں، اسلامی عقائد واعمال کی تحقیر وتوہین کے سلسلہ میں جن ناگفتنیوں اور ناکردنیوں کے وہ مرتکب ہوئے خود ان ہی نے ان کو اس فیصلہ کا مستحق بنا دیا کہ اسلام کے ان کپوت فرزندوں کی نیستی ان کی ہستی سے یقیناً بہتر تھی بلکہ نعم البدل بچے کے متعلق حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے عملی درس کی تشریح وتوجیہ کرتے ہوئے اقرب رحما کے الفاظ جو فرمائے تھے، مطلب جن کا بیان کر آیا ہوں کہ رحمی رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک، رحم وکرم، محبت والفت کے برتاؤ میں اس رشتے کے اقتضاؤں سے بجائے دور ہونے کے وہ قریب تر ہوگا، میرا ذہن تو ان الفاظ سے کچھ ادھر بھی منتقل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب کہ کہفی زندگی کی تعلیم گاہوں کی بظاہر فراغبالیوں سے تعلیم پانے والوں کو یہ جو نظر آتا ہے کہ نسبتاً محروم کر دیتی ہے، شاید اس محرومی سے محفوظ رہنے کی عملی تدبیر کی طرف ممکن ہے ان الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہو۔

تعلیم جدید کا ایک عمومی اثر:

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تعلیم جدید کا ایک عمومی اثر اور عام نتیجہ جو یہ نظر آتا ہے کہ ماں باپ کی امداد سے اپنے آپ کو بے نیاز پانے کے ساتھ ہی ان سے بھی اور جن جن سے رشتہ والدین کے توسط سے قائم ہوا تھا سب ہی کو ٹھوکر مار کر دیکھا جا رہا ہے کہ الگ ہو جاتے ہیں اور ان کے

اعصابی نظام پر عموماً عورت یعنی بیوی ہی سوار ہو جاتی ہے۔ بظاہر تو وہ سمجھتے ہیں کہ بڑے بار سے وہ ہلکے ہو گئے لیکن بجائے ''ناقہ سوار لیلیٰ'' کے جب کسی ''مرد سوار لیلیٰ'' کے ہاتھوں میں ان کا معاشی نظام آ جاتا ہے' تجربہ آپ کو بتائے گا کہ اس کے بعد ہر فراغت ان کے لئے تنگی ہی بنتی چلی جائے گی۔ نسوانی خواہشوں کے بے تھاہ سمندر میں زر ونقرہ کی وھیل ❶ بھی حقیر کیڑے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ آخر چھنگلیا کے حلقہ کی قیمت بھی جہاں ہزاروں سے متجاوز ہوتی ہو' وہاں اس کے سوا خود سوچئے کہ اور امکان ہی کس چیز کا ہے؟ اس راستہ پر جو بھی پڑ گیا ایک ایسی راہ پر چل پڑا ہے جس کا نہ اور ہے نہ چھور۔ لیکن بجائے اس کے تھوڑی تھوڑی آمدنی رکھنے والے ایک ہی ماں باپ کے چند بھائی جب ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں یعنی ''اقرب رحما'' کی قرآنی روشنی میں معاشی زندگی کو منظم کرنے کا موقع خوش قسمتی سے جن کو مل جاتا ہے تو تجربہ ہی آپ کو بتائے گا' تھوڑی آمدنی بھی کیسے عجیب وغریب طریقے سے بڑی سے بڑی آمدنی سے حاصل ہونے والی مسرتوں کو ان کے قدموں پر نچھاور کرتی ہے؟ اخلاص ومحبت کی یہ خاندانی زندگی کیسے آڑے وقتوں اور کٹھن گھڑیوں میں مشکل کشائی کے معجزوں کے ساتھ سامنے آتی ہے!

بہرحال مجھے تو جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے ''اقرب رحما'' کے الفاظ میں ان معاشی نقصانات کی تلافی کی ایک مخفی عملی تدبیر پوشیدہ نظر آتی ہے' لیکن کیا کیا جائے کہ ''کہفی مدارس'' کے طلبہ بھی بتدریج فتنہ زدہ جامعات کی مسموم ہواؤں سے متاثر ہوتے چلے جارہے ہیں اور رحمی رشتہ کے تقاضوں سے زیادہ ان پر بھی ازدواجی رشتہ ہی کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یقیناً ایسی صورت میں اپنی معاشی بدحالیوں کے وہ خود ذمہ دار ٹھہرائے جائیں گے۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام نے اجر ومزد کے خیال سے بالاتر تعمیر دیوار کا جو عملی نمونہ اس آبادی میں پیش کیا تھا' جس کے باشندوں نے ان کی تحقیر وتوہین کو آخری حدود تک پہنچا دیا تھا۔ آپ چاہیں تو ان ہی کہفی مدارس میں جو دجالی فتنے کے استیلا وتسلط کے بعد اس ملک میں

---

❶ غیر معمولی عظیم جثہ والی مشہور مچھلی۔

قائم ہوئے' ان میں اس نمونے اور اس سارے پہلوؤں کا کسی نہ کسی شکل میں مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں ہی کے اسلاف نے معارف وعلوم کا جو متروکہ سرمایہ دنیا میں چھوڑا تھا اور حکومت کی دیوار جس وقت اس ملک میں منہدم ہو رہی تھی اس وقت مسلمانوں کا یہ موروثی ترکہ بدترین خطرات سے دوچار ہو گیا تھا۔ آنے والی نسلیں جدید جامعات اور یونیورسٹیوں میں بھیڑیا دھسان کی شکل میں دھنستی چلی جا رہی تھیں' ''مسلمانان در گور ومسلمانی در کتاب'' کا دردناک نظارہ بے نقاب ہو کر دھمکیاں دے رہا تھا کہ کچھ دن اور بھی غفلت سے اگر کام لیا گیا تو کتابوں والی مسلمانی بھی کیڑوں کے پیٹوں میں دفن ہو جائے گا۔

لیکن چند خضروش' خضر خصال بزرگوں نے کمر ہمت چست کی' وہ یہ تو نہ کر سکے کہ جیسے تیرہ سوسال سے جو کتابیں حکومت کے آئین ودستور کی حیثیت سے استعمال ہو رہی تھیں' اس کی اس حیثیت کو باقی رکھیں' لیکن مسلمانوں کے صالح اسلاف کے اس موروثی ترکہ کی حفاظت اور ایک نسل سے دوسری نسلوں تک اس کو مسلسل منتقل کرنے کا ایسا بندوبست بہر حال انہوں نے کر دیا کہ جب بھی مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں سے کسی نسل کو اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو جانے کا موقع کبھی مل گیا اور ایمانی ہوش' دینی حواس پھر ان میں کبھی واپس ہوئے تو اس وقت بالکل تروتازہ حالت میں اپنے اس موروثی ترکہ کی ایک ایک چیز ان شاء اللہ تعالیٰ ان کو مل جائے گی جس طرح چاہیں گے' ان سے وہ اس وقت مستفید ہو سکتے ہیں' اور گو خود مسلمانوں کی طرف سے ان کی عزت وآبرو کی دھجیاں اڑائی گئیں ان کا نام مسجد کے ملائے' خیرات کی روٹیاں توڑنے والے' قل اعوذیئے' ازیں قبل ''تنابزوا بالالقاب'' کی جو صورتیں بھی ممکن تھیں' شاید ہی کوئی صورت ایسی باقی رہ گئی ہے جسے اختیار کرنے والوں نے اس راہ میں اختیار نہ کیا ہو۔

لیکن با ایں ہمہ اجر ومعاوضہ کے خیال سے بلند وبالا ہو کر یہ میرا مشاہدہ ہے کہ اس خدمت کو جس کی قیمت دوسری جگہ سینکڑوں اور ہزاروں کی شکل میں مل رہی تھی اسی خدمت کو بخدا اس خدمت کو اللہ کے یہ وفادار بندے اور رسول علیہ السلام کے سچے راستباز' جان باز' خدام بغیر

معاوضہ یا قلیل ترین معاوضہ کے ساتھ بصد خندہ جبینی انجام دینے میں مشغول رہے۔ ❶

بہر حال جن جاں سوز' روح گسل' جگر خراش آ ثار ونتائج کا موجودہ دجالی فتنے کی شکل میں ولدیت مسیح کا عقیدہ دنیا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً شکار بنانے والا تھا' جن تصورات امت مرحومہ کے رسول اللہ ﷺ کے لئے ''بخع نفس'' یعنی جان تک کے خطرے کو سامنے لے آتا تھا۔

میرا خیال تو یہی ہے کہ خضر و موسیٰ کا یہ ماجرا اسی فتنے کے عبوری دور کے مشکلات اور دشواریوں کے حل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سوچنے والے جہاں تک سوچتے چلے جائیں گے ان پر انشاء اللہ تعالیٰ یہی حقیقت واضح ہوتی چلی جائے گی۔ اس قصہ کی یہ توجیہ ان کو نظر آئے گی کہ نہ شاعری ہے اور نہ خواب وخیال کی بات۔ ❷

قصہ کی تاریخی تکمیل غیر ضروری ہے:

اور میرے نزدیک قصے کا یہی پہلو غور وفکر کی دعوت دے رہا ہے باقی غیر قرآنی ذرائع سے قصہ کی تکمیل کی کوشش اور اس سلسلہ میں اس قسم کے سوالات کہ یہ موسیٰ کون تھے؟ اور قرآن میں

❶ مثلاً حضرت الاستاد مولانا انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ ہی کو میں نے دیکھا ہے کہ جب دیوبند میں حدیث کا درس بغیر کسی تنخواہ کے وہ برسوں سے دے رہے تھے' اسی زمانہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کی صدارت ہزار روپے ماہوار کی تنخواہ کے ساتھ پیش کش ہوئی لیکن یہی نہیں کہ خاموشی کے ساتھ انہوں نے اس کو مسترد کر دیا بلکہ زمانہ تک خود مدرسہ کے اراکین کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی۔ حضرت شیخ الہند کے متعلق یہ کون باور کرے گا کہ ماہوار پچھتر روپے ان کے نام سے جو درج تھے' ان میں سے کل پچاس لے کر پچیس روپے بد چندہ مدرسہ کے واپس فرما دیتے تھے اسی پچاس میں مسرت ونشاط کی قابل رشک زندگی تقریباً نصف صدی تک بسر کرتے رہے کوئی چاہے تو طویل فہرست دیوار کے ان معماروں کی تیار کر سکتا ہے جنہوں نے مسلمانوں کے صالح اسلاف کے موروثی ترکہ کو آئندہ نسلوں تک بغیر کسی معاوضہ یا قلیل ترین معاوضہ کے پہنچانے کا انتظام کیا۔ نور اللہ ضرائحم

❷ حال میں ایک صاحب نے مرزا صاحب قادیانی کے صاحبزادے اور خلیفہ بشیر الدین محمود صاحب کی تفسیر جسے تلبیساً تفسیر کبیر کا نام دیا گیا ہے دکھائی۔ افسوس ہوا کہ اللہ کی کتاب کے کلمات کی تحریف کی جرات کیسے ہوئی؟ اگر وہ جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے سامنے جواب دہی بھی کرنی پڑے گی۔ اس موقع پر انہوں نے سارے قصہ کو خواب وخیال قرار دیا ہے اور موسیٰ علیہ السلام نے جس شخص کی رفاقت اختیار کی۔ دعویٰ کیا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ تھے۔ ازیں قبیل جو جی میں آیا ہے لکھتے چلے گئے ہیں۔

بجائے نام کی ان دو صفات یعنی:

اٰتَیْنٰہُ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰہُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔

"دے رکھا تھا اپنے پاس سے ہم نے اسے رحمت اور سکھایا تھا ہم نے اپنے حضور سے اس کو علم"

سے جس شخصیت کو روشناس کرایا گیا ہے ان کا نام کیا تھا؟ واقعہ کی تحقیق کے لحاظ سے علم تاریخ کا تو یہ مسئلہ ہوسکتا ہے لیکن قرآن جس کام کے لئے نازل ہوا ہے شاید اس مقصد کے لئے ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں' ضرورت ہوتی تو یقیناً قرآن ہی میں ان کو واضح کر دیا جاتا' تاہم صحیح بخاری کی مشہور روایت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد صحابہ و تابعین میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ یہ موسیٰ کون تھے؟ حضرت ابی بن کعب کے حوالہ سے ابن عباس نے بیان کیا کہ بنی اسرائیل والے موسیٰ بن عمران تھے۔ بہرحال قرآنی الفاظ کے رو سے سوچنے کی بات اگر ہو سکتی ہے تو یہ دونوں فقرے ہو سکتے ہیں جن کے ذریعہ سے بتایا گیا ہے کہ جس شخص کی ملاقات سے بلیغ جستجو اور پختہ عزم کے بعد موسیٰ علیہ السلام کامیاب ہوئے تھے' ان کی ذات ایک نہیں بلکہ دو مستقل کمالات اور خوبیوں کی جامع تھی۔ دوسری بات یعنی "علمنہ من لدنا علما" کا مطلب تو ظاہر ہے کہ حسی و عقلی ذرائع کے سوا براہ راست علم و آگہی کی روشنی حق تعالیٰ کی طرف سے ان کے سینے میں چمکتی رہتی تھی' اور اسی روشنی میں بعض مخفی حقائق جن کا علم صرف عقل و حواس کے ذریعہ نہیں ہوسکتا تھا' ان سے واقف ہو جاتے تھے۔ یقیناً ان کے عملی درس کے عملی نمونوں میں بھی اس علم لدنی کی شہادتیں مل رہی ہیں' لیکن دریافت طلب پہلا فقرہ "اتیناہ رحمۃ من عندنا" کا ہے۔ ہم نے اپنے پاس سے اس کو رحمت عطا کی تھی۔ یہ تو اس کا ترجمہ ہوا لیکن مطلب کیا ہے۔ صحاح کی مشہور حدیث:

ان اللہ تعالیٰ مائۃ رحمۃ فمنھا رحمۃ یتراحم الخلق بینھم (مسلم)

"اللہ تعالیٰ کی رحمت کو سو حصوں پر مشتمل سمجھا جائے تو ان میں سے صرف ایک حصہ رحمت کا ہے (جو مخلوق کو ملا ہے) اسی کی وجہ سے ایک مخلوق دوسری مخلوق پر رحم کرتی ہے"۔

یہ یا اسی کے قریب قریب دوسرے الفاظ میں جس واقعہ کا اظہار روایتوں میں کیا گیا ہے' اس

کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر یہ سمجھا جائے کہ خالق کے ساتھ جیسے علم لدنی کا تعلق وہ رکھتے تھے اسی طرح مخلوق کے ساتھ رحمت و کرم' غمگساری و بہی خواہی و ہمدردی کے جذبات سے بھی قدرت نے ان کے قلب کو معمور فرما دیا تھا۔ اس سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ کھٹی زندگی اور اس کے مشاغل کی دشواریوں کے حل کی طرف اس قصے میں جو اشارے کئے گئے ہیں' ان اشاروں پر عمل اور اس جرات آزما عمل پر اقدام کی جسارت اسی قسم کے پاک نفوس میں پیدا ہو سکتی ہے جن کی ذات مذکورہ بالا دونوں خوبیوں کی جامع ہو' ورنہ جن میں صرف خلقت کی ہمدردی و بہی خواہی کا جذبہ تو پایا جاتا ہے مگر "لدنی علم" کی نعمت سے محروم ہیں وہ کسی قوم کے مخلص قائد اور لیڈر تو بن سکے ہیں لیکن دجالی فتنے کے عبوری دور میں جن ہمت شکن اقدامات کی ضرورت ہے ان کو وہ شاید چھو بھی نہیں سکتے' بلکہ ممکن ہے کہ وہ ان بزرگوں کے کاموں پر معترض ہی ہوں اور کچھ یہی دیکھا بھی جا رہا ہے۔

اسی طرح کشف و الہام کی لذتوں میں جو غرق ہیں' وہ ایک صوفی باصفا' درویش' نیک اندیش تو ہو سکتے ہیں لیکن کھٹی زندگی کی ان خدمات کی بجا آوری شاید ان کے بس کی بات بھی نہیں اور اسی بنیاد پر اگر یہ سمجھا جائے کہ جن بزرگوں سے یہ کام بن پڑا ان کو بھی ان دونوں خضری کمالات سے حصہ ملا تھا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے' سچ پوچھئے تو عہد فتنہ کی راہ نمائی کے جائز حقدار وہی تھے' اس عہد میں وہی کامیاب و بامراد ہو کر نکلے گا جس نے ان کا دامن تھام لیا۔ خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس قسم کے قرآنی قصص کے متعلق غیر قرآنی ذرائع سے معلومات فراہم کر کے قصہ کے خلاؤں کی تکمیل کا مشغلہ کم از کم قرآن فہمی کی مہم میں غیر ضروری ہے' بھلا آپ ہی بتائیے کہ مجمع البحرین کا پتہ کیا بتایا جائے جب دریاؤں اور سمندروں کے سنگم ایک نہیں' متعدد ہیں۔ یا اس فتیٰ (نوجوان) کا نام کیا تھا جسے ابتدا سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساتھ لیا تھا اور مچھلی والی وہ نشانی جس کو بھول جانے کی وجہ سے خواہ مخواہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ضرورت سے زیادہ سفر کی زحمت برداشت کرنی پڑی اور جب اس زحمت کی شکایت انہوں نے کی تب نوجوان کو یاد آیا تو اس کے متعلق یہ بحث کہ وہ مچھلی والی نشانی کیا تھی؟

کہنے والے یوں تو اس سلسلہ میں بہت کچھ کہتے ہیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ بعض اجزاء کے

متعلق صحیح بخاری جیسی حدیث کی مستند کتاب میں بھی روایت پائی جاتی ہے اور حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے لحاظ سے وہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جسے عقل ہضم نہ کر سکتی ہو' آخر مردے کا زندہ ہونا جب آئے دن کا بلکہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے تو یہی واقعہ ایک خاص رنگ میں کبھی اگر پیش آ گیا تھا تو عقل میں متلی کی کیفیت کیوں پیدا ہو۔ لیکن خواہ مخواہ کسی کی عقل غثیان کے مرض کی اگر مریض ہی ہو تو یقیناً ہم اس شخص کو قرآن کا منکر بھی قرار نہیں دے سکتے' جو مدعی ہو کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ مچھلیاں خشک اور نمک سودہ تھیں۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی زنبیل میں بھی مچھلیوں کا ہونا قرآنی الفاظ کی بنیاد پر ضروری نہیں' زیادہ سے زیادہ۔فنسیا حو تھما'' (بھول گئے دونوں (موسیٰ اور وہ نوجوان) اپنی مچھلی کو) کے الفاظ ملتے ہیں' لیکن قرآن ہی میں مچھلیوں ہی کا ذکر کرتے ہوئے ساحل بحر کے باشندوں کی طرف مچھلیوں کو منسوب کر کے۔

اِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ (اعراف' ۱۶۳)

''جب آتی تھیں ان کی مچھلیاں ان کے سبت کے دن'' بھی فرمایا گیا ہے۔

حالانکہ ساحل بحر والوں کی یہ مچھلیاں ان کی زنبیل میں نہیں بلکہ سمندر ہی میں تھیں لیکن صرف اس لئے کہ ان کا شکار کا ارادہ ان لوگوں نے کیا تھا' مچھلیوں کو قرآن نے ان ہی کی طرف منسوب کر دیا۔ ایسی صورت میں کہنے والے اگر یہ کہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس مقام کی تلاش میں تھے اس خاص مقام کی نشاندہی اس علامت سے کی گئی کہ خاص قسم کی مچھلی اس علاقہ میں پائی جاتی ہے۔ بتا دیا گیا ہو کہ جہاں اس قسم کی مچھلی سمندر کے ساحل پر نظر آ جائے آپ کو سمجھ لینا چاہئے یہ وہی مقام مطلوب ہے۔ پھر جب اس مقام پر وہ پہنچے تو نوجوان کی حالانکہ اس قسم کی مچھلی پر نظر پڑی اور وہ اس کو دیکھ کر ساحل سے سمندر کے اندرونی حصے کی طرف بھاگ گئی' مگر اس بندہ خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس کا ذکر نہ کیا۔ جب ماندگی کی شکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی تب اس کو یاد آیا۔ ❶ اور بولا کہ مچھلی تو ملی تھی اور خاص طریقے سے اچھلتے کودتے

---

❶ امام رازی نے اس موقع پر اپنی تفسیر میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ نمک سودہ خشک مچھلی کا زندہ ہو جانا بظاہر ایسی بات تھی جس کا بھول جانا عجیب ہے۔ پھر خود ہی جواب دیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے رفیق صبح و شام معجزوں کے دیکھنے کے عادی تھے اس لئے زیادہ اہمیت ان کے دل میں اس واقعہ کی نہ ہوئی۔۱۲

ہوئے سمندر کی طرف چلی گئی۔ موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھ چکے تھے واپس لوٹے۔

تو دعویٰ کرنے والے محض قرآنی الفاظ پر حصر کر کے واقعہ کی نوعیت اگر یہی قرار دیں تو جیسا کہ میں نے عرض کیا ان پر یہ الزام تو ضرور عائد ہوگا کہ صحیح حدیث کی خلاف ورزی کر رہے ہیں لیکن یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ قرآنی بیان کی بھی ان کی عقل نے پرواہ نہ کی۔

ایک انتباہ:

رہا متصوفہ کا وہ طبقہ جو شریعت کے حدود کو پھاند کر اباحیہ [1] میں شریک ہونے کے لئے خضر وموسیٰ کے قصہ سے نفع اٹھانا چاہتا ہے' میرے نزدیک قرآن کے سیاق وسباق سے اس بے بنیاد نتیجہ کا کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا' اور واقعہ سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ کوئی مکشوفات یعنی عالم کے بعض حوادث کا علم حضرت خضر علیہ السلام کو ہو جاتا تھا' لیکن یہ بات کہ جس شریعت کی وحی رسولوں پر حق تعالیٰ نے فرمائی ہے' اس شریعت میں بھی ردوبدل کا اختیار اس نظیر کی بنیاد پر ان لوگوں کو ہو جاتا ہے جن پر وحی نہیں ہوتی' اس کے لئے اس واقعہ سے سند لینا بہت ہی غلط جسارت ہے۔

(۲) قصہ ذوالقرنین:

اب میں پھر اصل قرآنی سیاق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ فتنے کے عبوری دور میں کہفی زندگی کے متعلق پیدا ہونے والے مشکلات کے حل کو جیسے حضرت موسیٰ اور خضر والے قصہ میں ہم پاتے ہیں یا پا سکتے ہیں' اسی طرح ایک قدرتی سوال اس کے بعد یہ سامنے آ جاتا ہے کہ خواہ اس فتنے کی عمر جس قدر بھی دراز وطویل ہو لیکن بہر حال اس کا دردناک انجام اور قدرت کی گرفت وانتقام کا موعد (مقررہ وقت) اس کے سامنے آ ہی کر رہے گا۔

ایسی صورت میں یہ کھلا ہوا برمحل سوال پیدا ہوتا ہے کہ فتنے کے اختتام کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ دنیا کے نظم وضبط کی باگ آئے گی ان کو اس وقت کیا کرنا چاہئے۔

اب آپ اپنے سامنے رکھ لیجئے اس سوال کو اور پڑھئے اسی کے ساتھ ذوالقرنین کے قصے کو

---

[1] انسانوں کا وہ طبقہ جو کسی آئین وقانون کی پابندی کو قبول نہیں کرتا۔

اورغور کیجئے ان مشتملات ومضمرات پر جو اس قصے کے اندر پوشیدہ ہیں۔

ظاہر ہے کہ ذوالقرنین کے متعلق یہ فرما کر مقاصد و اغراض کی تکمیل کے لئے ہر قسم کے ساز و سامان سے قدرت نے ان کو لیس کر دیا تھا۔ اتینہ من کل شئی سببا کا یہی مطلب ہے۔

آگے یہ خبر دی گئی کہ ذوالقرنین نے قدرت کی عطا کی ہوئی ان قوتوں سے کام لیتے ہوئے دنیا کے مختلف جہات کا سفر اختیار کیا' یہ سفر تین سمتوں کی طرف ہوا ہے۔ ان میں دو سفر یعنی ایک سفر جو مغربی سمت کی طرف ہوا جس کے آخری حدود پر پہنچ کر ذوالقرنین کو ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ سیاہ مٹی کے کسی چشمے میں آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ اور یہ ایک عام نظارہ ہے جو سمندر کے سواحل پر آدمی کے سامنے پیش ہوتا ہے' آفتاب کبھی نہیں ڈوبتا۔ لیکن ڈوبتا ہوا دیکھ کر کہنے والے یہی کہتے ہیں کہ وہ ڈوب گیا۔ دوسرا سفر مشرقی سمت کی طرف ہوا اور تیسرا سفر ذوالقرنین کا ایک ایسے مقام کی طرف ہوا جو مسلسل دو محاذی پہاڑوں کے درمیان تھا۔ ظاہر ہے کہ زمین کے کرے پر ایسے بھی بیسوں مقامات ہیں جب کسی ملک اور جگہ کی قرآن میں تصریح نہیں کی گئی ہے تو جیسا کہ میں نے عرض کیا قرآن فہمی کے لئے ان تصریحات اور معلومات کی ہمیں ضرورت بھی نہیں' البتہ ان اسفار میں ذوالقرنین نے جو خدمات انجام دی ہیں قرآن نے ان کو بیان کیا ہے اور وہی میرے نزدیک صحیح توجیہہ کی مستحق ہیں۔

ذوالقرنین کی قومی خدمات:

واقعہ یہ ہے کہ عموماً حکومتوں نے اپنا فرض یہ قرار دے رکھا ہے کہ رعایا سے ٹیکس اور محصول مختلف ناموں سے وصول کریں' پھر کچھ رقم تو حکومت والے اپنی رنگ رلیوں میں صرف کرتے ہیں اور بہت مخلص ہوئے تو ان کے معاوضہ میں امن وامان کا قیام اور ملک کے باشندوں میں ظلم وزیادتی' جور وتعدی کے واقعات کا انسداد' اس کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کچھ دنوں سے چند مزید فرائض کا اضافہ بھی حکومتوں کے ذمہ ہو گیا ہے' جن کا حاصل یہی ہے کہ امن وامان وفضل خصوصیات کے رعایا کی جسمانی و دماغی تربیت و پرداخت میں حکومتوں کو حصہ لینا چاہیے۔ یہ انتہائی ترقی یافتہ نظریہ ''فرائض حکومت'' کے سلسلہ میں سمجھنا چاہئے کہ عہد جدید میں شریک ہوا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ آدمی دماغ کے ساتھ دل بھی اور جسم کے ساتھ روح بھی رکھتا ہے۔ اور بلا شبہ انسانیت کے ان اہم عناصر کی صحت و آرائش کی طرف بھی حکومتوں کو توجہ کرنا چاہئے' لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں انتہائی ترقی یافتہ حکومتوں میں بھی یہ سوال اب تک نہیں اٹھایا گیا ہے بلکہ مذہب و دین وغیرہ کے نام سے کچھ چیزوں کی طرف مبہم مبہم سا اشارہ کر کے پھیلا دیا گیا ہے کہ اس قسم کی باتیں انسان کی شخصی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں حکومتوں کو ان میں دخل نہ دینا چاہئے۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ دماغ کے ساتھ ''دل یا قلب'' بھی وجود انسانی کا ایسا ''قیمتی جوہر'' ہے جو انسانی اخلاق و کردار کا بنیادی سرچشمہ ہے اور جب تک دیدھا' شک' وسوسہ' جیسے عام امراض کے مقابلہ میں یقین و اذعان اور استقامت کی خنکی دلوں میں پیدا نہیں ہوتی' نہ اخلاقی نظام ہی درست ہو سکتا ہے اور نہ کردار ہی کے استحکام کی توقع ہو سکتی ہے۔

بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ سفر کے پہلے مرحلہ میں ذوالقرنین جن لوگوں میں پہنچے ہیں' ان کے متعلق سب سے پہلے اسی فرض کی طرف جس سے دنیا کی موجودہ ترقی یافتہ حکومتیں بھی محروم ہیں ان الفاظ میں ان کو توجہ دلائی گئی ہے پوچھا گیا تھا کہ۔

''اے ذوالقرنین' تم ان لوگوں کو سزا دینا چاہتے ہو' یا نیکی کا برتاؤ ان کے ساتھ کرو گے۔'' یعنی

قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا۔

کا جو خلاصہ ہے' پھر یہ جواب ان کو سمجھایا گیا کہ:

''ان میں (اپنے حدود) سے جو تجاوز کریں گے ان کو (یہاں تو) میں سزا دوں گا' پھر وہ اپنے مالک کے پاس جب واپس جائیں گے تو ناقابل تصور عذاب سے دوچار ہوں گے لیکن یقین و ایمان والوں اور نیک کردار لوگوں کے لئے بہترین معاوضہ ہے اور میری طرف سے آسانیاں ان کے لئے پیش ہوں گی۔''

یہی حاصل ہے ان قرآنی الفاظ کا جو ذوالقرنین کی طرف منسوب کئے گئے ہیں یعنی

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَاَمَّا

مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ نِ الْحُسْنٰی ج وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا یُسْرًا۔

اسی طرح سفر کے اس تیسرے مرحلہ کے متعلق یہ اطلاع دی گئی ہے کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان والی سرزمین کے باشندوں کی ذہنی پستی انحطاط کے اس درجہ تک پہنچی ہوئی تھی کہ جانوروں میں جیسے یہ دیکھا جاتا ہے کہ گووہ دیکھتے' سنتے' چلتے' پھرتے بھی ہیں لیکن اسی کے ساتھ افہام وتفہیم اور مخاطبت کو قبول کرنے کی گویا ان میں صلاحیت نہیں ہوتی اور ان سے جو کچھ کہا جائے تو اسے نہیں سمجھتے' تقریبا یہی ذہنی حال ان دونوں پہاڑوں کے بیچ میں رہنے والے باشندوں کا معلوم ہوتا ہے قرآن میں اس اقوام کی اس خصوصیت کا اظہار

لایکادون یفقھون قولا

''نہ قریب تھے اس کے کہ بات سمجھیں۔''

کے الفاظ سے جو کہا گیا ہے یہ خصوصیت ظاہر ہے کہ اسی وقت تک خصوصیت باقی رہ سکتی ہے جب ان الفاظ کا وہی مطلب سمجھا جائے جو فقیر کے ذہن میں آیا ہے' ورنہ محض زبان کی ناواقفیت کا نتیجہ اس کو اگر قرار دیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس میں اس قوم کی کیا خصوصیت ہے' بولنے والے کی زبان سے جو بھی ناواقف ہوتا ہے' ان کی گفتگو نہیں سمجھتا' خواہ تہذیب وتمدن کے بلند ترین مقام ہی پر کیوں نہ ہو۔

بہر حال مذکورہ بالا الفاظ میں ان کے ذہنی انحطاط وپستی کا ذکر کرکے' آگے جو باتیں اسی قوم کے متعلق بیان کی گئی ہیں ان سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے واللہ اعلم بالصواب

کہ ذوالقرنین کی حکومت نے ان کی دماغی تربیت وپرداخت کی طرف توجہ کی اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یاجوج وماجوج نامی قوم ان غریبوں کے علاقہ میں آکر فتنہ وفساد کے ہنگامے جو مچاتی رہتی تھی اس کے مقابلہ میں اپنی مظلومیت کا احساس بھی ان میں زندہ ہوا' اور ان کے مظالم سے نجات پانے کی خواہش بھی ان میں پیدا ہوئی۔ جس کے لئے ذوالقرنین کی حکومت سے امداد کے وہ طالب ہوئے۔ پھر حیرت ہوتی ہے کہ جو حیوانوں سے اپنی ذہنی پستی کے لحاظ سے بہ مشکل ممتاز تھے ان ہی کے آگے ذوالقرنین کی طرف سے ایسی فرمائشیں پیش ہورہی ہیں جن کی تعمیل

حکمت وسائنس کی علمی وعملی مہارت کے بغیر ناممکن ہے۔

آخر خود سوچئے کہ لوہے' تابنے جیسی دھاتوں کو پہاڑوں کے اندر سے برآمد کرنا اور آلائشوں سے پاک کر کے چادروں اور تختوں کے قالب میں اسی لوہے کو ڈھالنا' یہ اور اسی قسم کی باتوں کی قدرت غیر معمولی ودماغی تربیت اور عملی مشق ومہارت کے بغیر کیا پیدا ہو سکتی ہے؟ آپ ذوالقرنین کے اس قصہ میں غور کیجئے کہ قرآن خود اطلاع دے رہا ہے کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان رہنے والی قوم نے جب یاجوج و ماجوج کے مفسدانہ حرکات کی شکایت کی اور ان کی حکومت سے دستگیری کے متوقع ہوئے تو ان سے ذوالقرنین نے

اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ

''لوہے کی تختیاں میرے لئے مہیا کرو''

کی بھی فرمائش کی اور

اٰتُوْنِیْٓ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا

''اور آؤ انڈیل دیں اس پر پگھلے ہوئے تابنے کو''

کا حکم بھی دیا تھا اور یہ ساری چیزیں ذوالقرنین کی خدمت میں ان کی فرمائش کے مطابق اسی قوم کی طرف سے پیش کر دی گئیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ جب دونوں پہاڑوں کے بیچ میں اپنی مشہور تاریخی دیوار (سدّ) کی تعمیر کا فیصلہ ذوالقرنین نے کر لیا تو اس عجیب وغریب سائنٹیفک تعمیر میں منجملہ اور باتوں کے اس قوم کی عملی خدمات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا تھا' خصوصاً جب گرم کر کے لوہے کی تختیوں کو چاہا گیا کہ دہکا کر ان کو گویا آگ ہی بنا دیا جائے تو اتنی طویل وعریض دیوار کی آہنی تختیوں کو جو اینٹوں کی طرح تہہ بہ تہہ ایک دوسرے پر نیچے سے اوپر تک جمادی گئی تھیں' ان کو ہوا دے کر تپانے اور گویا آگ بنا دینے کا کام قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی قوم کے ان ماہروں نے انجام دیا جو اس کام میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے' قرآنی الفاظ

قَالَ انْفُخُوْا حَتّٰٓی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا

''ذوالقرنین نے کہا کہ پھونکو تا ایں کہ بنا دیا اس آہنی دیوار کو آگ۔''

سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے پھر اس کاروائی کے بعد تہہ بہ تہہ جمائی ہوئی ان آہنی اینٹوں

کے متعلق یہ ارادہ کیا گیا کہ بجائے مٹی یا گچ وغیرہ کے قطرا (پگھلے ہوئے تانبے) کے گارے سے ان کو جوڑا جائے' دہکتی ہوئی ایسی دیوار جو نیچے سے اوپر تک آگ ہی آگ ہو اس کی ہر ایک اینٹ تک پگھلے ہوئے تانبے کو پہنچانا' میرے نزدیک تو اب بھی ناقابل تصور ہی سی بات معلوم ہوتی ہے' لیکن جس واقعہ کو ہم سوچ نہیں سکتے' قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی خاص حکیمانہ اور سائیٹفک تدبیروں سے کام لے کر اسی کو کر کے انہوں نے دکھا ہی دیا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ''اتونی افرغ علیه قطرا (آؤ اس قطر (پگھلے ہوئے تانبے) کو انڈیل دیں) مذکورہ بالا قرآنی الفاظ کا اقتضا بظاہر یہی ہے کہ اس حیرت انگیز عمل میں بھی ذوالقرنین نے ان لوگوں کی عملی چابک دستیوں سے استفادہ کیا تھا۔

قصہ کے نتائج یعنی فرائض حکومت:

بہر حال میں تو اسی مذکورہ بالا وجوہ کی بنیاد پر اس نتیجے تک پہنچا ہوں کے سفر کے پہلے مرحلے میں جیسے ذوالقرنین نے ان لوگوں کے قلب اور روح کی تصحیح و تصفیہ کو اپنی حکومت کا فرض قرار دیا تھا جن کا حق تعالیٰ نے ان کو حاکم بنا دیا تھا' اسی طرح سفر کے تیسرے مرحلہ میں اپنی رعایا کو ذہنی و دماغی پستیوں کے ازالہ کو اپنی حکومت کا فریضہ قرار دے کر ان میں ایسی غیر معمولی علمی و عملی صلاحیتیں پیدا کر دیں کہ آج بھی ہم جب ان کو سوچتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے البتہ سفر کے درمیانی مرحلہ میں ذوالقرنین کی رسائی جب اس مقام پر ہوئی:

جہاں انہوں نے آفتاب کو دیکھا کہ:

تَطْلُعُ عَلٰی قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا۔

''طلوع ہو رہا ہے ایک ایسی قوم پر جن کے اور آفتاب کے درمیان ہم نے کوئی اوٹ نہ رکھی تھی۔''

تو آگے صرف یہ فرماتے ہوئے کہ:

كَذٰلِكَ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا۔

''یوں ہی ہے' اور جو کچھ بھی ذوالقرنین کے آگے پیش آیا تھا ہم واقفیت کے لحاظ سے

اس پر حاوی تھے۔"

اس مرحلہ کا تذکرہ ختم کر دیا گیا ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلے اور تیسرے مرحلہ میں جن لوگوں سے ذوالقرنین ملے تھے وہ ذوالقرنین کی امداد کے محتاج تھے' قلب و روح کی اصلاح کی ضرورت جن کو تھی ان کی بھی ضرورت پوری کی گئی اور دماغی و ذہنی پستی کے جو شکار تھے ان کی ان کمزوریوں کا علاج بھی کیا گیا لیکن درمیانی مرحلے کے ملنے والے غالباً اس قسم کے نقائص سے پاک تھے اسی لئے ان کے متعلق ذوالقرنین کے خدمات کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا گیا۔

اور ان کی خصوصیت کا اظہار جن الفاظ میں کیا گیا ہے یعنی یہ کہ آفتاب جس وقت طلوع ہوتا تھا اس وقت ان کے اور آفتاب کے درمیان کسی قسم کا اوٹ نہ تھا۔ ان الفاظ سے میری سمجھ میں کچھ ایسا آتا ہے کہ یہ حالت صرف طلوع آفتاب کے وقت تک محدود تھی' ورنہ یہ احتمال کہ نہ وہ مکانوں ہی میں رہتے تھے اور نہ کسی قسم کا لباس پہنتے تھے بلکہ ان کی ساری زندگی کھلے میدانوں میں ننگے بدن گزرتی تھی۔ اسی لئے ان کے اور آفتاب کے درمیان کسی قسم کا کوئی پردہ نہ تھا' کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے' وحشی سے وحشی قومیں بھی کم از کم دھوپ' بارش' سردی' گرمی وغیرہ سے بچنے کے لئے مصنوعی مکانوں میں نہ سہی لیکن غاروں اور قدرتی گڑھوں میں پناہ لیتی ہیں۔ اسی طرح سوت اور اون کے بنے ہوئے کپڑے نہ سہی مگر چمڑوں یا پتوں ہی سے بدن کو ڈھانکتی ہیں۔

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس حال کو صرف اس خاص وقت کے ساتھ اگر محدود سمجھا جائے جس وقت آفتاب طلوع ہوتا ہے اور یہ قرار دیا جائے کہ ان کے مکانات کی تعمیر اس طریقہ پر ہوئی تھی کہ طلوع کے وقت کی شعاعوں سے مستفید ہونے کا موقع ان کو بھی اور ان کے گھروں کو بھی روزانہ میسر آتا تھا تو قطع نظر اس کے اس قسم کے تعمیری سکیم بعید از عقل بھی نہیں ہے ہم اس سے اگر اس نتیجہ تک پہنچیں کہ قدرتی قوانین سے استفادہ کے سلسلہ میں اس قوم کا شعور کافی روشن اور بیدار ہو چکا تھا وہ جسمانی صحت کے گر سے بھی واقف تھے اور جسمانی صحت کا اثر دماغی اور قلبی صحت پر کیا اور کس حد تک پڑتا ہے اس کا بھی عملی تجربہ ان لوگوں کو تھا اور شاید اسی وجہ سے

ذوالقرنین کی خدمات کی ضرورت ان کو نہ ہوئی تو قرآنی الفاظ میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس ذہنی انتقال کے لئے گنجائش ضرور پائی جاتی ہے خواہ یہ گنجائش کسی درجہ کی ہو بلکہ اس مقام پر پہنچ کر جسمانی و دماغی و قلبی صحت مندیوں کے جو غیر متوقع نمونے ذوالقرنین کے سامنے پیش ہوئے تھے ہوسکتا ہے کہ قد احطنا بما لدیہ خبرا۔ (اور ہم حاوی تھے واقفیت کے لحاظ سے ان باتوں پر جو ذوالقرنین کے سامنے پیش آئی تھی) کے الفاظ سے ممکن ہے کہ ان ہی کی طرف اشارہ ہو۔

بہر حال یہ بھی جو کچھ عرض کیا گیا ہے صرف ایک ذہنی انتقال ہے [1] قرآنی الفاظ کا یہی یقینی مطلب اور مراد ہے اس کا دعویٰ نہ کیا گیا ہے اور نہ کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ سفر کے درمیانی مرحلہ میں ذوالقرنین کی کسی خدمت اور کام کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ذوالقرنین کے اس قصے سے حکمرانی کے متعلق چند اہم بنیادی اصول کی طرف رہنمائی ہوتی ہے اور سمجھنے والے اگر سمجھنا چاہیں تو حکومت کے فرائض میں اس قصے کی روشنی میں ایسے فرائض کو بھی پا سکتے ہیں جنہیں بہتر سے بہتر ترقی یافتہ حکومتوں کی فہرست فرائض میں ہم نہیں پاتے۔

پھر ذوالقرنین کی سائنٹیفک تاریخی دیوار تیار ہوگئی تو قرآن میں ہے کہ اس دیوار کی طرف اشارہ کر کے ذوالقرنین نے کہا تھا۔

هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ۔

---

[1] ذہنی انتقال کا مطلب وہی ہے جس کا شرعی ثبوت ان حدیثوں میں ملتا ہے جن میں آیا ہے کہ بدفالی یعنی تطیر سے تو رسول اللہ ﷺ منع فرمایا کرتے تھے لیکن فال نیک اور شگون کی یہی نہیں کہ ممانعت نہیں فرمائی گئی بلکہ سہل اپنا نام جہادی سفر میں مثلاً کوئی آپ کو بتاتا تو فرماتے کہ اللہ تعالیٰ معاملہ کو سہل اور آسان کریں گے اس کی متعدد مثالیں حدیثوں میں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ سہل جس کا نام رکھا گیا تھا نام رکھنے والے کی مراد یہ قطعاً نہ تھی کہ جہادی مہم میں سہولت ہوگی بلکہ حق تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن بڑھانے کے لئے رسول اللہ ﷺ کا ذہن مبارک اس کی طرف منتقل ہوا۔ ورنہ نام رکھنے والے کی مراد تو اس لفظ سے اس شخص کی ذات ہی تھی جس کا نام اس نے سہل رکھا تھا۔

''یہ میرے رب کی مہربانی ہے پھر جب میرے رب کا وعدہ آ جائے گا تو کر دے گا اس کو ریزہ ریزہ۔''

اس میں بھی ان لوگوں کے لئے جنہیں حکومت کا اقتدار قدرت کی طرف سے عطا ہوتا ہے' یہ درس پوشیدہ ہے کہ اپنے اقتدار کے متعلق ہمیشہ اس واقعہ کے احساس کو اپنے اندر زندہ رکھنا چاہئے اور اس سے کبھی غافل نہ ہونا چاہئے کہ دوسرے کا یہ فقط بخشا ہوا اختیار ہے' بخشنے والے کی صرف رحمت اور مہربانی ہے کہ اقتدار کی اس قوت سے اس نے ان کو نوازا اور سرفراز فرمایا ہے۔ یہی حقیقت ہے' یہی واقعہ ہے' اس کے سوا سوچنے والے جو کچھ بھی سوچتے ہیں یا سوچ سکتے ہیں۔ وہ قطعاً جھوٹ اور ایسا تصور ہو گا جس کا واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یقین کیجئے کہ حکمرانوں میں اس احساس کا دباؤ جب تک اور جس حد تک رہے گا اسی حد تک ان کی سمجھ میں یہ آئے گا کہ حکومت حکمرانوں کے لئے نہیں' بلکہ ان محکموں کے لئے ہوتی ہے جن کی انفرادی توانائیاں اجتماعی شکل میں سمٹ کر حکومت کا اقتدار اور قوت بن جاتی ہیں۔ رعایا کی طرف سے جو فرائض حکمرانوں پر عائد ہوتے ہیں' ان فرائض سے صحیح معنوں میں وہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو اپنے اقتدار کی جوہری بنیاد کو اپنی نگاہوں سے اوجھل ہونے نہیں دیتے۔ اس قصے میں پڑھئے' دونوں پہاڑوں کے درمیان کی رہنے والی آبادی کی طرف سے ذوالقرنین کے پاس جب یاجوج ماجوج کے مظالم کی شکایات پہنچائی گئی اور اسی کے ساتھ یہ پیشکش بھی ان کے آگے رکھی گئی۔

هَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰٓ اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا۔

''ہم آپ کے لئے خراج (ٹیکس) ادا کریں اس مہم کے لئے ہمارے اور یاجوج و ماجوج کے درمیان دیوار بنا دیجئے''

شاید ان کی خواہش تھی کہ اس کام کے مقابلہ میں کوئی دوامی ٹیکس ان پر عائد کر دیا جائے اور بخوشی اس بار کو برداشت کرنے پر آمادہ تھے تو وہی خرج یا خراج و باج یعنی ٹیکس جسے مختلف نام نہاد ناموں اور مختلف حیلوں اور بہانوں سے حکومتیں اپنی رعایا سے عموماً وصول کرتی رہتی ہیں اور ان کو جائز حق اپنا سمجھتی ہیں' اس خرج کو خود رعایا کے نمائندے بصد خندہ جبینی اپنی طرف سے

حکمران کی خدمت میں پیش کرتے ہیں مگر حکمران کی طرف سے انہیں جواب ملا:

مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ

''میرے رب نے (جن چیزوں پر) مجھے قابو دے رکھا ہے وہی میرے لئے بہتر ہے''

جس کے معانی یہ ہیں کہ اس خرج (ٹیکس) کو ذوالقرنین نے ان لوگوں پر لگانا بھی منظور نہ کیا بلکہ ان کی دستگیری کے لئے ان کی حکومت جو کچھ کر سکتی تھی اس کو اپنی طرف سے خود ان ہی کے آگے پیش کرتے ہوئے' ان سے صرف ان ہی چیزوں کا مطالبہ کیا جو ذوالقرنین کے پاس غالباً نہ تھیں' یا ہوں گی تو اس کام کے لئے کافی نہ ہوسکتی تھیں جن کی ضرورت تھی۔

ان نتائج کے سوا قصہ میں زبر حدید (آہنی تختیاں) قطر (مس گداختہ) اور جو خدمات جس طریقہ سے بھی ان سے لئے گئے ان کو بھی پیش نظر رکھتے ہوئے قصہ کی ابتدا میں۔

اٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا۔

دے رکھے تھے ہم نے ذوالقرنین کو (حکومت کے متعلق) ہر پہلو کے لحاظ سے ذرائع''

کے الفاظ سے جو اطلاع دی گئی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے قیام و بقا و ارتقاء کے لئے جن جن امور کی ضرورت ہوتی ہے یہ ساری باتیں ذوالقرنین کو حاصل تھیں' بعض مفسرین نے تو ان ہی قرآنی الفاظ کی روشنی میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ

كل مايتوصل به الى المقصود من علم و قدرة او آلة (تفسیر ابوالسعو دسورۂ کہف)

''اسی سلسلہ میں یہاں تک لکھ دیا کہ **انه سخر له السحاب** (یعنی بادل بھی ذوالقرنین کے قابو میں کر دیئے گئے تھے) واللہ اعلم اس کا کیا مطلب ہے۔''

خیر مجھے یہ کہنا ہے کہ ایسے مصنوعات وآلات جن کی تیاری میں حکمت و سائنس کے اکتشافات ونظریات سے امداد حاصل کی گئی ہو۔ ذوالقرنین کے قصے کے ان اشاروں سے یقیناً اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے کہ حکومت کے استحکام واستواری اور ترقی کے لئے ان سے استفادہ میں یہی نہیں کہ کسی قسم کا کوئی حرج نہیں ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآنی منشاہی کی تکمیل کی یہ ایک

شکل ہوگی اور کون کہہ سکتا ہے کہ مستقبل کی تاریخ میں مہدویت کے جس عہد مبارک و مسعود کی ایمانی حکومت کی بشارتیں قریب قریب حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔ اس حکومت کی تاسیس میں عہد ماضی کے ایک مومن حکمران کی مذکورہ بالا مثالی حکومت کے نمونے کو پیش نظر نہ رکھا جائے گا خصوصاً قرآن کے مقدس اوراق میں جب اس حکومت کی بنیادوں کو محفوظ فرما دیا گیا ہے۔ اور میں نے جو یہ عرض کیا تھا کہ دجالی فتنے کے اختتام کے بعد یہ سوال جو پیدا ہوتا ہے کہ صالح نظام کے قائم کرنے کا ارادہ اگر کیا جائے تو ذوالقرنین کے اس قصے سے اس نظام صالح کی جوہری بنیادوں کو غور و فکر کرنے والے چاہیں تو فراہم کر سکتے ہیں' خواہ عدداً بظاہر وہ چند ہی باتیں معلوم ہوتی ہوں' لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان ہی سے قلبی و روحانی و دماغی و جسمانی فلاح و بہبود کے ضوابط بآسانی اخذ کئے جا سکتے ہیں اور قصہ کی صحیح قیمت جہاں تک میری ناچیز رائے ہے شاید یہی نتیجے ہو سکتے ہیں۔

باقی اس قسم کے سوالات کہ ذوالقرنین حکمران کا نام تھا یا لقب؟ اور لقب تھا تو واقعی اس مومن بادشاہ کا نام کیا تھا؟ اور گزشتہ زمانے کے جن کشور کشاؤں کا تذکرہ تاریخوں میں ملتا ہے ہم ذوالقرنین ان میں سے کسے قرار دے سکتے ہیں؟

یا بقول ابوریحان البیرونی۔ آیا یہ یمن کا وہ ذوالقرنین تھا' جس کا نام کہتے ہیں کہ شمس بن عمیر تھا اور کنیت ابوکرب ➊ تھی' یا حضرت دانیال علیہ السلام کی خواب والا وہ مشہور بادشاہ ہے جو رویا میں ان کو ایک مینڈھے کی شکل میں دکھایا گیا تھا۔ ''جس کے دو سینگ (قـــرنیـــن) ہیں'' (باب) کہتے ہیں اور دانیال کے صحیفہ سے بھی معلوم ہوتا ہے یہ دو سینگ والا (ذوالقرنین) مینڈھا فارس کا بادشاہ تھا' جسے بائبل میں ''خورس'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور انگریزی میں اسی نام کا تلفظ (CYRUS) سائرس کیا جاتا ہے۔ خسرو اور کیخسرو اسی کو شاید کہتے ہیں۔

➊ اپنی مشہور کتاب الآثار الباقیہ میں بیرونی نے یمن کے بعض شعراء کے کلام سے بھی اس خیال کی تائید میں شہادت اخذ کی ہے۔ ''بالغ المشارق و المغارب یبتغی'' کا دعویٰ ان کے متعلق شاعر نے کیا ہے سب سے بڑا قرینہ یہ پیش کیا ہے کہ ذونواس' ذوالکلاع الغرض لقب کی ابتدا میں ذو یمنی سلاطین کا عام قاعدہ تھا۔ ۱۲۔

ذوالقرنین سکندر رومی نہیں:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بدقسمتی سے عام مسلمانوں میں جو یہ غلط بات مشہور ہوگئی ہے کہ ذوالقرنین مقدونیہ والا رومی اسکندر تھا' اس بے بنیاد افواہ سے تو مذکورہ بالا دونوں احتمالات ایک گونہ مستحق توجہ ہوسکتے ہیں' لیکن پھر بھی فقیر کا ذاتی احساس یہی ہے کہ ان احتمالات میں سے کسی احتمال کی تعیین یا کسی جدید احتمال کو پیدا کرنا تاریخ کا مسئلہ تو ہوسکتا اور ممکن ہے مورخ کے لئے یہ دلچسپ تاریخی مشغلہ ہو' لیکن قرآنی مطالب واغراض کے سمجھنے اوران سے مستفید ہونے کے لئے تاریخ کے فیصلوں کا نہ ہم انتظار کرسکتے ہیں اور نہ قرآن کی شان کے مناسب یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن فہمی کے لئے ہمیں مورخوں کے فیصلہ کا منتظر بنایا گیا ہو۔

بہرحال جب خود ذوالقرنین ہی کی شخصیت کے متعین کرنے کی ضرورت قرآن فہمی کے سلسلہ میں غیر ضروری ہے تو ان ہی کے متعلق اس قسم کے ذیلی سوالات کہ پورب پچھم کے جن علاقوں کی طرف گئے وہ کون سے علاقے تھے؟ دونوں پہاڑوں کے بیچ کی سرزمین والی قوم دنیا کے کن دو پہاڑوں کے درمیان رہتی تھی؟ بند یا سد جوان دونوں! پہاڑوں کے درمیان باندھا گیا' ذوالقرنین کی یہ سائنٹیفک دیوار کہاں تھی؟ یا کہاں ہوسکتی ہے؟

قرآن جو کچھ ہمیں سمجھانا اور دینا چاہتا ہے اس کے لئے ان امور کی تحقیق کے بدرجہ اولیٰ ہم یقیناً محتاج نہیں اور نہ ہوسکتے ہیں۔ صرف یاجوج ماجوج کے مسئلہ کی نوعیت مذکورہ بالا امور سے مختلف ہے ہم اس جز پر آئندہ ان شاء اللہ بحث کریں گے اور اسی بحث پر سوۂ کہف تقریباً ختم ہو جاتی ہے۔

(۳) یاجوج وماجوج:

''یاجوج وماجوج'' کے الفاظ کی نوعیت قرآن کے ان اجمالی الفاظ واشارات کی نہیں ہے جن کی تفصیل وتشریح قرآنی مطالب ومقاصد کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے غیر ضروری ہو۔

اہمیت ان الفاظ کی یوں بھی ظاہر ہے کہ سورۃ کہف میں ذوالقرنین کے اس قصہ کے سوا قرآن ہی کی دوسری سورۃ الانبیاء نامی میں بھی ان دونوں الفاظ ''یاجوج وماجوج'' کو ہم اس

مشہور آیت میں پاتے ہیں۔

حَتّٰۤی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ ❶ یَّنْسِلُوْنَ۔

''تا آں کہ جب کھول دیئے جائیں یاجوج و ماجوج ہر حدب سے تیزی کے ساتھ وہ چل نکلے۔''

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

دو مختلف سورتوں کی دو مختلف آیتوں میں ''یاجوج و ماجوج'' کے ان الفاظ کو پا کر حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ من تبادر الا وہام فقط (یعنی خواہ مخواہ اس وہم میں لوگ مبتلا ہو گئے) کہ ذوالقرنین کی حکومت کی طرف سے دونوں پہاڑوں کے بیچ میں یہ دیوار جو بنائی گئی تھی اسی دیوار کو توڑ کر یاجوج وماجوج نکل پڑیں گے۔ حالانکہ بقول شاہ صاحب۔

ولیس فی القرآن ان هذا الخروج یکون عقیب الاندکاك متقبلا' بل فیه وعد باندکاکه فقط' فقد اندك کماوعد' اما ان خروجهم موعود بعد اندکاکه بدون فصل فلاحرف فیه۔ (فیض الباری شرح بخاری' جلد نمبر ۴ صفحہ نمبر ۲۳)

''قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ یاجوج و ماجوج کے خروج کا واقعہ دیوار کے ڈھے جانے کے ساتھ ہی پیش آئے گا بلکہ دیوار کے ڈھے جانے کا صرف وعدہ (سورۂ کہف) والی آیت میں کیا گیا ہے اور دیوار حسب وعدہ ڈھے گئی' لیکن یہ بات کہ دیوار کے ڈھے جانے کے ساتھ اسی وقت بغیر کسی وقفہ کے یاجوج و ماجوج نکل پڑیں گے قرآن میں کوئی حرف ایسا نہیں پایا جاتا جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔''

خلاصہ یہ ہے کہ سورۃ کہف کی آیت جس میں ذوالقرنین نے یہ کہتے ہوئے کہ ''دیوار کی تعمیر میں کامیابی یہ صرف میرے پروردگار کی مہربانی ہے' پھر جب میرے رب کا وعدہ آ جائے گا

❶ حدب کا ترجمہ میں نے حدب ہی کر دیا ہے آئندہ اس کی شرح آنے والی ہے۔ ''کوزہ پشتی'' کی صفت کو عربی میں حدب کہتے ہیں گویا سمجھنا چاہئے کہ پانی کے اندر سے زمین کا جو حصہ ابھر کر باہر نکل آیا ہے' ابھار کی وجہ سے کوزہ پشتی کی کیفیت اس میں چونکہ پائی جاتی ہے۔ اس لئے اس کو حدب کہا گیا ہے ''ینسلون کی تفصیل بھی آگے آ رہی ہے''۔

تو اس وقت وہی میرا رب اس کو ریزہ ریزہ کر دے گا" یعنی ﴿**هذا رحمة من ربی فاذا جاء وعد ربی جعله دکاء**﴾ اس آیت کا جو ترجمہ اور حاصل ہے خود ہی اس پر غور کیجئے اور دیکھئے اس میں ایسا کون سا لفظ ہے جس سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہو کہ دیوار کے گرنے یا گرانے اور توڑنے کے بعد یاجوج و ماجوج نکل پڑیں گے۔

مگر کیا کیجئے کہ عوام میں یہی مشہور ہو گیا ہے کہ بند ہونے کے بعد یاجوج و ماجوج کی قوم روزانہ اس کے توڑنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے اور آخر میں کسی نہ کسی دن اس کے توڑتے میں وہ کامیاب ہو جائے گی حالاں کہ اسی موقع پر اسی آیت سے پہلے قرآن ہی میں

فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا۔

(پس وہ (یعنی یاجوج و ماجوج والے) نہ اس دیوار پر چڑھنے ہی کی قدرت رکھتے تھے اور نہ ان کے بس میں یہ تھا کہ اس دیوار میں نقب لگائیں' یعنی سوارخ کریں) کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔"

بھلا نقب لگانا بھی جس دیوار میں ان کے بس کی بات نہ رہی تھی قرآن کی اس واضح اور صاف خبر کے بعد باور کرنا کہ وہی یاجوج و ماجوج والے اسی دیوار کو **دکاء** یعنی ڈھا ڈھو کر برابر کر دیں گے یا انہوں نے برابر کر دیا' قرآنی بیان سے لاپروائی کے سوائے اور کیا کہا جا سکتا ہے' بلکہ سچ تو یہ ہے کہ "**جعله دکاء**" (بنا دے گا میرا رب اس دیوار کو ریزہ ریزہ) کی قرآنی اطلاع سے بھی ان کو چشم پوشی ہی کرنی پڑتی ہے جو اس خبر کے مقابلہ میں کہتے ہیں کہ رب نہیں بلکہ یاجوج و ماجوج والے اس کو دکاء (ریزہ ریزہ) کر دیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ تفسیری روایتوں میں بھی بعض ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جن سے اسی عام پھیلے ہوئے خیال کی تائید ہوتی ہے' شاید اس عام پھیلے ہوئے خیال کا منشاء ممکن ہے تفسیری کتابوں کی یہی روایتیں ہوں لیکن' حضرت مولانا انور شاہ کشمیری (رحمۃ اللہ علیہ) جیسے ناقد علامہ اسی مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے جب فرماتے تھے کہ:

انا لم نجده فی القرآن ولا فی حدیث صحیح

یعنی (یاجوج و ماجوج کا خروج دیوار توڑ کر ہوگا) اس مسئلہ کو ہم نہ قرآن ہی میں

پاتے۔ اور نہ کسی صحیح حدیث میں (فیض الباری شرح بخاری جلد ۴ ص ۲۳)

تو اسی سے ان روایتوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے' حضرت شاہ صاحبؒ نے اس سلسلہ میں ترمذی کی اس روایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس میں ہے کہ:

''یاجوج وماجوج والے روزانہ دیوار کو کھودتے ہیں' پھر جب کچھ حصہ باقی رہ جاتا ہے تو گھروں کو یہ کہتے ہوئے پلٹ جاتے ہیں کہ کل ہم باقی کام کو پورا کر دیں گے' مگر انشاء اللہ تعالیٰ نہیں کہتے' پس جب دوسرے دن واپس ہوتے تو کھودی ہوئی دیوار کو اسی حال میں پاتے ہیں' یعنی کھودنے سے پہلے جیسی تھی ویسا ہی اس کو پائیں گے' یوں ہی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ تا آنکہ ایک دن انشاء اللہ ان میں سے کسی کی زبان سے نکل جائے گا تب صبح کو جب آئیں گے تو دیوار کھدی ہوئی حالت میں ملے گی' اسی کے بعد اس دیوار کو ڈھا دیں گے اور زمین میں فساد پھیلانے کے لئے نکل پڑیں گے''

مگر تفسیری روایات کے سب سے بڑے مشہور ناقد ابن کثیر کے نزدیک اس روایت کی سند میں غیر معمولی الجھنیں ہیں' خود حضرت شاہ صاحب کا ذاتی فیصلہ تو یہ ہے کہ مشہور نومسلم یہودی عالم ''کعب احبار'' کا یہ قول ہے اور اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہے [1] اور جب آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآنی الفاظ ہی نے ان روایتوں کی تصحیح کی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے قرآن خبر دے رہا ہے کہ دیوار میں نقب زنی بھی ان کے بس کی بات نہ تھی تو پھر اسی دیوار کے متعلق یہ باور کرنا کہ

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے شرح بخاری (جلد ۴ ص ۲۴) شاہ صاحبؒ کے الفاظ ہیں کہ ''یحکم وجدانی انہ لیس بمرفوع بل ھو من کعب نفسہ۔'' جہاں تک میرا خیال ہے مسلمانوں میں یاجوج وماجوج کے متعلق زیادہ تر قصے یہودیوں ہی کی کتابوں سے ماخوذ ہیں اور جیسا کہ قدیم مکاشفات کا قاعدہ تھا کہ استعارے کے رنگ میں لوگ مطلب کو بیان کرتے تھے۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ یاجوج وماجوج باہر نکلنے کے لئے باہمی اتفاق واتحاد کی کوشش میں دن بھر اپنی قوت تقریر صرف کیا کرتے تھے لیکن رات کو جب واپس ہوتے تو اختلافات پھر تروتازہ ہو جاتے۔ دیوار کو زبان سے چاٹ چاٹ کر پتلی بنانے کا مطلب ممکن ہے کہ یہی ہو۔ اس زمانہ میں دیکھا جاتا ہے کہ یورپ کی قومیں اپنے مشکلات کو کمیشن اور مجلس' انجمن وغیرہ کی تقریروں سے حل کرتی ہیں بہرحال ان یہودی روایتوں کا نہ قرآن ہی ذمہ دار ہے اور نہ اس کے لانے والے پیغمبر ﷺ کے صحیح بیانات میں ان کا منشا ملتا ہے۔ ۱۲

یاجوج وماجوج والے اس میں صرف نقب لگانے ہی میں کامیاب نہ ہوئے بلکہ اس کا دکاء (یعنی ریزہ ریزہ) کر کے رکھ دیا' یہ کچھ سمجھ میں آنے کی بات ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ دیوار کا حق تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت پر منہدم ہو جانا' یہ بجائے خود ایک الگ واقعہ ہے جس کی اطلاع سورۂ کہف میں دی گئی ہے اور یاجوج و ماجوج کا کھول دیا جانا یا ان کا خروج جس کی پیشین گوئی سورۃ الانبیاء میں کی گئی ہے یہ دوسرا مستقل واقعہ ہے' اسی لئے ان دونوں واقعات کا ذکر بھی دو مختلف صورتوں میں کیا گیا ہے۔

اس عام غلط فہمی کے ازالہ کے بعد اب میں چاہتا ہوں کہ یاجوج و ماجوج کے متعلق قرآن سے جو معلومات فراہم ہوتی ہیں ان کو ایک خاص ترتیب کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کر دوں' ذیلاً اس سلسلہ میں معلومات کے دوسرے ذرائع سے بھی کچھ کام لیا جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ سرسری طور پر قرآنی آیات سے گزرنے والوں کو بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن نے ''یاجوج و ماجوج'' کے ذکر میں حد سے زیادہ اجمال سے کام لیا ہے لیکن آپ اگر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ باوجود اجمال کے پھر بھی قرآن نے اس قوم کے حال کو چار مختلف ادوار' (Periods) میں گویا تقسیم کر کے بیان کیا ہے۔

یاجوج وماجوج کی خصوصیات:

اس سلسلہ میں قرآن سب سے پہلے ان کے جس حال سے روشناس کراتا ہے وہ اسی سورۂ کہف کی آیت:

اِنَّ یَاجُوْجَ وَ مَاجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ۔

''یاجوج وماجوج زمین میں بگاڑ پیدا کرنے والے لوگ ہیں''

کے الفاظ سے سمجھا جاتا ہے۔ ذوالقرنین پہاڑوں کے بیچ رہنے والی قوم میں جب پہنچے تو اس قوم نے ان ہی الفاظ میں ''یاجوج و ماجوج'' والوں کے متعلق ان کے یعنی ذوالقرنین کے دربار میں رپورٹ پیش کی۔ یہ واقعہ دنیا کے کس خطہ کا ہے؟ اور کس زمانہ کا ہے؟ عرض کر چکا ہوں اس کا پتہ چلانا آسان نہیں ہے لیکن واقعہ کہیں کا ہو اور جس زمانہ میں بھی پیش آیا ہو' اتنا تو بہر حال

رپورٹ کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں فساد پیدا کرنا یہی اس قوم کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ رہی اس فساد پیدا کرنے کی تفصیلات تو ظاہر ہے کہ فساد عربی زبان کے لفظ اصلاح کا مد مقابل ہے۔ بنی آدم کے مختلف افراد میں تعلقات کے سلجھانے اور ان کے امن و امان کے ساتھ رہنے کی کوشش کا نام اصلاح ہے' اسی کے بالمقابل اس قسم کی حرکات جن سے باہم لوگوں میں پھوٹ اور نفاق' لاگ' ڈانٹ' عداوت و بغض کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں اور ملک کے آبادکاروں میں باہم ایک دوسرے پر اعتماد باقی نہ رہے۔ ایک دوسرے کی فکر میں لگ جائے' جان و مال' عزت و آبرو لوگوں کی خطرے میں پڑ جائے یہی شکلیں ہیں جن کی تعبیر صلاح کے مقابلہ میں فساد کے لفظ سے کی جاتی ہے۔

بہرحال یاجوج و ماجوج کی یہ پہلی قومی خصوصیت ہے۔ قرآن نے ان کی قومی زندگی کے پہلے دور میں اسی خصوصیت یعنی ''فساد فی الارض'' (زمین میں بگاڑ پیدا کرنے) کی نشاندہی کی ہے۔

دوسرا دور (Period) وہ ہے جب ذوالقرنین نے اپنی سائنٹیفک دیوار قائم کر کے دوسری قوموں تک ان کی رسائی کی راہ بند کردی تھی۔ قرآن نے اس دور کے حال کی تعبیر:

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ۔

''اور چھوڑ دیا ہم نے بعض ان کے بعض کے ساتھ موج مارنے لگے''

کے الفاظ سے کی ہے' جس کا مطلب یہی ہوا کہ غیر قوموں کے مقابلے میں فساد فی الارض (زمین میں بگاڑ پیدا کرنے کی) کاروائیوں کو وہ اختیار کرتے تھے [1] لیکن غیروں سے

[1] بعض مفسرین نے قرآن ہی کی ایک دوسری آیت یعنی واذا تولی سعی فی الارض لیفسدفیها ویهلك الحرث والنسل (جب وہ پیٹھ پھیرتا ہے تو دوڑتا پھرتا ہے زمین میں تاکہ فساد پیدا کرے اس میں اور برباد کرتا پھرتا ہے کھیتوں اور مویشیوں کو) اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یاجوج وماجوج والوں کا وطیرہ یہی تھا کہ کھیتوں اور مویشیوں کو برباد کرتے تھے۔ گویا مفسدون فی الارض ہونے کی خبر یاجوج وماجوج والوں کے متعلق جو دی گئی ہے' اس کا یہی مطلب تھا۔ لیکن کھیتوں اور مویشیوں کو برباد کرنے کا ذکر تو مذکورہ بالا آیت میں فساد فی الارض کے جرم کے بعد کیا گیا ہے جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کھیتوں اور مویشیوں کے برباد کرنے کے جرم کے سوا فساد فی الارض والا جرم اپنی علیحدہ مستقل نوعیت (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

رخ جب ان کا دیوار بن جانے کی وجہ سے پھر گیا تو آپس ہی میں باہم ایک دوسرے کے ساتھ ایسی زندگی گزارنے لگے جسے قرآن نے خاص الفاظ یعنی **بعضھم یومئذ یموج فی بعض** کے ذریعہ ادا کیا ہے۔ اس میں ان تعلقات کی کس نوعیت اور کیفیت کی تعبیر ہے؟ غیروں سے مایوس ہو جانے کے بعد یاجوج و ماجوج والے زندگی کے اس دور میں لڑتے بھڑتے اور باہم دست وگریبان رہتے تھے اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے عربی زبان میں بیسیوں تعبیریں مل سکتی تھیں۔

اسی طرح میل ملاپ، باہمی امداد و مواساۃ، موانست کی زندگی کی تعبیر کے لئے بھی اس زبان میں الفاظ کی کمی نہ تھی۔ لیکن تعبیر و بیان کے ان دونوں طریقوں کو چھوڑ کر قرآن نے **بعضھم یومئذ یموج فی بعض** کے الفاظ جو یہاں استعمال کئے ہیں واضح طور پر ان دونوں حالتوں میں سے کسی خاص حالت کو متعین کرنا دشوار ہے۔

لفظ موج کی تشریح:

لغۃً موج کے لفظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تلاطم اور طوفان کے وقت سمندر اور دریا میں موجوں کی جو کیفیت ہوتی ہے، یعنی سمندر کی سطح بجائے ساکن کے صرف لرزش و اضطراب، بے چینی اور بے قراری کی تصویر بن جاتی ہے۔ اور لامحدود بے شمار موجیں اٹھ کر ایک دوسرے کو دھکیلتی ہی چلی جاتی ہیں اور اسی طرح ہر پچھلی موج پہلی کو آگے بھی بڑھاتی رہتی ہے۔ ہم ان موجوں کے متعلق یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ایک دوسرے پر چڑھ جانا بھی چاہتی ہے۔ اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ہر ایک کی ہستی دوسری ہستی سے وابستہ بھی ہے اور ایک دوسرے

(گزشتہ سے پیوستہ) رکھتا ہے اور وہ بھی اصلاح اور بنی آدم کے باہمی تعلقات کے سلجھاؤ کے مقابلہ میں ان کے تعلقات کو بگاڑ کر امن وامان اور باہمی اعتماد کے اطمینان کی زندگی کو برباد کرنا ہوسکتا ہے۔ قرآن ہی میں دوسری جگہ ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جن میں اپنی برتری اور علو کا خبط سما جاتا ہے ان کی طرف بھی فساد ہی کے جرم کو منسوب کیا گیا ہے فرمایا گیا ہے "**تلك الدار الاخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا في الارض ولا فسادا** جس سے معلوم ہوا کہ اپنی برتری اور حاکمانہ اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے لوگوں میں پھوٹ ڈالنا اسی پالیسی کو یہ لوگ اختیار کر لیتے ہیں۔

کو آگے بڑھنے اور بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی بھی چلی جاتی ہے۔ آپس میں موجیں ایک دوسرے سے گویا لڑتی بھی ہیں لیکن ان میں ہر ایک کی بقا کی ضامن بھی باہم یہی موجیں اور ان کے تموجی تعلقات ہی ہوتے ہیں۔

الغرض بعضهم یومئذ یموج فی بعض کے الفاظ سے صرف یہ مطلب نکالنا کہ غیروں سے ہٹ جانے کے بعد یاجوج و ماجوج والے باہم ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے ہی رہتے تھے یا اس کے بالمقابل یہ سمجھنا کہ جیسے سمندر کی موجوں کا وجود باہم ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ وہم رشتہ رہتا ہے۔ اور ہر موج دوسری موج کو آگے بڑھاتی ہے' اسی طرح یاجوج و ماجوج والے بھی آپس میں بجائے دست و گریباں رہنے کے ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا تعلق رکھتے تھے' یعنی غیروں میں تو بجائے اصلاح اور سنوار کے فساد اور بگاڑ پیدا کرتے تھے' لیکن آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے باہم ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ ان دونوں مطالب میں سے کسی ایک مطلب کے ساتھ قرآنی الفاظ اور تعبیر کو محدود کر دینا غالباً صحیح نہ ہوگا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اگر یہی سمجھانا قرآن کا مقصود تھا تو ان دونوں مطالب میں سے ہر ایک کی تعبیر کے لئے عربی زبان میں جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں' سرمایہ کی کیا کمی تھی؟ پھر جب ان ساری تعبیروں کو ترک کر کے ایک مخصوص تعبیر اس موقع پر قرآن میں جو اختیار کی گئی ہے۔ ہمیں اس کی مصلحت سے چشم پوشی نہ کرنی چاہئے اور لاپروائی سے کام لیتے ہوئے ان دونوں مطالب میں سے کسی ایک مطلب کا سرسری ذکر کر کے آگے بڑھ جانا قرآنی الفاظ کی ناقدری ہوگی۔ ہمیں اس ذمہ داری کو محسوس کرنا چاہئے کہ خالق کائنات کے کلام پر غور کر رہے ہیں۔ ہر بولنے والے آدمی کے کلام پر اس لاہوتی کلام کو قیاس کرنا مناسب نہ ہوگا۔

سوال یہی ہوتا ہے کہ پھر ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھا جائے؟ ظاہر ہے کہ موج کا لفظ سمندر اور دریا کی متلاطم سطح اور اس پر ابھرنے والی موجوں کی جس تصویر کو بے نقاب کر رہا ہے۔ اسی تصویر کو ہم اپنے سامنے رکھ کر قرآن جو کچھ سمجھانا چاہتا ہے اسے کیوں نہ سمجھیں؟ کوئی مانے یا نہ مانے لیکن فقیر کا ذہن تو یہی پاتا ہے کہ غیروں سے ہٹ جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

زندگی کے اس دور میں یاجوج و ماجوج کی قوم کی زندگی صرف اضطراب اور بے قراری' ہنگامہ اور لرزش و جنبش بن کر رہ گئی تھی۔ ایسے مشاغل میں وہ مبتلا تھے' جن میں صبح و شام' شب و روز' تگ و دو' دوڑ دھوپ' آمدورفت' چلنے' پھرنے' دوڑنے' بھاگنے کے ہنگامے ہی برپا رہتے ہیں۔

یہ تو ان کی عام زندگی کا غالباً نقشہ تھا اور باہم اس قوم کی مختلف ٹولیاں ایک دوسرے کے ساتھ الجھی بھی رہتی تھیں' لیکن اسی کے ساتھ ان میں کوئی ٹولی دوسری ٹولی کو کلیتہً ختم کرنے کا بھی فیصلہ اس لئے نہیں کر سکتی تھی کہ اس میں خود اپنے وجود کا کے اختتام کا خطرہ اس کو محسوس ہوتا تھا' کچھ حالات ہی اس قوم کے ایسے تھے کہ نہ ایک دوسرے سے کلیتہً الگ ہی ہو سکتے تھے اور نہ ان میں کوئی دوسرے سے ٹوٹ کر یا جدا ہو کر فنا ہونے ہی کے لئے تیار تھا۔ گویا ان میں وہی تعلقات قائم تھے جو باہم دریا کی موجوں میں ہوتے ہیں' بایں طور کہ باہم ایک دوسرے کو دھکیلتے بھی رہتے تھے لیکن اسی کشمکش میں ارادی یا غیر ارادی طور پر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے میں مدد بھی مسلسل ملتی چلی جاتی تھی۔

اسی کے ساتھ میرا دھیان **بعضهم يومئذ يموج في بعض** کے الفاظ سے کچھ ادھر بھی جاتا ہے کہ تبعیض و تجزی یعنی باخود ہا یاجوج کی تقسیم بھی محدود نہ تھی' بلکہ موجوں کا جو حال ہوتا ہے کہ ان کو کوئی گننا چاہے تو گن نہیں سکتا۔ ان میں بڑی موجیں بھی ہوتی ہیں اور چھوٹی بھی' کچھ یہی حال معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں ان کا ہو گیا تھا کہ ان گنت بے شمار ٹولیوں میں وہ بٹے ہوئے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ غیروں میں تو فساد اور بگاڑ پیدا کرنا یہی یاجوج و ماجوج والوں کا شیوہ تھا اور خود باہم ایک دوسرے کے ساتھ موجی تعلقات رکھتے تھے۔

اب تک قرآن کی دو اطلاعوں سے اس قوم کی ان ہی دو خصوصیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ باقی ان کی زندگی کے دوسرے دور کو بیان کرتے ہوئے شروع میں **تركنا** (چھوڑ دیا ہم نے) کا لفظ جو پایا جاتا ہے کیا اس سے بھی کسی خاص واقعہ اور یاجوج و ماجوج والوں کے متعلق کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

کیا یاجوج و ماجوج اولادِ آدم نہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج والوں کے متعلق اتنی بات تو بہرحال ایک اجماعی مسئلہ ہے کہ یہ لوگ نہ دیوزادا اور نہ ان کا تعلق جن وغیرہ جیسی ہستیوں سے ہے' بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں بالاتفاق ان کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔ بعض ناقابل اعتبار روایتوں میں کچھ اس قسم کا اشارہ پایا جاتا ہے جس سے سمجھا جاتا ہے کہ ماں کی طرف سے حضرت حوا پر یاجوج و ماجوج کی نسل ختم نہیں ہوتی' بالفاظ دیگر ددھیال تو ان کی وہی ہے جو عام انسانی نسلوں کی ہے' لیکن ننھیال میں کچھ فرق پیدا ہو گیا ہے۔ [1]

لیکن ظاہر ہے کہ یہ سارے قصے سب تخمینی ہیں اور کوئی فیصلہ قطعی ان معاملات میں دشوار ہے' تاہم یاجوج و ماجوج کے متعلق رطب و یابس روایتوں کا جو ذخیرہ کتابوں میں پایا جاتا ہے اسی میں ایک روایت کے اندر یہ الفاظ بھی ملتے ہیں:

یاجوج و ماجوج لم یکن فیھم صدیق قط ولا یکون ابدا۔

(جلد۴ص۲۵۰ درمنثور)

''یاجوج و ماجوج میں کبھی کوئی صدیق ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔''

''صدیق'' ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ سے خصوصی تعلق رکھنے والوں کے ایک خاص طبقہ کی قرآنی تعبیر ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کے لئے بھی اسی صدیق کے لفظ کو قرآن نے استعمال کیا ہے۔ ہر قسم کے شکوک و شبہات سے جس کی تصدیق اور جس کا یقین کلیتہً

---

[1] یہ نہ میرا ذاتی خیال ہے اور نہ میری اپنی تراشی ہوئی کوئی تعبیر بلکہ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ سے خیال بھی ماخوذ ہے۔ فتوحات مکیہ میں انہوں نے لکھا ہے ابن حجر نے ''فتح الباری'' میں بھی اس کو بایں الفاظ نقل کیا ہے کہ ''**یاجوج و ماجوج من اولاد آدم لا من حواء عند جماھیر العلماء**'' (فتح الباری جلد۱۳ص۹۱) لفظی ترجمہ جس کا کہ یاجوج و ماجوج والے آدم کی ایسی اولاد ہے جو حوا سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ شیخ نے اسی کو جمہور علماء کا خیال قرار دیا ہے۔ ابن حجر کو ان کے دعویٰ پر تعجب ہوا ہے لیکن **العلماء** سے مراد علماء کشف و شہود ہوں تو شیخ کے کلام کی توجیہ کی ایک صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ خود خاکسار کو کشف و شہود سے تعلق نہیں لیکن بعض رویا میں خود اس کو بھی کچھ یہی دکھایا گیا تھا اور اسی لئے علماء کا مطلب میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ علماء رسوم مراد نہیں ہیں۔ آگے بھی اپنے اس خواب کے بعض اجزاء کی طرف اشارہ کروں گا۔ ۱۲

پاک ہو بظاہر ''صدیق'' اس کو کہتے ہیں۔

بہر حال ''تـر کنـا'' (چھوڑ دیا ہم نے) کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں جب وہ سراپا اضطراب اور ہمہ تن حرکت و گردش بن کر رہ گئے تھے۔ قدرت نے بھی ان کو چھوڑ دیا تھا اور آسمانی رہنمائی نے ان کی دستگیری نہیں کی۔ اسی لئے ان کی تاریخ کا یہ عہد نبوات و رسالات اور ان کے آثار سے بالکل خالی ہو گیا اور ایسی قوم یا امت جو آسمانی رہنمائی کی روشنی سے محروم ہو' مجبور ہے کہ اپنی شخصی' خاندانی' قومی عام انسانی تعلقات کے لحاظ سے اپنے آپ ہی قوانین بنائے۔ قدرت کی چھوڑی ہوئی یا متروک اللہ قوم' خود سوچئے کہ اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتی ہے۔ [1]

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے عہد کے مشہور طوفان کا ذکر فرماتے ہوئے قرآن میں ہے **وجعلنا ذریته هم البٰقین** (ہم نے نوح ہی کی نسل کو باقی رہنے دیا) اسی سے سمجھا جاتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی موجودہ نسل کا نسب نامہ نوح علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے' لیکن قرآن ہی کی سورہ ہود میں یہ آیت بھی ملتی ہے۔ **قیل یانوح اهبط بسلم منا و برکت علیك وعلی امم ممن معكط و امم سنمتعهم ثم یمسهم منا عذاب الیم** (یعنی کہا گیا کہ اے نوح اتر جا سلامتی ہو تیرے ساتھ میری جانب سے اور برکتیں تجھ پر بھی ہوں اور ان امتوں پر بھی ہوں جو تیرے ساتھ ہیں اور کچھ امتیں ہیں جنہیں آئندہ زمانہ میں ہم متاع اور سرمایہ بخشیں گے' پھر ان کو پکڑے گا ہماری طرف سے دردناک عذاب) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام اور کشتی میں جو ان کے ساتھ تھے ان کے سوا بھی کچھ امتیں ایسی ہیں جنہیں آئندہ زمانہ میں دنیاوی مال و متاع سے استفادہ کا موقع دیا جائے گا' پھر ان کو عذاب پکڑے گا' جس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں کو جو کچھ دیا جائے گا' اس سے غلط کام لیں گے بہر حال قرآن کی دونوں آیتوں کو پیش نظر رکھ کر اگر یہ سمجھا جائے کہ بقا کی خبر نوح کی ذریت ہی کے متعلق جو دی گئی ہے' یہ ان لوگوں کی حد تک محدود ہے جن کی طرف نوح علیہ السلام مبعوث تھے' گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ ان لوگوں میں صرف نوح علیہ السلام کی ذریت طوفان سے بچ کر رہ گئی اور آئندہ زمانے میں مال و متاع کا وعدہ جن کے متعلق قرآن میں کیا گیا ہے یہ دوسرے لوگ تھے' اس موقع پر مذکورہ بالا آیت کے بعد فرمایا گیا ہے کہ غیب کی خبریں ہیں' نہ تم ہی ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم ہی' میری وحی کرنے سے پہلے ان سے واقف تھی۔ یعنی ''**تلك من انباء الغیب نوحیها الیك ج ما کنت تعلمها انت ولا قومك من قبل هذا**'' کا جو خلاصہ ہے' یہ حصہ بھی قابل توجہ ہے نوح علیہ السلام کے قصے سے جیسا کہ معلوم ہے اور جاہلیت کے کلام سے بھی پتہ چلتا ہے عرب کے باشندے واقف تھے۔ جب یہود و نصاریٰ سے ان کے تعلقات تھے تو ناواقف رہنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ خصوصاً طوفان کا یہ قصہ ایسا قصہ ہے (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

بہرحال عام طور پر تو معمورہ ارض پر پھیلی ہوئی انسانی نسلوں کی موروثی روایتوں اور تاریخی شہادتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام معاشی ضرورتوں کی فراہمی کے لئے جہاں ان کو حواس (بینائی' شنوائی' وغیرہ کی قوتوں) اوران حسی وادراکی قوتوں کے معلومات کے استعمال کے واسطے عقل دی گئی ہے' ان ہی کے ساتھ زندگی کے بنیادی سوالات جو انسانی فطرت میں عموماً پیدا ہوتے رہتے ہیں' یعنی ہم کہاں سے آئے ہیں' کہاں جارہے ہیں؟ اور یہاں ہمارے آنے کی

(گزشتہ سے پیوستہ) جس کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں دنیا کی تمام قوموں میں پایا جاتا ہے' حتیٰ کہ امریکہ کی قدیم قوموں میں بھی' اور گمنام جزائر کے باشندوں میں بھی' ایسی صورت میں قرآن کا یہ دعویٰ کہ نہ تم ہی واقف تھے نہ تمہاری قوم' اس کا تعلق بظاہر خبر کی مجموعی حیثیت سے معلوم ہوتا ہے' خصوصاً یہ خبر کہ نوح کے ساتھیوں کے سوا بھی کچھ امتیں ہیں جنہیں آئندہ دنیا سے استفادہ کا موقع دیا جائے گا۔ یہ قطعاً نئی خبر ہے قرآن ہی میں سب سے پہلے اس کو ہم پاتے ہیں۔

اب اسی کے ساتھ سورۃ الحدید کی اس آیت میں غور کیجئے: ''ولقد ارسلنا نوحا و ابراھیم وجعلنا فی ذریتھما النبوۃ والکتب '' (ہم نے نوح کو اور ابراہیم کو رسول بنایا اور ان ہی دونوں (نوح وابراہیم) کی نسل کو نبوت اور کتاب ہم نے دی) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کی نسل میں جو امتیں نہ تھیں' ان کو نبوت اور کتاب سے محروم رکھا گیا گویا تر کنا کے مجمل لفظ میں جو اشارہ یہاں پایا جاتا ہے ہم اس اشارے کو ان تفصیلات سے سمجھ سکتے ہیں۔ باقی نوح کے سوا کچھ امتیں جورہ گئی تھیں۔ قرآن کی رو سے آئندہ زمانے میں تمتع کا موقع جن کو ملنے والا تھا اس کے متعلق کچھ اشارے بائبل میں ملتے ہیں۔ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل (قائن) میں جیسا کہ معلوم ہے' قائن (قابیل) نے ہابیل کو مار ڈالا (کہتے ہیں کہ ہبل نامی بت عرب میں پوجا جاتا تھا وہ اسی ہابیل کی مورتی تھی۔ واللہ اعلم)

بہرحال قائن کے متعلق بائبل میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے قائن کو زمین کا لعنتی قرار دیا' تب قائن نے کہا کہ یہ سزا میری برداشت سے باہر ہے اور بولا'' دیکھ آج تو نے مجھے روئے زمین سے نکال دیا ہے۔ میں تیرے حضور سے روپوش ہوجاؤں گا (پیدائش ۴' ۱۴) ظاہر ہے کہ روئے زمین سے مراد زمین کا وہ آباد حصہ ہی ہوسکتا ہے۔ جس میں عام آبادی تھی اور طوفان نوح میں بظاہر یہی روئے زمین والے آدمی بجز ذریت نوح کے ہلاک ہوگئے اور قائن روپوش ہوکر زمین کے ایسے حصوں میں جاکر چھپ گیا جو عموماً انسانی سہولتوں سے خالی تھے۔ پھر آگے بائبل میں بیان کیا گیا ہے کہ ''نود نامی علاقہ میں قائن جا بسا'' واللہ اعلم)

یہ نود کس علاقہ کا نام ہے؟ اسی موقع پر یہ بھی ہے کہ'' قائن خدا کے حضور سے نکل گیا''۔ پھر بائبل میں اطلاع دی گئی ہے کہ'' قائن اپنی بیوی کے پاس گیا وہ حاملہ ہوئی'' یہاں یہ پیچیدہ سوال ہے کہ جب وہ اس جماعت سے روپوش ہوگیا جس میں آدم علیہ السلام اپنی اولاد کے ساتھ تھے تو قائن کو (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

اور چند دن کے قیام کے بعد روانہ ہو جانے کی آخر غرض کیا ہے؟ یعنی وہی ابتداء وانتہاء وجود کے مدعا کے سوالوں کے جواب کا علم عقل وحواس کے سوا ایک اور مستقل علمی ذریعہ (وحی ونبوت) کی راہ سے عطا کیا گیا ہے۔

لیکن اگر کسی امت یا قوم کی تاریخ علم کے اس مستقل ذریعہ کے ذکر سے خالی ہے اور اسی لئے زندگی کے مذکورہ بالا بنیادی سوالوں کے متعلق قطعی فیصلہ کے علم و یقین سے اپنے آپ کو وہ محروم پاتی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے سوا اور گنجائش ہی کس بات کی تھی۔ ایسا آدمی جو بینائی کی قوت سے محروم ہو اگر روشنی کے متعلق صحیح علم اپنے اندر نہیں پاتا تو آخر وہ بیچارہ کیا کرے؟ ہر چیز کے جاننے کا قدرت ہی نے ایک خاص ذریعہ مقرر بنا دیا ہے آواز کو ہم آنکھوں سے یا رنگ کو ہم کانوں سے جاننا چاہیں گے تو کیا اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ پھر زندگی کے بنیادی سوالوں کے حل اور ان کے جوابات کے جاننے کی جو قدرتی راہ ہے یعنی وحی و نبوت اس سے محروم رہ کر صرف حواس وعقل کے زور سے کوئی قطعی غیر مشکوک فیصلہ ان سوالوں کے متعلق اپنے اندر کیسے پا سکتا ہے۔ روایتوں میں جو آیا ہے کہ ''ان میں نہ کبھی کوئی ''صدیق'' ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو گا'' اس کا مطلب یہی تو ہے کہ صدیق کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان بنیادی سوالوں کے جوابوں کا ایسا غیر مشتبہ یقین و علم اس کے اندر پایا جائے جو ہر قسم کے شکوک وشبہات کی آلائشوں سے پاک ہو اور ان جوابوں کے علم و یافت کی جو قدرتی راہ ہے اس سے محروم رہ جانے والوں کے لئے اس علم و یقین تک رسائی کی آخر شکل ہی کیا ہے؟ عقل کے زور سے اس کو پانا بھی چاہیں گے تو ان کی مثال اس بہرے کی ہوگی جو سونگھ کر یا چھو کر آواز کے سننے کی کوشش کر رہا ہو۔

(گزشتہ سے پیوستہ) عورت کہاں سے ملی؟ نسل انسانی اس وقت تک پھیلی نہ تھی اور جس علاقہ میں آدم تھے اسی علاقہ تک محدود تھی۔ خیر قائن کا بیٹا لکھا ہے کہ حنوک نامی پیدا ہوا اور حنوک کی چوتھی پشت میں ملک پیدا ہوا۔ ملک نے دو عورتوں سے نکاح کیا ہر ایک سے بائبل میں لکھا ہے کہ ایک ایک بیٹا ملک کے پیدا ہوا جن میں ایک بیٹا بین اور بانسلی بجانے والوں کا باپ تھا اور دوسرا بیٹا تیز ہتھیاروں کا بنانے والا تھا۔ یہی ہتھیاروں کے بنانے والے کا نام بائبل میں بلقائن بتایا گیا ہے۔ گویا گانا بجانا اور مردم کشی کے آلات کے موجد قائن ہی کی اولاد تھی۔ مشرق سے مغرب کی طرف جانے والوں کو بلقان نامی علاقہ سے گزرنا پڑتا ہے یہ ساری باتیں قابل توجہ ہیں۔

باقی ایسی قوم یا قومیں دنیا میں کبھی پائی گئی ہیں' یا اب بھی پائی جاتی ہیں' اس کے لئے چاہئے کہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے' اور موجودہ قوموں کی قومی روایات کا جائزہ لیا جائے۔ ❶

یاجوج و ماجوج کیوں مستحق سزا ٹھہرے:

البتہ اس موقع پر ایک معقول سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم ویقین کے ایسے ناگزیر اور اہم ترین ذریعہ سے محرومی کی اس مہیب' ہولناک' انجام سوز' عاقبت گداز سزا کی مستحق یہ قوم کس جرم اور قصور کی وجہ سے قرار پائی؟ جس کا نتیجہ یہ ہے اور اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا تھا کہ زندگی کا یہ سارا سفر بے معنی' بلکہ پاگلوں کا سفر بن کر رہ جاتا ہے' گویا کسی ایسے مسافر کا سفر ہے' جو نہ یہ جانتا ہے کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے اور نہ اسی سے واقف ہے کہ کہاں جا رہا ہے' اور یہ کہ کس لئے وہ چل رہا ہے' اس سے بھی آگاہ نہیں ہے' مگر پھر بھی چلا ہی جا رہا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو عالم کا یہ سارا نظام ہی صرف دیوانے کا ایک لا حاصل خواب پریشان بن کر رہ جاتا ہے۔ کسی جبلی ❷ نقص یا اصل

❶ ہمارے بزرگ جامعہ عثمانیہ کے مشہور استاد فاضل علامہ مولانا عبدالباری صاحب ندوی فرماتے تھے کہ یورپ کی قوموں کی تاریخ کا مطالعہ اسی نقطہ نظر سے میں نے کیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کسی زمانہ میں ہم اس قوم کے اندر نبوت و وحی کا ذکر نہیں پاتے' بعد کو باہر سے جب عیسائی مذہب ان میں آیا تو چاہئے تھا کہ اب وہ علم کے اس خاص ذریعہ سے مانوس ہو جاتے' لیکن بجائے اس کے وحی و نبوت کی تشریح کے ایسے پیرایہ پر اصرار طبیع ان کی طرف سے کیا جا رہا ہے' جس کا حاصل یہی ہو سکتا ہے کہ علم کے عام ذرائع عقل و حواس ہی کے جھمیلے میں اس کو بھی گم کر دیا جائے' یا پھر وہم' مالیخولیا' بینا وغیرہ جیسے دماغی امراض کے ذیل میں وہ شریک ہو جائے۔۱۲

❷ مطلب یہ ہے کہ وحی نبوت سے مانوس و مالوف ہونے کے لئے جن فطری رجحانات کی ضرورت ہے' ان ہی سے گویا یہ قوم خالی ہے' پھر بکروں یا بیلوں کو جیسے نہیں سمجھایا جا سکتا ہے کہ وحی کس چیز کا نام ہے' یا نبوت و رسالت سے کیا مطلب ہے' یہی حال اس قوم کا بھی ہے۔ پچھلے ایک فٹ نوٹ کی وہ بات یاد ہوگی کہ قابیل (قائن) جب روئے زمین سے نکالا گیا اور آدم علیہ السلام سے روپوش ہوا اور خدا کے حضور سے نکل گیا تو روپوشی کے اس زمانے میں عورت کے پانے کا امکان یقیناً اس کے لئے باقی نہ رہا تھا' مگر بائبل میں خبر دی گئی ہے کہ وہ عورت کے پاس گیا وہ حاملہ ہوئی اور اسی سے قائن کی نسل جاری ہوئی' یہ عورت اس کو کہاں ملی؟ میں تو اس کو خواب و خیال میں سمجھتا ہوں کہ بجائے انسانی عورت کے بندروں کی ایسی مادہ سے جو انسانوں سے شکلاً وصورۃً زیادہ قریب تھی اسی سے قائن نے نسل کشی کا کام لیا۔ لیکن کیا کہا جائے کہ دیکھنے والوں کو کچھ اسی قسم کا خواب دکھایا گیا ہے' ننھیال کے بدل جانے کی وجہ سے قائن کی آئندہ نسلوں میں کچھ کوتاہیاں (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

سرشت میں کوتاہی کے دعوے سے اس کی توجیہ اولاً آسان نہیں ہے اور اس قسم کی فطری کوتاہیوں کا اقرار کر بھی لیا جائے تو آگے بڑھ کر پھر وہی سوال واپس ہو جاتا ہے کہ قدرت نے انسانی نسل میں پیدا کر کے اس کوتاہی کو ان میں باقی کیوں رہنے دیا۔

بلکہ اصل یہی ہے کہ بنی آدم کے سارے نوعی اقتضاؤں کو جب ہم ان میں پاتے ہیں، وہ بھی اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے انسانوں کی ساری نسلیں دیکھتی ہیں، اسی طرح سنتی ہیں جیسے سب سنتے ہیں، اسی طرح سوچتے ہیں جیسے سب سوچتے ہیں، ان ہی چیزوں کی ضرورت وہ بھی محسوس کرتے ہیں جن کی ضرورت سب محسوس کرتے ہیں۔

الغرض اندر ہو یا باہر، پانے والوں نے جب سب کچھ ان میں بھی پایا ہے جو کچھ دوسروں میں پایا جاتا ہے یا پایا جا سکتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ وحی و نبوت سے ان کی لاپروائیوں اور ان کی اجنبیت و توحش کو جبلت کے کسی نقص یا کوتاہی کا نتیجہ قرار دیا جائے بلکہ یقیناً اس میں ان کے ارادی طغیان اور سرکشی کے ان احساسات کو دخل ہے جنہیں بے باکانہ مشاغل کے انہماک نے ان میں پیدا کر دیا ہے۔

کسی مجازاتی و مکافاتی ہمہ جا۔ ہر وقت نگراں قوت کے حضور کا خیال ان کی من مانی خواہشوں اور عنان گسیختہ امنگوں اور ارمانوں کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ گریز کی واحد منطق یہی ہو سکتی تھی کہ جس ذریعہ سے اس قوت کی نگرانی وحضور کا دباؤ انسانی فطرت محسوس کرتی ہے، اسی سے انجان بن جانے کی ذہنیت کی پرورش میں اتنا مبالغہ کیا جائے کہ کوئی اس کا مطلب سمجھانا

(گزشتہ سے پیوستہ) فطرۃ رہ گئیں، مگر ایک فائدہ بھی ہوا کہ غیب سے کلیتہً منقطع ہو کر صرف عالم محسوس ہی میں ان کی سازی توانائیاں جذب ہو گئیں۔ گانے بجانے کے آلات اور مردم کشی کے اوزار کی ایجاد کا سہرا غالباً اسی یکسوئی کی بدولت ان کے سر بندھا (واللہ علم بالصواب)

اسی سے شاید پچھلے دنوں یورپ میں یہ غلغلہ جو بلند ہوا کہ انسانی شجرہ نسب کی انتہا سائنس کی رو سے بندروں پر ہوتی ہے۔ یوں بھی لوگ کہتے ہیں کہ خچر کو دیکھ کر بیک وقت گھوڑے کے ساتھ گدھے کی اور گدھے کے ساتھ گھوڑے کی صورت جھانکنے لگتی ہے۔ اسی طرح بعض خاص نسلوں کے افراد کو دیکھ کر عوام کے دل میں آدمی کے ساتھ بندروں کا اور بندر کے ساتھ انسان کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ للموئے وغیرہ الفاظ سے اپنے اس احساس کا عوام اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔۱۲

بھی چاہے تو سمجھنے سے اپنے آپ کو معذور بنایا جائے۔

الغرض سارے انسانی اقتضاؤں کے اشتراک کے ساتھ ساتھ اچانک انسانی فطرت ہی کے اسی ایک خاص اقتضا کے ساتھ ان کا برتاؤ کسی اضطرار اور بے چارگی کا نہیں' بلکہ ان کے اختیار و ارادہ کی غمازی کر رہا ہے۔ جان سکتے ہیں' لیکن نہ جاننے کا فیصلہ ہی کر کے جو بیٹھ گئے ہوں' ان کے جاننے کی صورت ہی کیا باقی رہتی ہے۔ ❶

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کے قومی مزاج کے اسی طاغوتی فیصلہ نے ان کو وحی و نبوت سے محرومی کی سزا کا سزاوار ٹھہرایا۔ جب وہ طے ہی کئے ہوئے تھے کہ ہم نہیں سنیں گے تو سنانے والوں کو ان میں بھیجنے کا حاصل ہی کیا ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ گو "تـرکـنـا" کے قرآنی لفظ کو چنداں اہمیت نہیں دی گئی۔ چنداں کیا معنی! سوال ہی نہیں اٹھایا گیا کہ اس خاص لفظ کو قرآن نے اس موقع پر کیوں استعمال کیا ہے۔ اسی لئے اس اجمال کی تفصیل میں مجھے ذرا زیادہ دراز نفسیوں سے کام لینا پڑا ورنہ پہلے سے کتابوں میں اس کے متعلق اگر کچھ مواد موجود رہتا تو چند الفاظ ہی ان کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کافی ہو سکتے تھے۔

❶ اس موقع پر جاحظ کی مشہور ادبی کتاب "البخل والبخلاء" کے ایک لطیفہ کا خیال آ رہا ہے۔ بغداد کے ایک تاجر کے پاس قزوین کا کوئی تاجر ہر سال مہمان بن کر مہینوں قیام کرتا تھا۔ میزبانی میں خاطر و مدارت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ قزوینی مہمان ہمیشہ بغدادی میزبان سے آرزو کرتا کہ آپ کبھی قزوین نہیں آتے' میرے دل کی حسرت دل ہی میں رہ جائے گی۔ برسوں کے بعد ایک دفعہ بغدادی میزبان قزوین کسی ضرورت سے پہنچا۔ اپنے قزوینی دوست کا خیال آیا' دوکان پر پہنچا' خیال تھا کہ دیکھنے کے ساتھ قزوینی دوست اچھل پڑے گا۔ سامنے اپنی دوکان پر دیکھا کہ بیٹھا ہوا ہے' بغدادی نے سلام کیا' لیکن ادھر سے جواب بھی نہ ملا۔ خیال ہوا کہ سفر کے لباس ہونے کی وجہ سے قزوینی دوست نے پہنچانا نہیں۔ عباء اتار دی اور سلام کیا' مگر وہی بے رخی اب بھی باقی تھی' عمامہ اتار دیا' مگر ادھر پھر بھی کسی قسم کی جنبش نہ ہوئی۔ صرف کرتے اور پائجامے میں جیسے گھر میں رہتا تھا' بے تکلف ہو کر کھڑا ہو گیا' تب قزوینی دوست نے کہا: "اگر چرمت بدر آئی من ترا نمی شناسم"

یعنی اپنی کھال اتار کر بھی میرے سامنے تم کھڑے ہو جاؤ گے تب بھی میں تمہیں نہیں پہچانوں گا۔ جب نہ پہچاننے کا فیصلہ ہی قزوینی کر چکا تھا تو ظاہر ہے کہ اس کے بعد پہچاننے کے لئے گنجائش ہی کیا باقی رہ گئی تھی۔

قرآن سے یاجوج و ماجوج والوں کی زندگی کے دوسرے دور کی جن خصوصیات کا پتہ چلتا ہے وہ تو یہی تھے۔ اب آیئے ان ہی لوگوں کی زندگی کے تیسرے دور پر۔

دوسرے دور میں بتایا گیا تھا کہ "باہم ایک دوسرے میں موج زن رہے" گویا غیر قوموں سے اس دور میں ان کا رشتہ منقطع ہو گیا تھا' لیکن سورۂ کہف میں تو نہیں' بلکہ سورۃ الانبیاء کی اس مشہور آیت یعنی:

حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاجُوْجُ وَ مَاجُوْجُ وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ۔

"تااینکہ کھول دیئے گئے یاجوج و ماجوج اور وہ ہر حدب سے تیزی کے ساتھ چل نکلے"

سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر قوموں سے منقطع اور بے تعلق ہو جانے کے بعد' پھر ان کو ایک موقع غیر قوموں کی طرف رخ کرنے کا دیا جائے گا اور اسی کو میں یاجوج و ماجوج والوں کی قومی زندگی کا تیسرا دور قرآن کی رو سے خیال کرتا ہوں۔ چونکہ اس دور کا ذکر سورۂ کہف میں نہیں' بلکہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ سورۂ الانبیاء کی آیت ہے' اس لئے اس تفصیلات کا ذکر آئندہ کروں گا۔

پہلے چوتھے دور کے متعلق جس کا تذکرہ سورۂ کہف میں کیا گیا ہے اسے پڑھ لیجئے۔ یہ چوتھا دوران کا میرے خیال میں ہے جسے ہم سورۂ کہف کی اس آیت میں پاتے ہیں۔ یعنی:

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰھُمْ جَمْعًا۔ (سورۂ کہف)

"اور پھونک دیا جائے سور پھر ہم ان کو (یاجوج و ماجوج) کو اچھی طرح سمیٹ کر سمیٹ لیں گے۔

مطلب وہی ہوا کہ نفخ صور کے بعد جیسے ساری انسانی نسلیں' ان کے اگلے پچھلے' بڑے چھوٹے' مرد و عورت سب ہی دوبارہ جمع کئے جائیں گے' اسی طرح "یاجوج و ماجوج" بھی اس چوتھے دور میں اپنے آپ کو پائیں گے کہ ایک ایک کر کے اول سے آخر تک سب اکٹھے کر لئے گئے ہیں۔

یاجوج وماجوج کے خروج کا زمانہ:

اس چوتھے اور تیسرے دور میں فرق یہ ہے کہ چوتھے دور کا ظہور تو قرآن کی رو سے نفخ صور یعنی قیامت کے وقت ہوگا۔ برخلاف اس کے غیر قوموں سے منقطع اور بے تعلق ہو جانے کے بعد یاجوج وماجوج والوں کو پھر ان کی طرف جس زمانہ میں کھولا جائے گا' قرآن ہی کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ صورت حال قیامت کے قائم ہونے سے پہلے پیش آئے گی۔

آخر خود سوچئے یاجوج وماجوج کے کھلنے کے بعد ارشاد ہوا ہے:

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ (سورۃ الانبیاء)

''اور سچا پکا وعدہ (قیامت کا) بہت زیادہ نزدیک ہو گیا پس اچانک ان لوگوں کی نگاہیں جنہوں نے انکار کی راہ اختیار کی اوپر کی طرف اٹھ جائیں گی (وہ کہیں گے) کہ ہم پر افسوس! ہم غفلت میں تھے۔''

حاصل جس کا یہی ہے کہ یاجوج وماجوج کے کھل پڑنے کے بعد بھی جب اس سچے اور پکے وعدے یعنی قیام قیامت کے وقوع پذیر ہونے کی نہیں' بلکہ قریب آ جانے کی خبر دی جا رہی ہے تو یقیناً یاجوج وماجوج کے کھلنے کے اس زمانے کو قیامت کے قائم ہونے سے پہلے بدرجہ اولیٰ ماننا پڑے گا' بلکہ انکار کرنے والوں کی طرف اسی آیت میں اپنے غافل رہ جانے کا اعتراف خود بتا رہا ہے کہ اس وقت تک قیامت کی ہیبت ناکیاں بے نقاب ہو کر ان کے سامنے نہیں آ گئی تھیں' ورنہ غافل رہ جانے کا مطلب ہی کیا ہوگا؟

بہر حال قرآنی الفاظ سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ یاجوج وماجوج والوں کی! قومی زندگی کا یہ تیسرا دور یعنی منقطع ہونے کے بعد پھر غیر قوموں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا موقع ان کو قیام قیامت سے پہلے دیا جائے گا۔ ان کی قومی زندگی کے اسی دور کی تعبیر فتح یاجوج وماجوج یا خروج یاجوج وماجوج کے الفاظ سے کی جاتی ہے۔

اور جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ آثار واخبار کا جو سرمایہ ہماری کتابوں میں پایا جاتا

ہے اس کے بڑے حصے سے ارباب تنقید و تحقیق مطمئن نہیں ہیں لیکن ایک دو روایتیں اس سلسلہ کی بخاری جیسی معتبر کتابوں میں جو ملتی ہیں ان سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ یاجوج و ماجوج کے خروج کے زمانہ میں کاروبار کے لحاظ سے دنیا کے عام تمدنی و عمرانی مشاغل میں کسی قسم کا کوئی خاص تغیر و انقلاب! رونما نہ ہوگا' آخر حضرت ابوسعید خدری صحابی رضی اللہ عنہ کی یہ مشہور روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

لیحجن البیت ولیعتمرن بعد خروج یاجوج و ماجوج (بخاری)

"لوگ بیت اللہ (کعبہ) کا حج بھی یاجوج و ماجوج کے نکل پڑنے کے بعد کرتے رہیں گے اور عمرہ بھی۔"

کا مطلب یا مزید اضافہ کے ساتھ یہی روایت بخاری کے سوا دوسری کتابوں میں جو پائی جاتی ہے۔ یعنی:

ان الناس لیحجون و یعتمرون و یغرسون النخل بعد خروج یاجوج و ماجوج (فتح الباری)

"لوگ یاجوج و ماجوج کے نکل پڑنے کے بعد حج بھی کرتے رہیں گے اور عمرہ بھی' اور نخلستان (باغ) بھی لگاتے رہیں گے۔"

بتایا جائے کہ اس سے اور کیا سمجھا جائے؟

یقیناً حج و عمرہ یا غرس نخل (نخلستان لگانا) ان کا ذکر بطور مثال فرمایا گیا ہے' مقصد بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب حج و عمرہ جیسے عبادات جن کے لئے طویل و طویل مسافتوں کو طے کر کے لوگوں کو مکہ معظمہ پہنچنا پڑتا ہے اور نخلستان جن کے لگانے کا ارادہ وہی کر سکتے ہیں جن کے سامنے پر امید مستقبل ہو' ورنہ قیامت کی رست خیزیوں میں جب:

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيهِ

کی کیفیت دماغوں پر مسلط ہوگی' بھلا باغ واغ کی گنجائش ہی کیا رہ جائے گی اور سچ تو یہ ہے کہ نیند سے بیدار ہو کر ایسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا' بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

فتح الیوم من ردو یا جوج و ماجوج مثل ھذہ۔

''یاجوج و ماجوج والے بند میں اس کے ایسا سوراخ آج کھول دیا گیا ہے''

مثل ھذہ (یعنی ایسا سوراخ) کو بتاتے ہوئے ''عقد انامل'' کی اصطلاح میں!

آنحضرت ﷺ نے سمجھایا تھا مطلب یہ تھا کہ بہت ہی باریک سوراخ گویا اس بند میں آپ کو دکھایا گیا تھا۔

بہر حال اس مشہور روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ گویا اس کی اطلاع دے چکے تھے کہ یاجوج و ماجوج کی قومی زندگی کے تیسرے دور کے ظہور کے امکانات آپ ہی کے زمانے میں قریب آ چکے تھے' بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کوئی کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ ظہور کے آغاز کی کرن گویا عہد نبوت میں پھوٹ چکی تھی۔ [1]

پس عام طور پر ''یاجوج و ماجوج'' کے خروج کو قیامت کے علامات میں جو شمار کیا جاتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ یہ اسی قسم کی علامت ہے' جیسے خود رسول اللہ ﷺ کی بعثت کو بھی قیامت کے اشراط و علامات میں شمار کیا جاتا ہے اور سچ پوچھئے تو یاجوج و ماجوج کا خروج کے بعد آخری انجام جو ہوگا جن روایتوں میں اس دردناک انجام کی تفصیل کی گئی ہے لوگوں نے ان کو خروج سے متعلق کر دیا' آئندہ اس کی تفصیلی بحث آ رہی ہے۔

بہر حال یہ مسئلہ کہ خروج کے ساز و سامان' اور زمین کی تیاری کا کام عہد نبوت میں جو شروع

---

[1] کہہ چکا ہوں کہ یاجوج و ماجوج کے خروج کے اس واقعہ کو ذوالقرنین والی دیوار کے انہدام و اندکاک سے کوئی تعلق نہیں ہے' حضرت الاستاذ کشمیری کی تحقیق اس باب میں نقل کر چکا ہوں۔ ایسی صورت میں آنحضرت ﷺ کا نیند سے بیدار ہو کر یہ فرمانا کہ ''یاجوج و ماجوج والے روم (بند) میں اتنا سوراخ ہو چکا'' اس کا مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہی کہ رویا اور خواب میں یاجوج و ماجوج کے خروج کی ابتداء کا تمثل دیوار کے سوارخ کی شکل میں ہوا' لیکن ظاہر ہے کہ خواب میں دودھ دکھایا جاتا ہے اور مطلب اس کا علم ہوتا ہے' قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ قحط مصر خشک خوشوں اور دبلی پتلی گایوں کی شکل میں دکھا گیا۔ بہر حال اس روایت سے یہ سمجھنا کہ واقعی یاجوج و ماجوج والے اسی دیوار میں سوراخ کرنے پر وہ قادر ہو گئے تھے جس کے متعلق قرآن میں اطلاع دی گئی ہے کہ نقب لگانا اس میں ان کے بس کی بات نہ تھی' حقائق و واقعات سے اغماض ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

ہو چکا تھا اس کی تکمیل کا وقت بھی کیا کوئی متعین کیا گیا ہے؟ اسی سورۃ الانبیاء کی آیت

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۔

تااینکہ کھول دیئے گئے یاجوج و ماجوج اور ہر حدب سے تیز چلتے ہوئے وہ نکل پڑے"

کے آخری ٹکڑے یعنی "هم من كل حدب ينسلون" میں اگر غور کیا جائے اور یہ سوچا جائے کہ زمین کے وہی حصے جو پانی سے مکشوف اور نمایاں ہوئے ہیں جن میں حدبیت (کوزہ پشتی اور ابھار) پایا جاتا تھا۔ گویا حاصل یہی ہوا کہ زمین کے سارے معمورہ میں پھیل پڑیں گے اور اس طور پر پھیل پڑیں گے کہ ان کی آمد کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اور بڑی تیزی کے ساتھ زمین کے آباد حصوں میں یہ گھسنے لگیں گے تب سمجھا جائے گا کہ عہد نبوت میں جس خروج کے لئے سوراخ پیدا ہوا تھا وہ مکمل ہو گیا اور "فتحت یاجوج و ماجوج" (کھول دیئے گئے یاجوج و ماجوج) کی قرآنی پیشین گوئی تکمیلی شکل میں سامنے آ گئی۔ اسی لئے حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کا خیال یہ تھا کہ یاجوج و ماجوج کے خروج کا واقعہ دفعۃً پیش آنے والا ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ:

لهم خروج مرة بعد مرة (فیض الباری شرح بخاری ج ۴ ص ۲۳)

"ان کے خروج کا یہ واقعہ یکے دیگرے پیش آتا رہے گا"

یہ عجیب بات ہے کہ "نیا عہد نامہ" یعنی انجیل کے نام سے جو مجموعہ اہل کتاب میں موسوم ہے اس میں ایک چھوٹا رسالہ بالکل آخر میں "یوحنا عارف کا مکاشفہ" کے نام سے بھی شریک ہے۔ کتاب کی ابتدائی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ یوحنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری ہیں اور ان کو کچھ غیبی مکاشفات ہوئے ہیں جنہیں قلمبند کر کے ساتوں کلیسا کے نام ایک ایک نسخہ روانہ کیا گیا تھا۔ بہر حال آئندہ پیش آنے والے واقعات ہی سے زیادہ تر ان مکاشفوں کا تعلق ہے:

منجملہ دوسرے مکاشفات کے ایک مکاشفہ کے الفاظ یہ ہیں:

"پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے جو سچا اور برحق کہلاتا ہے اور وہ راستی کے ساتھ انصاف اور لڑائی کرتا ہے اور اس کی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں اور اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں

اور اس کا ایک نام لکھا ہوا ہے جسے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا' اور وہ خون کی چھڑکی ہوئی پوشاک پہنے ہوئے ہے' اور اس کا نام کلام خدا کہلاتا ہے' اور آسمان کی فوجیں سفید گھوڑوں پر سوار اور سفید صاف مہین کتانی کپڑے پہنے اس کے پیچھے پیچھے ہیں' اور قوموں کے مارنے کے لئے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے' اور وہ لوہے کی عصا سے ان پر حکومت کرے گا اور قادر مطلق خدا کے غضب سے مے کے حوض میں ان کو روندے گا' اور اس کی پوشاک اور ران پر یہ نام لکھا ہوا ہے'' بادشاہوں کا بادشاہ اور خدا کا خداوند (یوحنا کا مکاشفہ' ۱۹' ۱۱ تا ۱۶)''

نہیں کہا جا سکتا کہ'' سچا اور برحق'' کن الفاظ کا ترجمہ کیا گیا ہے مگر'' الصادق الامین ﷺ'' سے کون واقف نہیں ہے؟ ان سے بھی' ان بادشاہوں سے بھی' جن کے سر کے تاج ان کے نہیں' بلکہ اسی کے مقدس فرق مبارک کے تاج تھے۔ گھوڑوں پر چڑھے ہوئے فرشتوں کو بھی لوگوں نے بدر کے میدان میں دیکھا تھا۔ جو انصاف کے مستحق تھے' ان کے ساتھ انصاف اور جنہوں نے لڑنے کا ارادہ کیا ان کے ساتھ لڑائی' اور ان ہی لڑائیوں میں خون کے چھینٹوں کا دامن پر پڑنا' آہنی پنجے کے ساتھ ایسی حکومت قائم کرنا کہ شریروں کے حوصلے پست ہو گئے اور جو مقابلے کے لئے کھڑے ہوئے' وہ گرائے گئے' روندے گئے' بادشاہوں کے اس بادشاہ اور خداوندوں کے اس خداوند کو کون نہیں پہچانتا؟ صلوات اللہ علیہ و سلامہ

اسی مکاشفہ کے بعد دوسرا طویل مکاشفہ' اور ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک فرشتہ آسمان سے اترا اور اس نے:

''پرانے سانپ کو جو ابلیس اور شیطان ہے' پکڑ کر ہزار برس کے لئے باندھا اور اسے اتھاہ گڑھے میں ڈال کر بند کر دیا اور اس پر مہر کر دی تا کہ وہ ہزار برس پورے ہونے تک قوموں کو پھر گمراہ نہ کرے'' (ب ۱۔۲۔۳)

آگے اسی کے بعد یہ کہتے ہوئے کہ:

''اس کے بعد ضرور ہے کہ تھوڑے عرصہ کے لئے کھولا جائے۔''

اسی تھوڑے عرصے کے متعلق جس میں شیطان کا کھلنا بیان کیا ہے کہ ضروری اسی مکاشفہ

میں اس کی یہ تفصیل بھی پائی جاتی ہے' لکھا ہے۔

''اور جب ہزار پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا' چھوٹ کر کیا کرے گا؟ مکاشفہ میں ہے:

''وہ ان قوموں کو جو زمین کی چاروں طرف ہوں گی یعنی یاجوج و ماجوج کو گمراہ کر کے لڑائی کے لئے جمع کرنے کو نکلے گا''

قرآن کی رو سے تو ''من کل حدب'' کے مفہوم کو ادا کرنے والے الفاظ چاہئے تھا کہ یہاں ہوتے واللہ اعلم

اصل مکاشفہ کی عبارت کیا تھی؟ جس کا مترجم نے ''زمین کے چاروں طرف'' کے الفاظ سے ترجمہ کیا ہے۔ اب بادشاہوں کے بادشاہ۔ خداوندوں کے خداوند ''الصادق الامین'' کو جو پہنچانتے ہیں وہ حساب کر کے دیکھ سکتے ہیں کہ یاجوج و ماجوج والوں کی قومی زندگی کے اس تیسرے دور کی تکمیل کا زمانہ کیا ہونا چاہئے۔ ❶

یوحنا عارف یا حواری کے اس مکاشفہ میں ''یاجوج و ماجوج'' والوں کے متعلق جنہیں شیطان اکسا کر باہر نکالے گا' آگے یہ بیان بھی درج ہے۔

ان کا (یاجوج و ماجوج) کا شمار سمندر کی ریت کے برابر ہوگا اور وہ تمام زمین پر پھیل جائیں گی اور مقدسوں کی لشکر گاہ اور عزیز شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔

مقدسوں کے لشکر گاہ اور عزیز شہر سے مراد کیا ہے؟ عزیز کا مادہ عزت ہے ''البلد الحرام'' کے عربی لفظ کا ترجمہ اگر کیا جائے یہی ''عزیز شہر'' ہو سکتا ہے باقی دس ہزار قدسیوں کے جس لشکر کا نظارہ موسیٰ (علیہ السلام) کو جس مقام پر کرایا گیا تھا اس سے تورات کے پڑھنے والے خوب

❶ اس موقع پر بے ساختہ الفرڈ سبر کا قول یاد آ جاتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب ''تاریخ فلسفہ'' میں لکھا ہے کہ پندھویں صدی کے وسط سے مغربی یورپ میں یکے بعد دیگرے متعدد حیرت انگیز واقعات ہوئے''۔ (مترجم خلیفہ عبدالحکیم صاحب ص: ۲۴۴) چھٹی صدی عیسوی کے وسط ۵۷۰ء سے پندرہویں صدی کے وسط تک جوڑ لیجئے کہ اوسط مدت کیا پڑتی ہے؟ کاش! تاریخ کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے کیا جائے۔ یقیناً نشاۃ ثانیہ کے نام سے جو دور ''مہذب ممالک کا موسوم ہے اس کی ابتدا اور تدریجی ارتقاء کا مطالعہ اس نظر سے بڑا دلچسپ ہوگا۔ ۱۲

واقف ہیں۔ ❶

یوحنا کے مکاشفہ کے آخر میں ہے کہ:

''آسمان سے آگ نازل ہو کر انہیں کھا جائے گی''

''انہیں'' سے یاجوج و ماجوج والوں ہی کی طرف اشارہ ہے جس سے آتشیں ہتھیاروں کے استعمال پر بھی روشنی پڑتی ہے لیکن یہ انجام تو خیر آئندہ پیش آئے گا۔ اس وقت تو مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ یاجوج و ماجوج والوں کے خروج کی تکمیل کے زمانے کو اس مکاشفہ کی روشنی میں ہم متعین کر سکتے ہیں اسی طرح دوسری دفعہ غیر قوموں سے رشتہ جوڑنے کا موقع جب ان کو دیا جائے گا اس وقت وہ کیا کریں گے' اس کا بھی کچھ اندازہ اسی مکاشفہ کے الفاظ سے ہوتا ہے یعنی

''وہی فتنہ فساد' لڑائی جھگڑوں کے قصوں کو یہ چھیڑ دیں گے' تاآنکہ''

''عزیز شہر'' کو چاروں طرف سے یہ گھیر لیں گے''

گویا قرآن میں ''ذوالقرنین'' کی دیوار تعمیر سے پہلے ان کی قومی خصوصیت کی تعبیر۔

اِنَّ يَاجُوْجَ وَ مَاجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ۔

''یاجوج و ماجوج زمین میں بگاڑ پیدا کرنے والے ہیں''

کے الفاظ میں ہم جو پاتے ہیں' دوبارہ کھلنے کے بعد پھر اپنی اسی جبلی عادت اور اقتضاء کے ساتھ نمایاں ہوں گے۔ ہمارے ہاں کی روایتوں میں ایک یہ روایت جو پائی جاتی ہے کہ:

ان یاجوج و ماجوج من ولد ادم ولو اسلموا یفسدوا علی الناس معائشھم (کنز العمال بحوالہ مسند عبد بن حمید)

''یاجوج و ماجوج آدمؑ ہی کی اولاد میں ہیں اور اگر وہ یعنی یاجوج و ماجوج والے اسلام بھی قبول کر لیں جب بھی لوگوں پر ان کے ذرائع معاش کو درہم برہم کرتے رہیں گے''۔

---

❶ تورات کی کتاب استثناء کا مشہور فقرہ ہے ''فاران ہی کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا (باب ۳۳) بخاری میں ہے فتح مکہ کے وقت رسول اللہ ﷺ دس ہزار صحابہ کے ساتھ تشریف فرما ہوئے۔ ۱۲

اس سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ فساد٬ بگاڑ اور لوگوں پر ان کی معاشی زندگی کو تلخ بنا دینا ان کی جبلّی فطرت ہے۔ حتیٰ کہ اسلام بھی اگر قبول کر لیں گے جب بھی ان کی یہ قومی خصوصیت اپنے آثار و نتائج کو ظاہر کرتی رہے گی۔ گویا اسلام کو یہ قبول بھی کریں گے تو اوپر ہی سے قبول کریں گے اور اندر ان کا جوں کا توں اسی حال میں رہے گا جس میں اسلام سے پہلے تھا۔ اور جب اسلام کے ساتھ ان کی فطرت کا یہ تعلق ہوگا تو دوسرے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی کی طرف منسوب ہو جانے کا چاہئے کہ نتیجہ بھی یہی ہو۔ بلکہ جیسے محفوظ مذہب کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت جب یہ ہوگی تو جن پیغمبروں کی صحیح تعلیمات اپنی اصلی شکل وصورت میں باقی نہیں رہی ہیں٬ ان کی طرف انتساب اور صرف انتساب ان کے جبلّی تقاضوں کو کیسے بدل سکتا ہے۔ ❶

لیکن یاجوج و ماجوج کی اس قرآنی اصطلاح یا تعبیر کے متعلق اس وقت تک جو کچھ پیش کیا جاچکا ہے٬ کیا اسی حد تک ان کا قصہ محدود ہے؟ مطلب یہ ہے کہ:

۱۔ غیروں میں پہنچ کر فساد انگیزی۔

۲۔ یا خود آپس میں ان کا موجی تعلقات کے رکھنے پر اصرار٬ جن کی تفصیل گزر چکی ہے یعنی باہم ایک دوسرے کے ساتھ الجھتے بھی رہنا لیکن اسی کے ساتھ کلیتہً ٹوٹ کر جدا بھی نہیں ہونا۔“

۳۔ متروکیت٬ یعنی غیب سے تعلقات قائم کرنے کے لئے ہبوطی زندگی میں عام نسل انسانی

❶ یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج والوں کی فسادی فطرت کا تجربہ ماقبل از تاریخ ایام میں بھی ہوتا رہا ہے۔ اور اگر یہ بات قرآن ہی سے معلوم ہوتی ہے کہ ذوالقرنین کے عہد میں اسی کی شکایت کی گئی۔ ہندوؤں کی کتابوں میں بھی معمولی لفظی تغیر یعنی بجائے یاجوج و ماجوج کے کوک٬ وکوک کے الفاظ ملتے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے اسی یاجوج و ماجوج کا تلفظ گوگ٬ ماگوگ٬ غوغ، ماغوغ وغیرہ شکلوں میں پایا جاتا ہے۔ رگ وید میں رچا ۲۲ سکتہ ۴ منڈل٬ ۷ کا ایک دعائی فقرہ ہے کہ ”اے ہے مالک! ہماری عبادت گاہوں کو کوک کی کھنڈت سے بچا“ اس میں تو صرف کوک کا ذکر ہے لیکن ”کلکی پران“ کے نام سے جو کتاب ہندوؤں کے ہاں پائی جاتی ہے اس میں کوک کے ساتھ وکوک کا بھی ذکر ہے اور یہ بھی کہ ان کے رتھ (سواری) کا رنگ کالا ہوگا اور چھچھوندر٬ کتے٬ گدھے وغیرہ کی آواز اس سے نکلے گی اور ان کی آنکھیں کنجی ہوں گی۔ (دیکھو مقدمہ تفسیر غایۃ البرہان ص: ۳۰۲)

کوعلم کے ایک خاص ذریعہ وحی نبوت کے ساتھ قدرت جو سرفراز کرتی رہی ہے' گویا
خاکدان ارضی پر آدم (علیہ السلام) کو رخصت کرتے ہوئے:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝ (بقرہ رکوع ۴)

''پھر جب تمہارے پاس ہمارے ہاں سے ہدایت کرنے والے آتے رہیں تو جو پیرو
ہوگا میرے ان ہدایت کرنے والوں کا پھر نہ ان کو کچھ ڈر ہے' اور نہ وہ کڑھیں گے۔''

کی آخری وصیت جو کی گئی اور اسی وصیت کے مطابق ہر امت میں نذیر (چونکانے والے) جو آتے رہے' زمینی زندگی کی اس خاص لاہوتی نعمت سے اپنے فطری طغیان اور سرکشی کی بدولت یاجوج وماجوج والے محروم رہے اور یوں خدا کی چھوڑی ہوئی امت بن کر وہ رہ گئے' چاہا جائے تو ڈاکٹر اقبال مرحوم کی اس حکیمانہ وعارفانہ تشخیص کو پڑھنے والے ان کی پیشانی کی لکیروں میں پڑھ سکتے ہیں یعنی

پا بزندان مظاہر بستہ!	از حدود حس بروں ناجستہ
کور و یزداں ناشناس ادراک او	ناکساں زنجیری پیچاک او!
فطرتش ازسوز عشق آزاد ماند	در جہان جستجو ناشاد ماند!
ایں مے دیرینہ در بنیاش نیست	شور یارب قسمت شبہاش نیست

۴۔ اور قرآنی الفاظ ''من کل حدب'' سے یہ اشارہ جو ملتا ہے کہ زمین کا وہ حصہ جو ابھر ابھر کر پانی سے باہر ہو گیا ہے' خواہ وہ جزائر ہوں یا جزیرہ نما ہوں یا خشکی کے وہ قطعات ہوں جنہیں بحر کے مقابلہ میں بر کہتے ہیں ''کل کے لفظ کا اقتضاء تو یہی ہے کہ سب ہی میں یہ پہنچ جائیں گے۔صرف پہنچنے کا پتہ نہیں چلتا ہے بلکہ ''من'' کے لفظ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیس (Base) اور مرکز بنا بنا کر وہاں سے نکلیں گے اور قرآن کے اسی اشارے کی تفصیل یوحنا عارف کے مکاشفہ میں ملتی ہے۔یعنی

کب نکلیں گے؟ کس لئے نکلیں گے اور کہاں تک پھیل جائیں گے؟

گزر چکا کہ ان سارے سوالوں کا جواب اس مکاشفہ میں دیا گیا ہے

یعنی الامین الصادق بادشاہوں کے بادشاہ خداوندوں کے خداوند کے ہزار سال بعد ان کو منقطع ہونے کے بعد پھر غیر قوموں کی طرف پل پڑنے کا ان کو موقع دیا جائے گا۔ یہ جواب تو کب نکلیں گے؟

کے سوال کا ملتا ہے' لڑائی کے لئے شیطان ان کو باہر نکالے گا' یہ کس لئے نکلیں گے؟ کے سوال کا جواب دیا گیا ہے' اور ''عزیز شہر'' کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے یہ ان کے فتوحات کی وسعت کا حال ہوگا۔

۵۔ اور ''ینسلون'' کا لفظ ''من کل حدب'' کے بعد جو قرآن میں پایا جاتا ہے جیسا کہ ظاہر ہے مادہ اس کا نسل ہے' لغت والوں نے لکھا ہے کہ ''شیرے کہ از پستان بے دوشیدن بیروں آید'' یعنی دوہنے کی کوشش کے بغیر تھن سے جو دودھ خود بخود بہہ پڑے اسی کو عربی میں نسل کہتے ہیں۔ اسی طرح بکثرت اون جب مویشیوں کے بدن سے جھڑنے لگے تو اس پر بھی اسی نسل کے لفظ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ پھر اسی مناسبت سے تیز سے تیز رفتار کی تعبیر ''نسل سے ہونے لگی۔ ان لغوی اشاروں سے اگر یہ سمجھا جائے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کی منتقلی میں جن ذرائع یا سواریوں سے وہ کام لیں گے وہ حد سے زیادہ تیز رفتار ہوں گی' جس کے متعلق دعویٰ کیا جائے کہ زبردستی قرآن سے یہ سمجھ لیا گیا ہے۔

۶۔ اور ہمارے ہاں کی روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی سچے نبی اور پیغمبر کے دین کو وہ اگر قبول بھی کر لیں تب بھی لوگوں کے معاشی نظام کو بگاڑنے اور تہہ و بالا کرنے سے یہ باز نہ آئیں گے خواہ وہ دین اسلام ہی کیوں نہ ہو۔

۷۔ اسی طرح اگر یہ مان لیا جائے اور ثابت ہو جائے کہ ''یاجوج و ماجوج'' والوں کا نسلی تعلق قائن (قابیل) حضرت آدم علیہ السلام کے اس نافرمان عاق شدہ لڑکے سے ہے' جس پر حضرت آدم علیہ السلام نے لعنت کی تھی اور اسی لئے اس آبادی سے جس میں آدم علیہ السلام اپنے بچوں کے اور ان کی اولاد کے ساتھ رہتے تھے بھاگ کر وہ روپوش ہو گیا تھا' تو ایسی صورت میں مردم کشی کے نت نئے ہتھیاروں کی ایجاد و

اختراع‘ اسی طرح رقص وسرود‘ گانے بجانے کے غیر معمولی ذوق وشوق اور اس سلسلہ میں حیرت انگیز صنائع و بدائع کے ظاہر کرنے پر تعجب نہ ہونا چاہئے کہ ان ہی دونوں خصوصیتوں کو ’’قابیلی نسل‘‘ کی طرف بائبل میں منسوب کیا گیا ہے‘ بلکہ ہابیل یعنی قابیل کے مقتول کے نام لیواؤں کے ساتھ ان کی چیرہ دستیوں کے قصوں کو بھی چاہیے کہ یاجوج و ماجوج کے موروثی عام عادات وخصائل میں شمار کیا جائے۔

ایک قرآنی اشارہ:

مذکورہ بالا علامات اور نشانیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیئے اور قرآن ہی کے ایک اور اشارے پر غور کیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ نفخ صور (یعنی صور پھونکے جانے) سے پہلے اور کھول دیئے جانے کے بعد درمیانی وقفہ میں یاجوج و ماجوج والوں کے متعلق ایک اور اشارہ سورۃ الانبیاء کی اس مشہور آیات میں ملتا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے:

’’اور حرام ہے اس آبادی کے لئے جسے ہم نے ہلاک کر دیا یہ کہ نہ واپس لوٹیں وہ تا ایں کہ جب کھول دیئے جائیں یاجوج و ماجوج اور حدب سے تیز چلتے ہوئے وہ نکل پڑیں‘‘

پڑھیے سورۃ الانبیاء کی آیت:

وَحَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ٥ حَتّٰى اِذَا فُتِحَتْ يَاجُوْجُ وَ مَاجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۔

آیت کا آخری حصہ یعنی یاجوج و ماجوج کے کھول دیئے جانے کا ذکر جس میں کیا گیا ہے۔ یہ پہلے بھی گزر چکا‘ لیکن اسی آیت کا پہلا جز یعنی جو آبادیاں ہلاک کی گئی ہیں‘ ان کے واپس لوٹنے پر حرمت کا حکم اس وقت تک کے لیے جو لگایا ہے‘ جب یاجوج و ماجوج کھول دیئے جائیں گے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ ’’یاجوج و ماجوج‘‘ کے خروج یا فتح یعنی دنیا کے مستقبل کی تاریخ میں ان کے نکل پڑنے کا ذکر عام مذاہب و ادیان کی یادداشتوں میں تلفظ کے معمولی ردو

بدل سے پایا جاتا ہے' گاگ و میگاگ' و ماگوگ' غوغ و ماغوغ کے سوا اسی کے قریب قریب ہندوستان کی بعض قدیم کتابوں میں یہی لفظ کوک وکوک کی شکل میں بھی بعضوں کو ملا ہے' لیکن مذاہب کی ان پیشنگوئیوں کے متعلق یہ عام دشواری تقریباً مشترک ہے کہ واقعہ جب تک سامنے نہ آ جائے پیشنگوئیوں کے الفاظ سے واقعہ کے تمام صحیح خط و خال سامنے نہیں آتے۔ رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ آئندہ پیش آنے والے واقعات کے بڑے ذخیرہ کا رسول اللہ ﷺ نے ان کو امین بنایا تھا۔ عہد صحابہ میں جب اس نوعیت کی کوئی بات دریافت طلب ہوتی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بخاری و مسلم وغیرہ صحاح کی کتابوں میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کے متعلق جن کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے سنا تھا' ایک بڑے پتے کی بات نقل کی گئی ہے۔ حاصل جس کا یہی ہے کہ واقعہ جب پیش آتا تب فرماتے کہ مجھے یاد آتا ہے کہ یہ تو وہی بات ہے جس کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کیا تھا۔ پیش گوئیوں کے اس خاص پہلو کو مثال سے سمجھاتے ہوئے وہی یہ بھی فرماتے تھے کہ حالت یہ ہوتی ہے کہ:

كما يذكر الرجل وجه الرجل اذا غاب عنه ثم اذا راه عرفه (مشکوٰۃ)

''جیسے کسی ایسے آدمی کے چہرے کا جو غائب ہو کوئی خیال کرے پھر جب اس کو دیکھے تو اس کو پہچان لے۔''

جس کا بظاہر مطلب یہی ہے کہ کسی شخص کے حلیہ اور اس کے چہرے کے خصوصیات کا ذکر کسی نے سنا ہو اور وہی آدمی جب اس کے سامنے آ جائے تو پہچان لے۔ پیش آنے سے پہلے پیش گوئیوں کی کچھ یہی نوعیت ہوتی ہے۔ اسی لئے پیش گوئیوں کی تعبیر جن الفاظ میں کی جاتی ہے۔ ان سے اصل حقیقت کی تعیین اس وقت تک ممکن نہیں جب تک واقعیت کا قالب اختیار کر کے واقعہ خود سامنے نہ آ جائے۔ [1]

---

[1] اور پیش گوئیاں تو خیر پیش گوئیاں ہی ہوتی ہیں۔ اپنا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ الفاظ سے یوں بھی مشاہدہ سے پہلے کسی خبر کی اصل حقیقت کے متعلق صحیح رائے قائم کرنا آسان نہیں ہے۔ خاکسار بچپن سے صفا و مروہ کا ذکر سنتا چلا آتا تھا پھر خدا ہی جانتا ہے کہ کتنی کتابوں میں مجھے پڑھایا گیا کہ حج کے دوسرے (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

آپ دیکھئے یاجوج کے کھل جانے کی گویا ایک علامت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ ہلاک شدہ آبادیوں کو واپس پلٹنے کا موقع اس وقت تک نہ ملے گا' جب تک کہ یاجوج و ماجوج کھول نہ دیئے جائیں۔ حاصل جس کا یہی ہوا کہ یاجوج و ماجوج کے کھل جانے کے بعد یہ روک جو ہلاک شدہ آبادیوں پر قدرت کی طرف سے لگی ہوئی ہے اٹھ جائے گی۔ اس روک کے اٹھ جانے کے بعد پھر کیا ہوگا؟ کیا ساری ہلاک شدہ آبادیوں کو واپس پلٹنے کا موقع ملے گا' یا بعضوں کو ملے گا اور بعضوں کو نہ ملے گا؟ اس سوال کے جواب کو ہم قرآنی الفاظ سے نہیں نکال سکتے' ان سے بس اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ واپس نہ لوٹنے کی حرمت اور روک ختم ہو جائے گی۔ یہ تو حاصل ہے مذکورہ بالا آیات کا' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ۔ ''ہلاک شدہ آبادیاں نہ واپس پلٹیں گی''

ان الفاظ کا مطلب کیا ہے؟ اور یہی نہیں ''حرام'' کا لفظ اس آیت میں جو استعمال کیا گیا ہے خود اس سے کیا مراد ہے؟ اور یہ کہ ''اھلکنھا'' (ہلاک کر دیا ہم نے) کے الفاظ سے جس ہلاکت کی خبر دی گئی ہے اس ہلاکت سے کیا مقصود ہے؟ اور اسی کے ساتھ ''یرجعون'' سے پہلے حرف نفی ''لا'' کا جو پایا جاتا ہے' عربی محاورے کی رو سے اس کی نوعیت اس کا مقام کیا ہے؟

تفسیر کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے' ان میں سے ہر سوال پر مفسرین کے جھونپڑے پڑے ہوئے

(گزشتہ سے پیوستہ) افعال کے ساتھ صفا اور مروہ پہاڑیوں کی درمیانی وادی میں حاجیوں کو دوڑنا پڑتا ہے۔ خیال یہی تھا کہ دو پہاڑیوں کے بیچ میں کوئی میدان ہوگا جس میں حجاج دوڑتے ہیں' لیکن جب خود حج کی سعادت حاصل ہوئی اور مطوف صاحب کعبہ کا طواف کرانے کے بعد صفا اور مروہ کی طرف مجھے لے چلے تو حرم کی مسجد سے نکلنے کے ساتھ ہی ہم حرم کے دروازے کے متصل بازار میں پہنچے جو اوپر سے مسقف تھا اور دو رویہ ہر طرح کی چیزوں کی دکانوں سے بازار پٹا ہوا تھا۔ پیٹرومیکس لیمپ دکانوں پر جگمگا رہے تھے۔ دوسری چیزوں کے ساتھ کھانے پینے کی دکانوں کا بھی سلسلہ تھا جس میں بیٹھ کر لوگ کھا پی رہے تھے۔ حرم کے اسی بازار میں پہنچ کر مطوف صاحب چلنے لگے جیسے بازار میں کوئی ٹہل رہا ہو۔ مجھے غصہ آ گیا اور مطوف سے کہنے لگا کہ بھائی یہ بازار کے سیر کا وقت ہے' مجھے تم صفا و مروہ کی طرف لے چلو تب مطوف ہنسا اور بولا کہ آپ ہیں کہاں؟ میں نے کہا کیا یہی صفا و مروہ کے درمیان کی وادی ہے؟ بولے پھر اور کیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون برسوں کا پروردہ تصور تہہ و بالا ہو گیا۔ شاد مرحوم کا شعر عموماً اسی موقع پر یاد آ جاتا ہے۔

تری گلی میں جو پہنچے تو سب غلط پایا دیا گیا تھا مکرر جہاں جہاں کا پتہ

ہیں اور اپنے اپنے رجحان کے مطابق لوگوں نے خیالات ظاہر کئے ہیں۔
علامہ شوکانی نے مشہور مفسر النحاس کے حوالہ سے اسی لئے نقل کیا ہے۔
ھذا الایۃ مشکلۃ (جلد۳ص۴۱۲)
"یعنی مذکورہ بالا آیت مطلب کے لحاظ سے کافی دشوار ہے"

دشواری کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ارباب تفسیر کو کوئی ایسی صحیح روایت نہیں مل سکی جس کی روشنی میں کسی پہلو کو وہ متعین کر سکتے ہوں۔ اسی نئے قرائن و قیاسات سے مدد لے کر مختلف بزرگوں نے کسی خاص پہلو کو متعین کرنا چاہا ہے۔ اسی سلسلہ میں ابوعبیدہ ابوعلی فارسی' الزجاج لغت اور عربیت کے جلیل آئمہ کا نام لیا جاتا ہے۔ میرے لئے نہ یہ ممکن ہے اور نہ ضرورت ہے کہ سوال و جواب کے اس تمام سلسلے کا یہاں ذکر کر کے ہر ایک کی تنقید کرتے ہوئے اپنے ذاتی احساس کو پیش کروں کیونکہ اس طویل عمل کے بعد بھی میری رائے اور میرے خیال کی حیثیت بھی منجملہ دوسرے احتمالات کے ایک احتمال ہی کی رہے گی۔ میں خود قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ جس پہلو کی طرف میرا ذہن منتقل ہوا ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ بالکل ممکن ہے کہ اس مسئلہ میں بھی میرے احساس کا حشر وہی ہو جو صفا و مروہ والے غریب احساس کا انجام اصل حقیقت کے سامنے آنے کے بعد ہوا' جس کا تذکرہ میں نے نوٹ میں کیا ہے۔

یاجوج و ماجوج کون ہیں؟

کچھ بھی قرائن اور قیاسات ہی کی مدد سے میرا ذہن بھی ایک نتیجہ تک پہنچا ہے' اسی کو پیش کر دیتا ہوں اس بات میں خود قرآن مجید کے عام طریقہ تعبیر ہی سے کم از کم اپنے نزدیک میں اپنے آپ کو متاثر پاتا ہوں۔ آپ قرآن مجید کی تلاوت شروع کیجئے' دیکھئے گا کہ یہودیوں کی وہ نسل جو نزول قرآن کے زمانہ میں پائی جاتی تھی' ان ہی کو خطاب کر کے ان کی طرف ان کی گزشتہ نسلوں کے اچھے اور برے کارناموں اور کرتوتوں کو منسوب کرتا چلا جاتا ہے۔ اور جن نعمتوں اور نوازشوں سے ہزار ہا ہزار سال پہلے ان کے آباؤ اجداد سرفراز ہوئے تھے ان کو بھی نزول قرآن کے وقت پائے جانے والے بنی اسرائیل کی طرف منسوب کر کے احسان جتلایا گیا ہے۔

قرآنی تعبیر کی یہ ایسی خصوصیت ہے جس کے لئے مثالوں کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں جس کا جی چاہے قرآن کھول لے۔ تیسرے چوتھے ورق سے خطاب کا یہ خاص طریقہ مسلسل اس کے سامنے گزرتا چلا جائے گا۔ طریقہ خطاب وتعبیر کے اس خاص اسلوب کا حاصل یہی تو ہے کہ بجائے انفرادی شخصیتوں کے اجتماعی وحدت کو سامنے رکھ کر افعال و اعمال' صفات و حالات کو منسوب کرنا قرآن کا عام پیرایہ بیان ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسری بات جو بنی اسرائیل ہی کی متعلقہ آیتوں سے سمجھ میں آتی ہے' مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں بنی اسرائیل ہی کو خطاب کر کے:

اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا۔

''اگر تم واپس ہو جاؤ تو ہم بھی واپس ہوں۔''

جو فرمایا گیا ہے کہ عود اور واپسی کے اس عام قانون کا ذکر کرتے ہوئے اسی قوم کے ساتھ یہ تاریخی حادثہ جو پیش آیا تھا کہ بعض زور آور (اولی باس شدید) قوموں نے ان کو برباد و ہلاک کر دیا تھا اور پھر یہودیوں کو دوبارہ سنبھال لینے کا موقع عطا کیا گیا جس کے آثار و نتائج کو بتاتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اَمْدَدْنَا كُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا۔

''ہم نے مال و دولت اور اولاد نرینہ سے تمہاری مدد کی اور تم کو بنا دیا ہم نے بڑی تعداد والی قوم۔''

ظاہر ہے کہ زور آور قوموں کے تباہ و برباد ہونے والی اسرائیلی نسل کا وہ طبقہ اس طبقہ سے یقیناً مختلف تھا' جن کو اپنی پرانی عظمت وشوکت' دولت و امارت' قوت و طاقت کی طرف واپس ہونے کا موقع ملا تھا' لیکن قرآن نے بربادی اور تباہی کو جس طرف منسوب کیا ان ہی کی طرف عظمت رفتہ کی واپسی کو بھی اس نے منسوب کیا ہے۔

ان دو تمہیدی مقدمات کے بعد اگر یہ سمجھا جائے کہ یاجوج و ماجوج سے تعلق رکھنے والی مذکورہ بالا آیت میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ہلاک شدہ آبادی کو واپس پلٹنے کا موقع اس وقت تک حاصل نہ ہوگا۔ جب تک یاجوج و ماجوج نہ کھول دئے جائیں اس کا اگر یہ مطلب سمجھا جائے کہ

یاجوج و ماجوج کے کھلنے سے پہلے برباد و تباہ ہونے والی آبادیوں کو دوبارہ سر اٹھانے اور عروج و ترقی حاصل کرنے کا موقع یاجوج و ماجوج کے کھول دیئے جانے کے بعد ہی مل سکتا ہے۔ تو میں نہیں سمجھتا کہ قرآنی طریقہ تعبیر اور طرز خطاب سے جو مانوس ہیں ان کے لئے یہ کوئی اچنبھے کی ایسی بات ہو جسے خواہ مخواہ دور از کار شاعرانہ تاویل قرار دے کر نا قابل لحاظ ٹھہرا دیا جائے۔

بلکہ یوحنا کے یاجوج و ماجوج والے جس مکاشفے کا میں نے ذکر کیا تھا۔ اس میں بھی الصادق الامین ﷺ کے بعد ہزار سال تک شیطان کے قید ہو جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے اور یہ بتاتے ہوئے کہ ہزار سال جب پورے ہو جائیں تو

''اس کے بعد ضرور ہے کہ تھوڑے عرصہ کے لئے وہ (شیطان) کھولا جائے''

آگے اسی سلسلہ میں اسی مکاشفہ میں چند سطریں پائی جاتی ہیں جن میں اب تو ''یسوع اور مسیح'' کا نام لہلہاتا ہے لیکن قرینہ بتاتا ہے کہ اسی مکاشفہ کے ''الصادق الامین'' کے الفاظ پر جیسا کہ عام دستور ہے تحریف کی قینچی چل گئی ہے ورنہ پہلے سے جب ''الصادق الامین'' کا ذکر چلا آرہا ہے تو اچانک ''یسوع'' اور ''مسیح'' کے تذکرہ کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں، کچھ بھی ہو آگے جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا حاصل میرے نزدیک یہی ہے کہ ''الصادق الامین'' یعنی رسول اللہ ﷺ پر جو ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی۔

''وہ زندہ ہو کر ہزار برس تک ''مسیح'' [1] کے ساتھ بادشاہی کرتے رہے''۔

(مکاشفہ یوحنا ۴/۲)

یہاں مسیح کے لفظ کی جگہ ''الصادق الامین'' پڑھتے ہوئے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے۔ ہزار سال تک دنیا کی سیاسی باگ جن کے ہاتھوں میں رہی اس کے بعد سے۔

---

[1] مسیح کا ماخذ سیاحت ہے۔ یہ تو خیر عامیانہ توجیہ ہے، لیکن ارباب تحقیق کے نزدیک اس لفظ کا ''ماشیخ'' دراصل ایک اصطلاحی لفظ ہے اور اس سے مر خدا کا برگزیدہ بندہ ہے، اس کے سر پر خدا کی خوشنودی کا تیل مشیخ کیا گیا یعنی چپڑا گیا۔ الاستاذ الامام الکشمیری نے شرح بخاری میں بھی یہ قول نقل کیا ہے کہ ''ماشیخ'' سے بعض مواقع میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مراد ہیں۔ (دیکھو فیض الباری صفحہ ۲۷ جلد ۴)

''اور جب تک ہزار برس پورے نہ ہولئے باقی مردے زندہ نہ ہوئے'' (مکاشفہ باب ۵/۲)
تقریباً اس فقرے کا مآل بھی وہی ہے جو سورۃ الانبیاء کی مذکورہ بالا یاجوج و ماجوج والی آیت کا ہے۔ خود اسی مکاشفہ کے حوالے سے نقل کر چکا ہوں کہ:

''جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا اور ان قوموں کو جو زمین کے چاروں طرف ہوں گی یعنی یاجوج و ماجوج کو گمراہ کر کے لڑائی کے لئے جمع کرنے کو نکلے گا''۔ (باب ۲۰، ۷، ۸)''

حاصل یہی ان کا کہ یاجوج و ماجوج کے کھولے جانے کے بعد ان مردوں کو زندہ ہونے کا موقع ملے گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر ہزار برس والے زمانے میں زندگی نہ حاصل کر سکے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے اسے ادا بھی کر سکا یا نہیں لیکن مطلب میرا یہی ہے کہ یوحنا کے اس مکاشفہ میں قدرے رسمی تحریف کے ساتھ جو کچھ پایا جاتا ہے اسی کا اعادہ قرآن میں کیا گیا ہے اور خلاصہ دونوں کا یہی ہے کہ یاجوج و ماجوج کے کھل جانے کے بعد دنیا کی ان قوموں کو سر اٹھانے کا موقع ملے گا جو اسلام لا کر زندہ قوموں میں شریک نہ ہو سکی تھیں۔

اور یہ بھی یاجوج و ماجوج نامی اقوام کے پہچاننے کی منجملہ دوسری نشانیوں کے ایک ایسی نشانی ہے جس کا مطالعہ ہم تاریخ کے اوراق کے سوا اپنی موجودہ دنیا کے سٹیج پر بھی کر سکتے ہیں۔ اور ان قوموں کو ہم پہچان سکتے ہیں جو ''اسلامی دولت'' کے ایام میں تو مردہ رہیں لیکن مسلمانوں کا دور جب ختم ہوا تو زندگی کی نئی ہلچل ان ہی مردہ قوموں کی آبادیوں میں شروع ہوئی اور یکے بعد دیگرے زندہ ہو ہو کر دنیا کے سامنے نمایاں ہو رہی ہیں۔

اور اب پڑھئے مذکورہ بالا معروضات کی روشنی میں اس قرآنی آیت کو۔

وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ○ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۔

اور روک لگی ہوئی ہے اس آبادی پر جسے ہم نے ہلاک کیا کہ وہ نہ واپس لوٹیں گے تا اینکہ جب کھول دیئے جائیں یاجوج و ماجوج اور ہر ڈھلاو (حدب) سے وہ تیز

رفتاری کے ساتھ چل نکلیں۔"

اور غور کیجئے کہ فقیر کا ذہن جس پہلو کی طرف منتقل ہوا ہے دوسرے قرائن و قیاسات اور قرآن کے خاص طریقہ تعبیر وطرز ادا سے اس کی کس حد تک تائید ہوتی ہے۔ **واللہ تعالیٰ اعلم و علمہ اتم و احکم۔**

تاہم باوجود ان تمام صفاتی نشانیوں کے مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ قرآنی آیات کی روشنی میں ہم نام اور رسمی تعین کے ساتھ ان قوموں کو متعین نہیں کر سکتے، جن کو قرآن نے یاجوج و ماجوج کی بھیڑ میں داخل کیا ہے۔ مذکورہ بالا قرآنی آیتوں کو ہم پیوند کر کے دیکھنے کے بعد بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ایک ٹوپی ضرور تیار ہوگئی ہے اب یہ آپ کا اور ہمارا کام ہے کہ قوموں کے سروں پر رکھ رکھ کر دیکھیں کہ یہ ٹوپی ٹھیک کن سروں پر بیٹھ جاتی ہے اس میں غیر قرآنی چیزوں سے کچھ مدد بھی اگر لی گئی تو ان کی حیثیت مغزی اور گوٹ کی ہے لیکن جوہری ٹکڑے صرف قرآن سے حاصل کئے گئے ہیں۔

دعویٰ "مہدیت" و "مسیحیت"

واقعہ یہ ہے کہ پچھلے دنوں بعضوں کی طرف سے "یاجوج و ماجوج" کے مسئلہ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی ناکوہیدہ کوششوں میں غیر معمولی سرگرمیاں عمل میں آئیں اور "یاجوج و ماجوج" اور "المسیح الدجال" کے قصوں کو اچھال اچھال کر خواہ مخواہ یہ ہنگامہ برپا کر دیا گیا کہ مہدی اور مسیح بن مریم کی جستجو کا وقت آ گیا۔ اسی ہنگامے میں اس دعویٰ کا اعلان کر دیا گیا کہ مسلمانوں کا مہدی اور عیسائیوں کا مسیح بن مریم آ گیا۔ سادہ لوحوں کا ایک طبقہ اس عجیب و غریب دعوے کی طرف متوجہ بھی ہو گیا اور انتظار کرنے لگا۔ ان کارناموں کے ظہور کا جن کے بغیر نہ مہدی مہدی اور نہ مسیح بن مریم بن سکتے ہیں، لیکن انتظار کرنے والے غریب انتظار ہی کرتے رہے اور مہدی و مسیح بنا کر اپنے آپ کو پیش کرنے والے صاحب دنیا سے تشریف بھی لے گئے۔ لیکن واقعات ان کے سامنے بھی اور ان کے چلے جانے کے بعد بھی مہدی اور مسیح کے کارناموں کے برعکس ہی پیش آتے رہے اور پیش آتے چلے جا رہے ہیں۔ انتظار کرنے والوں کا یہ مسکین طبقہ اب حیران ہے

کہ جس مغالطہ کا شکار ان کو بنالیا گیا تھا اس کی توجیہ کیا کرے' حالانکہ مستقبل کی تاریخ میں پیش آنے والے جن حوادث وواقعات کا ذکر دینی وثائق میں بطور آثار قیامت کیا گیا ہے کاش ان کے متعلق یہ بنیادی بات ان کے دل میں نہ بیٹھ جاتی کہ یہ سارے واقعات ایک ساتھ زمانہ کے کسی محدود حصہ میں اچانک پیش آئیں گے۔ یہ فیصلہ قطعاً عاجلانہ اور عامیانہ فیصلہ ہے۔ اور اصل حقیقت وہی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیدنا الاستاد الامام مولانا انور شاہ الکشمیریؒ فرمایا کرتے تھے۔ ان کی املائی شرح فیض الباری میں بھی ہے۔

الاترى ان النبى صلى الله عليه وسلم عد من اشراط الساعة قبضه من وجه الارض وفتح بيت المقدس و فتح القسطنطنية' فهل تراها متصلة او بينها فاصلة متفاصلة (فیض الباری شرح بخاری)

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود اپنی وفات کو بھی قیامت کے شرائط میں شمار فرمایا ہے اور ان ہی شرائط قیامت میں بیت المقدس اور قسطنطنیہ کی فتح کے واقعات بھی ہیں' پھر کیا یہ سارے واقعات باہم ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں یا ان کے درمیان غیر معمولی فاصلے ہیں۔''

بہر حال یاجوج و ماجوج کے کھل جانے کے ساتھ ہی خواہ مخواہ مہدی اور مسیح کی تلاش کا جو جذبہ عوام میں جو بھڑکا دیا گیا' سچ پوچھئے تو ایک ''بڑی حقیقت'' شورش اور ہنگامے کے اس طوفانی گردوغبار میں دب کر رہ گئی ورنہ بقول الاستاذ الامام الکشمیری واقعہ کی اصل صورت یاجوج و ماجوج کے متعلق یہ تھی کہ:

لهم خروج مرة بعد مرة وقد خرجوا قبل ذلك ايضًا و افسدوا فى الارض بما ليستعاذ منه نعم يكون لهم الخروج الموعود فى آخر الزملن و ذلك اشدها۔

''اچانک ایک دفعہ وہ پل پڑیں گے ایسا نہیں ہے بلکہ بار بار نکلتے رہیں گے آخر پہلے بھی تو وہ نکلے اور زمین میں وہ گڑبڑ مچائی کہ اللہ اپنی پناہ میں اس سے رکھے' ہاں! آخر زمانہ میں بھی ان کے نکلنے کا وعدہ کیا گیا ہے اور ان کا یہ خروج سب سے زیادہ

سخت ہوگا۔"

اور دنیا کے آخری ایام میں بھی ان کے خروج کی مدت یعنی نکلنے کے بعد کب تک دنیا میں وہ گڑبڑ مچاتے رہیں گے اس کو کون متعین کرسکتا ہے؟ البتہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خروج کے بعد بالآخر ان کو تہس نہس کرنے اور ان کے مفسدانہ مصائب سے نجات دینے کے لئے قدرت کی طرف سے خاص انتظام ہوگا اور مقابلہ کے لئے غیر معمولی برگزیدہ ہستیاں سامنے آئیں گی۔ ہمارے یہاں کی ان روایتوں میں بھی اس آخری کشمکش کا ذکر پایا جاتا ہے جن میں رطب ویابس ہر طرح کی چیزیں شریک ہیں اور عوام میں وہی زیادہ مشہور ہوگئی ہیں۔ اور یاجوج و ماجوج کے نام کے سنتے ہی ان باتوں کی طرف لوگوں کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے' حالانکہ تنقید روایات کے عام آئمہ اور ارباب تحقیق کا یہ فیصلہ کتابوں میں نقل بھی کیا جاتا ہے کہ:

انه قد اختلف فی عدد هم و صفاتهم ولم یصح فی ذلك شیء

"یاجوج و ماجوج کے شمار اور ان کی خصوصیات میں اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں کوئی بات صحیح روایت سے ثابت نہیں۔" (فیض الباری بحوالہ ص ۴/ ۴۶)

مگر پھر بھی ان ہی روایت کی بنیاد پر ایسی باتیں عوام میں پھیل گئی ہیں کہ یاجوج و ماجوج والوں میں بعض لوگوں کا قد غیر معمولی طور پر دراز ہوگا۔ اور ان ہی میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کا قد چار ہاتھ لانبا اور چوڑائی بھی ان کی چار ہاتھ ہی ہوگی۔ اور ایک طبقہ ان ہی میں ایسا بھی ہوگا جن کا قد بالشت یا دو بالشت سے زیادہ نہ ہوگا اور یہ کہ کچھ لوگ ان ہی میں ایسے بھی ہوں گے جو اپنے ایک کان کو اوڑھیں گے اور ایک کو بچھائیں گے۔ ان کی کثرت تعداد کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور یہ کہ عورتوں کے استعمال میں بھی کسی خاص آئین و قانون کے پابند نہ ہوں گے' یہی حال کھانے پینے میں بھی ان کا ہوگا کہ کسی قسم کا جانور ہو' ہاتھی ہو' سور ہو' اونٹ ہو' جنگلی ہو' بلی ہو سب ہی کو چٹ کر جاتے ہیں۔ [1]

---

[1] تفسیر کی روایاتی کتابوں میں یہ روایتیں مل جائیں گی۔ سیوطی نے اپنی تفسیر درمنثور میں کافی ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ لیکن عموماً یہ روایتیں غیر معتبر کتابوں سے ماخوذ ہیں اور تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر تو نومسلم یہودیوں اور عیسائیوں کے اقوال ہی ان میں زیادہ شریک ہیں' تاہم یاجوج و ماجوج (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

ایک مستند روایت:

عجیب بات ہے کہ یاجوج و ماجوج کے تعلق یہ اور اسی قسم کی روایاتی باتوں کا چرچا تو عوام و خواص میں سب ہی میں پھیلا ہوا ہے لیکن ان ہی روایتوں میں ہم ایسی چیزیں بھی جو پاتے ہیں مثلاً البیہقی کی کتاب البعث کے حوالہ سے مشہور صحابی ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت تفسیر کی کتابوں میں پائی جاتی ہے جس میں ہے کہ ابن عمر فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ:

من ورائهم ثلاث امم تاويل و تار ليس و منسك

''یعنی یاجوج و ماجوج کے پیچھے تین قومیں ہیں تاویل وتاریس ومنسک''

امام بیہقی کے علاوہ سیوطی نے لکھا ہے کہ طبرانی ابن المنذ ر وغیرہ حدیث کے چوتھے درجے کی کتابوں میں بھی یہی روایت پائی جاتی ہے اور علاوہ ابن عمر کے دوسرے صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف بھی یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ انہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ سے یہی سنا تھا۔ (دیکھو در منثور صفحہ ۲۴۹ جلد ۴)

اور اب ملایئے ابن عمر اور ابن مسعود کی اس روایت کو بائبل کی اس کتاب کی عبارت سے جو حزقیل نامی بنی اسرائیل کے کسی بزرگ کی طرف منسوب کر کے عہد عتیق کے مجموعہ میں شریک ہے۔ ڈھائی ہزار سال سے کم مدت کا یہ تاریخی وثیقہ نہیں (1) ہے۔ بہر حال اسی کتاب میں حزقیل نبی کی طرف یہ یا اسی کے قریب قریب الفاظ منسوب کرتے ہوئے کہ:

(گزشتہ سے پیوستہ) کی عددی اکثریت کے متعلق امام کشمیری کا خیال ہے کہ "**قد صح في كثرة عددهم** (ان کی عددی اکثریت کے متعلق بعض روایتیں صحیح ہیں) اس سلسلہ میں حیدرآباد کے امیر نواب ظہیر یار جنگ کے سفر نامہ کا خیال آتا ہے انہوں نے یورپ و امریکہ کا سفر کیا تھا ان کا بیان ہے کہ غالباً ہالینڈ میں ان کو اتفاقاً ایک دو آدمی نہیں بلکہ مستقل آبادی ہی دکھائی گئی تھی جس کے باشندے حد سے زیادہ پستہ قد تھے پوری آبادی بونوں سے بھری ہوئی تھی جس میں مرد عورت بچے سب ہی تھے۔

(1) حزقیل علیہ السلام کے متعلق یہی سمجھا جاتا ہے کہ جب بخت نصر یہودیوں کو فلسطین سے اسیر کر کے لے گیا تو اس زمانہ میں وہ موجود تھے۔ حاصل یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ سو سال پہلے حزقیل کا زمانہ ہے اس لئے ڈھائی ہزار سال سے کم کی پیش گوئی نہیں ہے۔۱۲

''خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا''

بہت سے آئندہ پیش آنے والے واقعات کا ذکر پایا جاتا ہے' جن میں ایک جگہ یہ بھی ہے کہ: اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد جاجوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روس اور مسک اور توبل کا فرماں روا ہے' متوجہ ہو اور اس کے خلاف نبوت کر اور کہہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ دیکھ! اے جوج روس مسک اور توبل کے فرماں روا'' (حزقیل ۱تا۴/ ۳۸)

پھر باب ۳۹ میں بھی ہے۔

''پس اے آدم زاد! تو جوج کے خلاف نبوت کر اور کہہ خداوند! خدا یوں فرماتا ہے کہ دیکھ! اے جوج روس اور مسک اور توبل کے فرماں روا میں تیرا مخالف ہوں۔''

غالباً روسی یاجوج کی نسل ہیں اور برطانوی ماجوج کی نسل:

اسی کے ساتھ جغرافیہ کی عام ابتدائی کتابوں میں ''ایشیائی روس'' کے زیر عنوان جو تفصیلات دیئے گئے ہیں ان کو پڑھئے' جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے رقبہ سے چوگنا بڑا علاقہ سایبریا کے نام سے روس ہی کے قبضے میں ہے جس میں اسٹیپسز اور ٹونڈار کے عریض و وسیع خطے شریک ہیں۔ اور ٹوبال سک منسک نامی شہر ولادی واسٹاک اور کٹسک وغیرہ نامی آبادیوں کے ساتھ اسی علاقے میں پائے جاتے ہیں۔

ان تفصیلات کو اپنے علم میں شریک کرتے ہوئے بتایا جائے کہ حضرت الاستاذ الامام الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے اس دعوے پر کون تعجب کر سکتا ہے۔

اما الروس فهم من ذرية ياجوج (صفحہ ۲۳ جلد ۳)

''روس والے یاجوج کی نسل میں ہیں''

اسی کے ساتھ بعض مواقع پر شاہ صاحب یہ بھی فرماتے تھے۔

ان ياجوج و ماجوج لا يبعد ان يكونوا اهل روسياو بريطانيا۔

''یاجوج و ماجوج اگر روس اور برطانیہ والے ہوں تو اس دعوے کو بعید از واقعات نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے''

دوسرا جز یعنی روس کے علاوہ برطانیہ والوں کا بھی یاجوج و ماجوج والوں ہی میں سے ہونا' چوں کہ ایک تاریخی مسئلہ ہے اور شروع ہی سے عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ اصولاً اپنے اس مضمون میں کسی ایسے مسئلہ کا حتی الوسع میں ذکر نہیں کروں گا جس کی حیثیت صرف تاریخی ہو یہ کام ارباب تاریخ کا ہے اور اپنی معلومات کی روشنی میں چاہیں تو اس مسئلہ کی تحقیق وہ کر سکتے ہیں۔ ❶

اور سچ تو یہ ہے کہ جیسے ''المسیح الدجال'' کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ بجائے ذات کے اصل ضرورت اس کی ہے کہ ان ''دجالی صفات'' کا پتہ چلایا جائے جن کی وجہ سے ''دجال'' دجال بن جائے گا اور اسی طرح یہ ڈھونڈنا کہ دنیا کی کن قوموں کو یاجوج و ماجوج قرار دینا چاہئے' ایک غیر ضروری تاریخی مسئلہ سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ میں بھی بجائے ذات کے ہمیں ان صفات ہی پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہئے جس کی وجہ سے مذاہب و ادیان میں یاجوج و ماجوج سے چوکنا رہنے پر اصرار کیا گیا ہے۔

☆☆☆

---

❶ یورپ کی قوموں کے سب ناموں اور بے شمار نام کے قبائل ان میں جو پائے جاتے تھے' ان سے واقفیت کے سوا اس سلسلہ میں ایسی باتیں کہ انگلستان کیڈ میگاگ بل (یعنی کوہ ماجوج نامی کوئی پہاڑی پائی جاتی ہے' یا ہر سال انگلستان میں ''گاگ میگاگ یعنی یاجوج و ماجوج کا میلہ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے جمتا چلا آتا ہے' یا شہر لندن میں گلڈ حال نامی جو عمارت ہے' شاید لندن کارپوریشن کا صدر دفتر اسی عمارت میں ہے' اس کے دروازے پر گاگ و میگاگ یعنی وجوج و ماجوج کی دیواریں آمنے سامنے جو کھڑی کی گئی تھیں۔ یہ کس راز کی طرف اشارہ ہے۔ اور اسی قسم کے بیسیوں قصوں کو تاریخ کے علماء اپنی بحث اور تلاش و جستجو کا موضوع بنا کر نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ مضمون کی حد تک میرے لئے اتنے چند اشارے ہی کافی ہیں۔

باب ہفتم

یاجوجیت وماجوجیت

اسی نقطہ نظر سے آپ پھر سورۂ کہف کو اٹھا لیجئے' اس کا تذکرہ کرنے کے بعد جب صور پھونک دیا جائے گا تو ''یاجوج وماجوج'' کو ہم اکٹھا کریں گے یعنی فرمایا گیا ہے وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا اس کے بعد آخر سورۂ تک جو آیتیں پائی جاتی ہیں ان کو پڑھتے جایئے۔ میں بالترتیب ان آیتوں کو ترجمہ کے ساتھ اور جو کچھ اپنے ناقص خیال میں آیتوں سے سمجھ میں آیا ہے اسے پیش کردیتا ہوں۔ پہلی آیت اس سلسلہ کی یہ ہے' یعنی یہ فرماتے ہوئے کہ:

وَ عَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا

اس دن (یعنی نفخ صور سے اکٹھے ہونے کے بعد) جہنم ان ہی کافروں پر ہم پیش کریں گے۔ خاص طور پر پیش کرنے کی شکل میں''

اللہ کا نام تک گوارا نہیں:

آگے ان ہی الکافرین کی صفات کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَ كَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا '

''یعنی وہ لوگ جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں رہیں اور وہ سننا بھی (میرے ذکر کا) برداشت نہیں کرسکتے تھے''۔

ظاہر ہے کہ پہلا جز یعنی جہنم کے پیش ہونے کی کیا صورت ہوگی' اس حقیقت کا انکشاف تو اسی دن ہوگا اور انہی کو جن پر جہنم اپنے خاص رنگ میں پیش ہوگی' لیکن دوسرے جز کے لئے قیامت کے قائم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی دنیا کی بات ہے۔ ڈھونڈ ھئے اس بات کو کہ کن قوموں میں یہ صفات اور خصوصیات پائی جاتی ہیں' مشرکین اور بت پرست یا ان کے سوا مختلف ملل وادیان کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والی قوموں کے لئے مفید ہو یا غیر مفید لیکن خالق کے ذکر سے قطعاً بے تعلق رہنے کا دعویٰ ان کے متعلق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ دوسرے

معبودوں ہی کے ساتھ سہی لیکن بہر حال عالم کے خالق کی یاد سے کوئی قوم خالی نظر نہیں آتی۔ پھر اسی اطلاع کا یہ حصہ ''یعنی اور وہ سننا بھی (میرے ذکر کا) برداشت نہیں کر سکتے''

دیکھ لیجئے کہ ذکر اللہ کے سننے کو بھی آج جو برداشت نہیں کر سکتے وہ کون لوگ ہیں؟ ان کی تقریروں میں' تحریروں میں تلاش کیجئے' ہر چیز کے ذکر کے ساتھ جس کے ذکر سے وہ خالی نظر آئیں گی' یہ اپنے پیدا کرنے والے خالق کردگار ہی کا ذکر ہوگا؟ اس باب میں اس کی نفرت کا درجہ استہزاو تمسخریہ کے حدود تک کن لوگوں میں پہنچ چکا ہے؟ کیا اس کے لئے کسی ریسرچ اور جستجو کی ضرورت ہے؟

رپٹ لکھوائی ہے یاروں نے جا جا کر یہ تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اکبر مرحوم کا یہ شعر آج جو زبان زد عوام بنا ہوا ہے' کیا یہ کوئی اتفاقی بات ہے یا ان کی اس ظرافت میں کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں ہے؟

این سخن راچہ جواب است تو ہم میدانی

خدا کے بجائے بندوں پر اعتماد:

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ط اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ٥

''کیا وہی لوگ جنہوں نے انکار کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ بنالیں میرے بندوں کو میرے سوا اپنے پشت پناہ۔ ہم نے تیار کر رکھی ہے جہنم ان کی مہمان نوازی کے لئے''

خالق عالم حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی یاد اور ذکر سے کلی انحراف اور بغاوت کے بعد فطرت انسانی کے ایک خاص رجحان کی طرف ایک خاص قسم کا اشارہ سوچنے سے آپ کو اس آیت میں مل سکتا ہے' کم از کم خاکسار کا ناچیز احساس یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے خالق کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے یا نکل بھاگنے کا زندگی کے موجودہ ابتلائی و

عبوری دور میں یہ ایک آسان طریقہ ہے کہ خالق سے اپنا رشتہ توڑ لیا جائے اور ''خدا کو کیا پڑی' میرے تمہارے درمیان کیوں ہو'' کہتے ہوئے جو جی میں آئے آدمی کرتا چلا جائے۔عموماً الحاد کی زندگی کے نیچے کچھ اسی قسم کی شعوری وغیر شعوری ذہنی چالاکیاں اور بے باکیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ الحاد اور بے دینی کی زندگی کا ایک پہلو تو یہ ہے' لیکن اسی کے ساتھ انسان جو سراسر احتیاج اور اپنے خاص حالات کے لحاظ سے صرف فقر اور کہیے تو کہہ سکتے ہیں کہ مجسم بھیک اور صرف سوال ہی سوال کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہے' اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی بیرونی امداد کے بغیر وہ بسر نہیں کر سکتا' کھانے' پینے اور پہننے حتیٰ کہ سانس تک لینے میں غیر کی محتاجی غریب آدمی کی زندگی کا ایسا کھلا ہوا خاصہ ہے جس سے قطع نظر کرنے کی صورت ہی نہیں۔ وہ بیمار پڑتے ہوئے جس علاقہ میں رہتا ہے وہاں عموماً وبائیں پھوٹتی رہتی ہیں' قحط' خشک سالی کے حملے ہوتے رہتے ہیں' جنگوں کا خلفشار مچتا رہتا ہے' بے آئینی اور بدامنی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے' یہ اور اسی قسم کے پیش آنے والے حوادث و واقعات کے مقابلہ میں کیا کیا جائے؟ ایک سوال ہے جو تاریخ کے نامعلوم زمانے سے بنی آدم کے دل و دماغ میں ہل چل مچائے ہوئے ہے۔ خالق عالم کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی پشت پناہی یا ولایت میں اپنی زندگی کو ڈال دیا جائے' یہ حل تو اس سوال کا بظاہر آسان نظر آتا ہے' لیکن اسی کے ساتھ انسان جو جس نصب العین کی تکمیل کے لئے پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے اس کی ذمہ داریاں اس راہ میں قدرتاً عائد ہو جاتی ہیں' قرآن میں اس کا اعلان کرتے ہوئے کہ:

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔

''میرے بندے جب پوچھیں میرے متعلق تو کہہ دو کہ میں قریب اور پاس ہی رہتا ہوں اور پکارنے والوں کی پکار کا جواب دیتا ہوں''

آگے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ:

فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَالْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ۔ (البقرہ)

''بس چاہئے کہ وہ بھی مجھے جواب دیں اور مجھے مانیں تا کہ وہ سیدھی راہ پر چل پڑیں۔''

اس میں کارروائی کے اسی دوطرفہ پہلو کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے۔ حاصل یہی ہے کہ مجھ سے کچھ لینا چاہتے ہو تو جو کچھ تم سے میں چاہتا ہوں اسے تم بھی تو پیش کرتے رہو "لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ" تاکہ وہ سیدھی راہ پر چڑھ جائیں کا مطلب یہی ہے' راہ یابی کا فطری طریقہ یہی ہے لیکن جو خود سب کچھ لینا چاہتے ہوں مگر خود کسی قسم کی ذمہ داری اپنے اوپر اپنے پیدا کرنے والے کی لینا نہیں چاہتے' ان میں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جنہوں نے خالق عالم اور اپنے درمیان "آلہہ" یعنی دیوتاؤں اور مخلوق معبودوں کا ایک سلسلہ فرض کر رکھا ہے۔ شعور اس کا ان کو ہو یا نہ ہو' لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس تدبیر سے اپنی کاربرآریوں کی ایک ایسی راہ اپنے خیال' صرف خیال میں انہوں نے نکال لی ہے جس میں ان کے زعم یا وہم کے مطابق ان کی ضرورتوں کی تکمیل کا تو انتظام ہو جاتا ہے' مگر خود ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ صرف ان درمیانی وسائط اور مخلوق معبودوں کے متعلق ان کا احساس ہوتا یہی ہے کہ نذر و نیاز وغیرہ چڑھاوے کی وقتی پیشکشوں سے خوش ہو کر ہماری حاجتوں کو ہمارے یہی "آلہہ" یا دیوتا پوری کرا دیتے ہیں' لیکن ان کے معبودوں کی طرف سے کسی قسم کا کوئی آئینی مطالبہ ان پر عائد نہیں ہوتا۔ غرض ان کی ذمہ داری ہوتی بھی یہی ہے کہ آئینی ذمہ داری کے بغیر ان کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔ اپنے ان معبودوں کی نذر و نیاز کے سلسلے میں بیش قرار رقوم صرف کر دینا' ان کو اس سے زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آپ پر اور اپنے نفس کی خواہشوں پر پابندیاں عائد کریں۔ یہ مشاہدہ کی بات ہے کہ مشرکانہ کاروبار کرنے والوں میں کسی قسم کی ایسی اخلاقی اور آئینی ذمہ داری جو ان کے دیوتاؤں کی طرف سے ان پر عائد کی گئی ہو' اس کا احساس نہیں پایا جاتا۔ خواہ ان معبودوں کی پوجا پاٹ میں ان کا جتنا بھی خرچ ہو جائے' گویا خدا کی ذمہ داریوں کے احساس کو دبانے کی یہ ترکیب اس طبقہ نے تراش لی ہے کہ خدا کے سامنے انہیں آنا ہی نہ پڑے بلکہ خود تو وہ اپنے خود تراشیدہ معبودوں کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کے معبودوں سے چونکہ خدا راضی ہے' اس لئے اللہ میاں سے ان کی ضرورتوں کی تکمیل وہ کرا لیں گے۔

اسی طریقہ کے مقابلہ میں ایک دوسری تدبیر یہ بھی ہے کہ خدا کے سامنے سے تو اپنے آپ کو مطلق العنان اور آزاد رکھنے کے لئے وہ بھاگ جاتے ہیں' بھول کر بھی نہ خدا کا نام لینا چاہتے

ہیں اور نہ ان کو وہ یاد ہی آتا ہے۔ باقی زندگی کی ضرورتوں اور حاجتوں کے لئے مشرکوں کے نادیدہ وخودتراشیدہ اوران کے خیال کے مطابق خدارسیدہ معبودوں کی جگہ انہوں نے ہر ضرورت اور حاجت کے لئے فنی خلاق یا ٹیکنیکل ایکسپرٹوں کا وہ طبقہ کھڑا کرلیا ہے جس کی تعلیم وتربیت پر اس سے زیادہ توجہ اور زیادہ خرچ کرتے ہیں' جتنی توجہ اور جتنے مصارف کا بار مشرکانہ کاروبار والے اپنے معبودوں کو راضی رکھنے کے لئے برداشت کرتے ہیں اور ہر پیش آنے والی ضرورت کے لئے وہ ان ہی خلاق اور اکسپرٹوں کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ ان ہی کی ولایت اور پشت پناہی میں ان کی ساری زندگی بسر ہوتی ہے۔ کسی ایسی جگہ قیام ان کے لئے دوبھر بلکہ شاید ناقابل تصور ہوتا ہے جہاں اپنے ان اولیاء یا پشت پناہوں کے دست یاب ہونے میں کسی قسم کی دشواری کا خطرہ ہو۔ ان ہی ایکسپرٹوں کے ساتھ ساتھ ایک طبقہ ان میں لیڈروں اور قائدوں کا بھی ہوتا ہے اور عموماً اجتماعی حاجات میں ان ہی پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ الغرض خدا کی ذمہ داریوں سے بچتے ہوئے ضرورتوں اور حاجتوں کی تکمیل میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیش آئے' اس کے لئے ان ہی مذکورہ بالا دو طریقوں میں سے کسی ایک یا دونوں کو ساتھ ساتھ اختیار کرنے والوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ قرآن میں مشرکانہ کاروبار والوں کے طرز عمل کی تعبیر کے سلسلے میں عموماً اس قسم کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

اِتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً۔

''انہوں نے میرے سوا معبود بنا لئے ہیں''

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں جن پر مشرکین بھروسہ کیا کرتے تھے اور جن کی طرف اس راہ میں رجوع ہوتے تھے' ان کو آپ دیکھیں گے۔ عموماً ''آلھتہ'' کے نام سے قرآن موسوم کرتا ہے' لیکن سورۂ کہف کی مذکورہ بالا آیت میں بجائے اس کے ہم ''**عبادی من دونی اولیاء**'' کے الفاظ پائے جاتے ہیں' یعنی یہاں بجائے وہ آلہہ'' کے ''اولیاء'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے' اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مشرکوں کے عام معبودوں اور الٰہہ کے متعلق قرآن میں یہ جتلایا گیا ہے کہ عموماً وہ نام ہی نام ہوتے ہیں' لیکن ان ناموں اور اسماء کو مسمی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' بایں معنی کہ درحقیقت ان ناموں سے جن چیزوں کی تعبیر کرتے ہیں وہ

معدوم اور کچھ نہیں ہوتیں۔

زیادہ مشرکوں کے معبودوں کی عام نوعیت یہی ہوتی ہے کہ وہ صرف مفروضہ اسما اور نام ہی نام ہوتے ہیں اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ جن کمالات و تصرفات کو ان معبودوں کی طرف اپنے خیال میں مشرکین منسوب کرتے ہیں' ان سے قطعاً ان کو کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا' گویا پتھر کا نام جیسے پانی رکھ لیا جائے اور نام رکھ کر توقع دلائی جائے کہ پانی کا کام اس پتھر سے لیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی فرضی نام اسم بے مسمی ہی کی ایک شکل ہے اور مشرکوں کے معبودوں پر قرآنی تنقید کے یہ الفاظ

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ۔

''نہیں ہیں وہ لیکن صرف چند نام جو رکھ لئے ہیں خود تم نے یا تمہارے باپ دادوں نے۔''

ہر حال میں صادق آتے ہیں۔

لیکن اس کے مقابلہ میں حق تعالیٰ کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے والوں نے پشت پناہوں اور اولیاء کا جو طبقہ ایکسپرٹس (خلاق) اور لیڈرز (قواد) وغیرہ ناموں سے بنا لیا ہے ظاہر ہے کہ اس کی نوعیت مشرکوں کے معبودوں سے اس باب میں مختلف ہوتی ہے' یعنی حذاق وقواد کا یہ گروہ اسی طرح خدا کے واقعی بندے اور مخلوقات ہوتے ہیں جیسے ان پر بھروسہ کرنے والے خدا کے بندوں اور مخلوقات میں شامل ہیں اور جن ضرورتوں اور حاجتوں میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہے ان سے ان کی بے تعلقی کا حال بھی وہ نہیں ہوتا جو مشرکوں کے مبعودوں کا ہے بلکہ قدرتی قوانین کا علم حاصل کر کے اسی علم کے مطابق عملی نتائج حاصل کرنے کا طریقہ ان فنی ماہرین کو سکھایا جاتا ہے اور خواہ ہر حال میں ان سے متوقعہ ضرورتیں پوری ہوں یا نہ ہوں' لیکن ان ضرورتوں سے مشرکوں کے خود تراشیدہ معبودوں کی طرح ان کو قطعاً بے تعلق بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بہرحال جہاں تک میرا خیال ہے مذکورہ بالا آیت میں بجائے ''الهة من دونی'' کے ''ان یتخذوا عبادی من دونی اولیاء (یعنی میرے بندوں کو میرے سوایا مجھے چھوڑ کر انہوں نے

اپنے اولیاء اور پشت پناہ بنا رکھا ہے) یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں ان میں بظاہر حق تعالیٰ کی آئینی ذمہ داری سے آزاد رہنے کی جیسا کہ میرا ناچیز خیال ہے' اسی دوسری تدبیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' جس میں بجائے خودتراشیدہ' نام نہاد وہامی الہہ اور معبودوں کے ایکسپرٹوں' لیڈروں کو بنانیوالے اپنا پشتبان اور اولیاء بنا لیتے ہیں اور یوں اپنے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہ سے بے تعلق قطعاً بے تعلق رہ کر زندگی بسر کرنے کی ایک راہ انہوں جو نکال لی ہے تو فرمایا گیا ہے کہ:

اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا۔

''بلاشبہ ہم نے تیار کر رکھا ہے ان ہی انکار کرنے والے کافروں کے لئے جہنم مہمان نوازی کے واسطے۔''

مطلب یہی ہے کہ زندگی کا موجودہ عبوری دور جو بہر حال گزر ہی جاتا ہے' سب ہی کی گزر جاتی ہے' ان سے پہلے مشرکانہ کاروبار والوں نے خدائی ذمہ داریوں سے بچنے کی جو صورت نکال لی تھی' برے بھلے وہ بھی اپنی زندگی کے دن پورے کر کے دنیا سے گئے اور تم نے جو یہ نئی راہ نکالی جسے سائنٹیفک راہ زندگی گزارنے کی تم سمجھتے ہو' یہ بھی گزرے گی' لیکن تم ہو یا وہ ہوں بہر حال قدرت کے مقرر کردہ نتیجے اور انجام سے بچ کر نکل نہیں سکتے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ پیدا کرنے والے نے جس مقصد اور جس نصب العین کی تکمیل کے لئے تمہیں پیدا کیا تھا تم اس مقصد اور نصب العین کو لا حاصل قرار دے کر اپنے کرتوت کے خمیازہ کو نہ بھگتو' بلکہ نتیجہ کا دن جب آئے گا تو قدرت کی طرف سے ان کے آگے کا وہ دردناک قالب پیش ہوگا جس کا اصطلاحی نام جہنم ہے۔

بہر حال مشرکانہ کاروبار کی تنقید جن خاص الفاظ میں عموماً قرآن بیان کرنے کا عادی نظر آتا ہے' بجائے ان کے یہاں الفاظ میں ردوبدل جہاں تک میرا خیال ہے' بلاوجہ نہیں کیا گیا ہے۔ دوسروں سے بھی یہی عرض کروں گا کہ قرآن کے طریقہ بیان کی خصوصیتوں کی قدروقیمت پر اگر غور کریں گے تو تجربہ ان کو خود بتائے گا کہ ان تبدیلیوں میں کوئی خاص اور اہم نقطہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ کچھ طول بیانی سے کام تو ضرور لینا پڑا' لیکن کیا کیا جائے پہلے سے سوچی سمجھی باتیں ہوتیں تو مختصراً اشارے بھی کافی ہوسکتے تھے' لیکن اچانک نئے پہلوؤں کی طرف توجہ دلانی پڑتی ہے۔

دنیوی حیات ہی کے لئے ساری دوڑ دھوپ اور اس پر فخر:

آگے تیسری آیت جو ان تمام آیتوں میں سب سے زیادہ توجہ طلب ہونے کے ساتھ ہی مطلب کے لحاظ سے یا کم از کم میرے نقطہ نظر کے حساب سے بہت زیادہ واضح ہے وہ یہ ہے ارشاد ہوا ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِيْنَ أَعْمَالًا ٥ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا٥

''کہہ دو کیا ہم آگاہ کریں ان لوگوں سے جو اپنے کاروبار کے حساب سے بدترین خسارے کے شکار ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سعی اور کوشش کھوگئی اسی حیات دنیا (پست زندگی) میں اور وہ خیال پکار رہے ہیں کہ کارستانی کے لحاظ سے وہ بہت اچھا کر رہے ہیں۔''

ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔

''کھوگئی کوشش ان کی اسی حیات دنیا (پست زندگی) میں''

سب سے زیادہ فکر و تامل کی دعوت اس آیت کا یہی جزء دے رہا ہے۔ دیکھ لیا جائے کہ "الاخرۃ" کی ابدی زندگی سے اپنی توانائیوں کے سارے ذخیرے کو موڑ کر قطعی طور پر موڑ کر اسی "الحیوۃ الدنیا" پست زندگی میں کون گم کر رہے ہیں اور گم کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ سب کچھ کر کے اور سب کو چھوڑ چھوڑ کے اس دنیا سے ان میں کا ہر ایک بایں طور روانہ ہو رہا ہے کہ پانے والے جو کچھ بھی پاتے ہیں کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں لے جاتے ہیں اور نہ لے جا سکتے ہیں۔ اور یوں اپنی ساری توانائیوں اور ان کے نتائج کو دن کی کھلی روشنی میں ہر ایک کے سامنے مسلسل ہر ایک کھوتا چلا جا رہا ہے۔ مگر بایں ہمہ اپنی کوششوں کی ان ہی ناکامیوں کے ساتھ مطمئن بھی ہیں اور اسی کو صحیح اور کامیاب زندگی قرار دینے پر ان کی خودستائیوں کا سلسلہ اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ بنی آدم کے اکثر و بیشتر افراد پر اپنی اسی عجیب و غریب ناکام و نامراد زندگی کی پرچھائیوں کو ڈال ڈال کر عمومیت کو تقریباً اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ الآخرۃ کا خیال اور اس خیال

کا دباؤ دماغوں سے نکل چکا ہے یا نکل جانے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ وہ خیال پکار رہے ہیں کہ کارستانی کے لحاظ سے ہم بہت اچھا کر رہے ہیں ''یعنی'' وَهُمْ يَحْسَبُونَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا'' کے الفاظ کا جو ترجمہ ہے' آج کون ہے جس کے کان کو اس خدا بےزار (Godless) تمدن کی خودستائیوں سے بہرا نہیں بنا دیا گیا ہے۔

سچ پوچھئے تو ''یاجوجیت وماجوجیت'' کی حقیقی روح ان ہی الفاظ میں پوشیدہ ہے اور یہ ان کی رونمائی کا ایسا آئینہ ہے جسے دیکھ کر ہر دیکھنے والی آنکھ ان کو پہچان سکتی ہے۔

لیکن لوگوں نے چوڑے چوڑے کانوں' چھوٹے چھوٹے بالشی قدوں کی راہ نمائی میں ان کو پہچاننا چاہا۔ جاننے والوں نے ''تمسح'' (زبردستی کی مسیحیت) اور ''تمہد'' (زبردستی کی مہدویت) کے بے وقت اور بے ہنگام غل غباڑوں کو دیکھا جو درحقیقت اسی خدا بےزار تمدن اور انسانیت آزار تہذیب کی آندھیوں سے برپا ہوئے تھے' بلکہ تمسح وتمہد کا دعویٰ پیداوار ہی اسی تمدن وتہذیب کی دسیسہ کاریوں کا تھا اور اسی کا وہ ''خود کاشتہ ❶ پودا'' تھا۔ دعوے کے مدعی کا یہ خود اعترافی اقرار ہے' کہیں حق کے کلمہ سے باطل کی تعمیر میں کام نہ لیا جائے' حق کے جاننے والوں نے بھی حق پوشی ہی کو احتیاط کا تقاضا قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کم از کم سب سے پہلے دنیا کی جس امت کو ''حق'' کی گواہی ادا کرتے ہوئے قرآنی بینات کی روشنی میں 'حق'' کا اعلان کرنا چاہئے تھا' صرف یہی نہیں کہ اس سے خاموشی سے کام لیا بلکہ اس کو سمجھنا بھی نہ چاہا جو کچھ قرآن سمجھا رہا تھا۔ لوگ قرآن بھی پڑھتے رہے اور خودستائیوں کی اسی قوالی میں شریک ہو کر تالیاں پیٹ پیٹ کر حال وقال بھی رہے۔ دن کو رات ٹھہرایا گیا تو ماہ و پروین کی شہادت دینے والے قرآن کے پڑھنے والوں اور ماننے والوں میں سے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجی ست

انکار آیات اللہ ولقاء اللہ:

جو کچھ کمایا جا رہا ہے سب کھویا چلا جا رہا ہے۔ ہر شخص کے سامنے واقعہ اپنی اس کھلی ہوئی

❶ ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کے نام مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی کا جو مطبوعہ مکتوب ہے' اس میں ملکہ وکٹوریہ کے سامنے مرزا صاحب نے ان ہی کے خود کاشتہ پودے کے عنوان سے اپنے آپ کو روشناس کرایا ہے۔

واضح خصوصیت کے ساتھ موجود ہے' مگر اسی ناکام و نامراد بے نتیجہ قطعی لا حاصل عبث اور سدوی زندگی کے ساتھ تقریباً انسانیت مطمئن ہو چکی ہے۔ اس عجیب و غریب ذہنیت کا استیلا اپنے دائرے کو روز بروز بڑھاتا ہی چلا جا رہا ہے۔ آدمی جانور نہیں ہے جو نتیجے سے بے تعلق ہو کر زندگی بسر کرے۔ پھر عقل و تمیز کیساتھ اسی ذہنیت کا دباؤ کیوں بڑھ رہا ہے؟ اسی سوال کے جواب کو جہاں تک میرا خیال ہے،ہم آگے کی اس آیت میں پا سکتے ہیں' فرمایا گیا ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ۔

''یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے پانے والے کی نشانیوں کے بھی منکر ہو گئے ہیں' اور اس کا بھی انکار کر دیا ہے کہ اپنے اسی رب سے ان کی ملاقات ہوگی۔''

جس مسئلہ کی طرف مذکورہ بالا الفاظ میں توجہ دلائی گئی ہے اس کے سمجھنے کے لئے ایک مثال کو پیش نظر رکھئے۔

کشتی گیری اور پہلوانی کے کمالات کا دعویٰ کر کے ایک شخص آپ کے سامنے اس طرح اپنے آپ کو پیش کرتا ہے کہ کشتی گیری اور پہلوانی کے سارے ساز و سامان سے بھی وہ لیس ہے گرد ملے' چپٹ چڑھائے' دنگل میں اتر کر اپنے جوڑ کے پہلوان کو بچھاڑ بچھاڑ کر بھی دکھا رہا ہے۔ دوسری طرف پہلوانی ہی کے مدعی بن کر ایک اور صاحب آتے ہیں' لکھنو کے بانکوں کے لباس میں جلوہ گر ہیں' پہلوانی کی کوئی علامت اور نشانی اپنے ساتھ نہیں رکھتے ہیں' لیکن مدعی ہیں ان ہی کمالات کے جو پہلوانی کے ساتھ مختص ہیں۔ بتائیے کہ پہلوانی کے لحاظ سے کس کا وجود آپ کے لئے دیکھا بھالا قرار دیئے جانے کا زیادہ مستحق ہے؟

اب اسی مثال کی روشنی میں دیکھئے۔ کائنات جن میں حجر' شجر' نباتات' جمادات' حیوانات' انسان' چاند' سورج' تارے' الغرض گونا گوں مخلوقات میں اپنی تخلیقی کارفرمائیوں کو نمایاں کر کے خالق عالم نے اپنے آپ کو ہمارے سامنے جو ظاہر کیا ہے' ظہور حق کی اس شکل کے مقابلہ میں دلوں کا یہ تقاضا کہ موجودہ کائنات و کائناتی کمالات کے بغیر خدا ہمارے سامنے آتا' ظہور کی ان دونوں شکلوں میں کیا وہی نسبت نہیں ہے جو ان دونوں پہلوانوں میں تھی جن میں سے ایک پہلوانی کے سارے آثار اور نشانیوں کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہے اور دوسرا پہلوانی کے

کمالات کا مدعی بن کر بجائے اپنے کمالی صفات کے صرف اپنی ذات کو پیش کر کے مطالبہ کر رہا ہے کہ اسے پہلوان مان لیا جائے۔

پھر کیسی عجیب بات ہے کہ اپنی کارفرمائیوں کے کمالات کے ساتھ حق سبحانہ وتعالیٰ ہمارے سامنے موجود ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہی کمالات جن کا قرآنی نام آیات اللہ یا اللہ کے پتے اور نشانیاں ہیں' ان آیات اور نشانیوں کے ساتھ ہم ان کو پائیں اور مانیں' لیکن کچھ لوگ یہ حیلہ تراش کر کے کہ کمالات سے معرا اور خالی ہو کر چوں کہ خدا ہمارے سامنے نہیں آیا' اس لئے ہم اس کو نہیں مان سکتے۔ بتلایئے کہ بجز ایک شیطانی حیلہ کے یہ اور بھی کچھ ہے؟ پہلوانی کے کمالات کے ساتھ پہلوان جب آپ کے سامنے آیا تو اس کے پہلوان ہونے سے آپ نے اس لئے انکار کر دیا کہ ہم تو اسی کو پہلوان مانیں گے جو پہلوانی کے سارے آثار و علامتوں سے معرا اور پاک ہو کر ہمارے سامنے آ جائے۔ خدا بے زاری کی عام ذہنیت میں آپ ٹٹولیں گے تو اسی غیر منطقی طفلانہ مطالبہ کے جراثیم کے سوا یقین مانئے۔

آپ کو اور کچھ نظر نہ آئے گا اسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ

''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور نشانیوں کا انکار کر دیا''

یعنی کمالات رب کی ان کھلی ہوئی نشانیوں سے انہوں نے طے کر لیا ہے کہ ہم خود بھی خدا کو نہ پائیں گے اور نہ مانیں گے اور نہ دوسروں کو پانے اور ماننے دیں گے اور اسی بنیاد پر انہوں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ زندگی میں خالق کائنات کی ملاقات کا خیال بھی صرف خیال ہی ہے۔ یہی خود بھی باور کئے بیٹھے ہیں اور دوسروں میں بھی چاہتے ہیں کہ اپنے اسی بے بنیاد فیصلہ کو منتقل کر دیں۔ اسی رجحان کے پھیلانے اور عام کرنے میں وہ سرگرم ہیں۔

الغرض خدائی آئین کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے زبردستی کا یہ غیر منطقی فلسفہ انہوں نے تراش لیا اور اپنی زندگی اور زندگی کے سارے کاروبار پر سے خدا اور خدا کے عقیدے کا دباؤ خود بھی اٹھا دیا ہے اور چاہتے ہیں کہ دوسروں سے بھی یہ دباؤ جس حد تک اٹھایا جا سکتا ہو اٹھا دیا جائے' حتیٰ کہ ان کاموں میں بھی جن کو جانتے ہیں کہ خدا ان سے خوش ہوتا ہے' ان کو بھی وہ یہ سوچ کر کرتے ہیں کہ ہم خدا کے لئے انہیں نہیں کرتے۔ بہر حال ان کا جو قدم بھی اٹھتا ہے خدا

کے لئے نہیں اٹھتا اور نہ خدا کے لئے وہ کوئی قدم اٹھانا چاہتے ہیں۔ ❶

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں خدا کے پاس ان کی اور ان کے اعمال کی اگر کوئی قیمت نہ ہو تو اس کے سوا منطقی نتیجہ اس قسم کی خدا بے زار زندگی و افعال کا اور ہو ہی کیا سکتا ہے آپ نے کروڑ ہا کروڑ صرف کر دیئے ہوں' ساری دولت لٹا دی ہو' یا ایک کوڑی ہی دی ہو' ہر حال میں دیکھا جائے گا کہ یہ یا وہ جو کچھ بھی آپ نے کیا ہے کس لئے کیا ہے؟ کوڑی بھی خدا کے لئے اگر دی ہے تو چاہئے کہ خدا سے اس کوڑی کے معاوضہ کی توقع کریں' لیکن کروڑوں روپے اگر خدا کے لئے آپ نے نہیں دیئے'' تو خدا کے پاس خود سوچئے کہ معاوضہ کی امید کا حق آخر کس بنیاد پر آپ کو حاصل ہوتا ہے یا حاصل ہو سکتا ہے' پھر قدرتی نتیجہ اس کا جب

فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ۔

''پس برد باد ہو کر رہ گئے ان کے سارے اعمال اور کاروبار''

کی صورت میں آپ کے سامنے آئے تو عقل بھی اس کے سوا خود ہی بتائیے کہ اور سوچ ہی کیا سکتی ہے؟ اور اسی کی اطلاع قرآن نے اپنے ان الفاظ سے دی ہے۔ پس واقعہ وہی ہے کہ بذات خود عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے' بلکہ قیمت کے لئے ہمیشہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کس لئے وہ عمل کیا گیا۔ مشہور ہی ہے کہ تربیت و تادیب کے لئے یتیم کو تھپڑ ہی کیوں نہ مارا جائے تو یہ ثواب کا کام ہے اور مارنے والا یتیم کے خیر خواہوں میں کیا جائے گا' لیکن اس یتیم کو آوارہ بنانے کے لئے کوئی کھلاتا پلاتا اور پہناتا ہی کیوں نہ ہو وہ سمجھا جائے گا کہ بدترین جرم کا مرتکب ہے۔

فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ۔

❶ ان سے مسحور و متاثر ہونے والوں تک کی ذہنیت جب یہ ہو چکی تھی' پہلے ایک دوسرے موقع پر ذکر آ چکا ہے کہ ''ہم اس دن خوش ہوں گے جب ہماری قوم نہ خدا کے واسطے نہ اپنے ثواب کے لئے بلکہ صرف اپنی قوم کے لئے کوشش کرے گی اور کہے گی کہ اپنے ہاتھ' پاؤں' اپنی جان' اپنی محنت سے' اپنے روپے کے بدلے نہ خدا کو خریدنا چاہتا ہوں' نہ بہشت کو (تہذیب الاخلاق ج ۲ ص: ۵۲۱)

عرض کر چکا ہوں کہ خانوادہ نبوت کے چشم و چراغ ایک ہندی مسلمان سرسید مرحوم کے یہ الفاظ ہیں اگرچہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بھی انہوں نے جو کچھ لکھا تھا خدا ہی کے لئے نہ لکھا تھا' اب اپنے خدا کے پاس وہ جا چکے ہیں' ''لکل امر مانوی'' کا نتیجہ ان کے سامنے آ چکا ہو گا' غفر اللہ لہ۔

کے بعد جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ:

فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔

''پس نہ ٹھہرائیں گے ہم قیامت کے دن ان لوگوں کا کوئی وزن''

ایک مطلب تو اس کا وہی ہے کہ خدا کے سامنے حاضر ہو جانے کے بعد ایسی ساری زندگیاں بے قیمت اور بے وزن ہو کر رہ جائیں گی جن میں خدائی نصب العین شریک نہ تھا اور جی چاہے تو آپ موجودہ تحقیق کے رو سے ''وزن'' کی حقیقت کا پتہ چلائیں' دنیا میں بھاری یا ہلکی چیزیں کیوں ہو جاتی ہیں؟ اور پھر سوچئے کہ مرکزی وجود کے احاطہ سے باہر نکل کر وزنی سے وزنی چیزوں کا وزن کیا باقی رہتا ہے یا رہ سکتا ہے [1]

اب آگے بڑھیے۔ آیت کے پیش ہونے سے پہلے اتنی بات سن لیجئے۔

واقعہ یہ ہے صحیفہ قدرت کے نوشتہ کمالات جن کا مشاہدہ ہم میں ہر ایک کر رہا ہے۔ ان کمالات کو کمالات والی ذات کے آیات یا عنوان اور پتوں کی حیثیت سے استعمال کرنے کا نقطہ نظر جس کے سامنے سے ہٹ جائے یا قصداً ہٹا دیا جائے' ظاہر ہے کہ اس کے دل میں نہ اس ذات قدسی سمات کی جستجو اور تلاش کا جذبہ ہی زندہ رہ سکتا ہے اور نہ اس کے منشا اور مرضی سے آگاہی کی تڑپ ہی اس میں باقی رہ سکتی ہے کہ ان ساری بے چینیوں کے تہہ میں سچ پوچھئے تو کار فرما:

ع   بہر نقشے کہ پیش آید درد نقاش می بینم

کا وہی آیاتی نقطہ نظر ہے جس میں کمالات سے بھری ہوئی کائنات سے کمالات والی ذات کو پانے والے پا رہے ہیں' اور پا کر چلا رہے ہیں۔

---

[1] بولنے میں عموماً لوگ بولتے ہیں کہ نیکی کا پلہ جس کا بھاری ہوگا وہ نجات یاب ہوگا اور بدی کا پلہ جس کا جھک جائے گا وہ پکڑا جائے گا' لیکن قرآن میں التزاماً اس راز کا انکشاف کیا گیا ہے کہ وزن صرف ان اعمال و افعال ہی میں پیدا ہوگا جو خالق عالم کی مرضی کے مطابق ہوں اور مرضی حق کے مخالف اعمال بے وزن ہو جائیں گے۔ ''فمن ثقلت موازینہ'' کے مقابلہ میں ''فمن خفت موازینہ'' کے الفاظ آپ کو قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر ملیں گے۔

ع نہ بیند چشم بدبیناں مگر من فاش می بینم

بہر حال اسی لاہوتی وجدان کے قدوسی احساس اور سبوحی یافت سے جو محروم ہیں یا محروم کر دیئے گئے ہیں ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے جو یہ فرمایا گیا ہے۔

﴿ذَالِكَ جَزَآئُوْهُمْ جَهَنَّمْ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْا اٰيٰتِىْ وَ رُسُلِىْ هُزُوًا۔﴾

''وہ ہے ان کا بدلہ جہنم' بدلہ ہے اس بات کا کہ وہ کفر کے مرتکب ہوئے اور بنالیا میری آیتوں اور میرے رسولوں (یعنی ان آیتوں کے پہنچانے والوں) کو! ہنسی مذاق''

غور کرنا چاہئے کہ اس کے سوا ان کا انجام اور کیا ہوتا یا کیا ہوسکتا تھا؟ بادشاہی کے سارے سازوسامان' تاج وتخت' تیغ ونگیں' اورنگ ودی ہم' حذم وحشم کے ساتھ بادشاہ ہمارے سامنے جلوہ افروز ہے لیکن یہ حیلہ تراش کر کے شاہی سازوسامان سے خالی ہوکر بادشاہ کی ذات چوں کہ ہمارے سامنے نہیں آئی' اس لئے بادشاہ کے احکام وفرامین اور ان احکام وفرامین کے لانے والوں کا ہم انکار کرتے ہیں' میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس حیلہ کی آڑ لے کر بغاوت کی راہ اختیار کرنے والے اگر شاہی داروگیر کی مصیبتوں میں اپنے آپ کو مبتلا پائیں تو اس کے سوا آخران کو کس بات کی توقع کرنی چاہئے؟

میں تو یہ سوچ کر حیران ہوجاتا ہوں کہ ایسا خوشنویس جب ہمارے سامنے آیا جو از سرتاپا ان اوراق اور وصیلوں میں لپٹا ہوا تھا جو اس کی خطاطی کے کمالات سے معمور اور پٹے ہوئے تھے تو اس وقت اس سے زیادہ! احمقانہ کہیے یا پاجیانہ مغالطہ اور کیا ہوسکتا ہے' اگر کہا جائے کہ ہمارے سامنے خوشنویس نہیں' بلکہ خوش نویس کی تو صرف خوش نویسی آئی۔

بہر حال اپنے اس کرتوت کا قدرتی خمیازہ تو خود ان مغالطہ بازوں کے سامنے آئے گا' آکر رہے گا اسی لئے ان کے اسی جہنمی انجام کو ان ہی کے حوالہ کر کے ہم جب اسی فقرے کے آخری جز یعنی

﴿وَاتَّخَذُوْا اٰيٰتِىْ وَ رُسُلِىْ هُزُوًا۔﴾

''اور بنالیا میری آیتوں اور میرے رسولوں کو ہنسی مذاق''

پر غور کرتے ہیں تو پھر ایک جدید علامت اور نئی نشانی ہمارے سامنے آجاتی ہے جس سے

اس خاص گروہ کی شناخت میں ہمیں کافی مدد ملتی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ آیات کے لفظ کا ایک مطلب تو آپ کے سامنے گزر چکا یعنی صحیفہ قدرت اور اوراق عالم پر اپنی کارفرمائیوں کے کمالات کو ظاہر کر کے حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ذات قدسی سمات کا عنوان اور پتہ کائنات اور کائناتی آثار کو جو بنا دیا ہے' آیات کے لفظ کا ایک قرآنی اطلاق تو یہ ہے' اسی کے ساتھ آیات ہی کے اسی لفظ کا اطلاق حق تعالیٰ ہی کے ان کلامی مظاہر پر بھی ہوتا ہے جن کے لباس میں اپنی مرضی اور اپنے منشاء کو خداوند قدوس جل مجدہ نے ظاہر فرمایا ہے۔ ہیں تو دونوں اصطلاحیں اور محاورے قرآن ہی کے' لیکن اصل واقعہ وہی ہے کہ قدرتی صحیفہ' اور قرآنی صحیفہ دونوں ہی کے آیات' آیات ہی ہیں۔

عرض کر چکا ہوں کہ صحیفہ قدرت کے آیات کو آیات کی حیثیت سے استعمال کرنے کا نقطہ نظر جن کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے' ان کے دل میں لقاء رب کی آرزو بھی بجھ کر رہ جاتی ہے اور اسی کا لازمی نتیجہ ہے کہ اپنے والے رب قیوم کی مرضی ومنشاء کی تلاش وجستجو کا جذبہ بھی ان سے چھین لیا جاتا ہے' جس کے بعد ان کی نگاہوں میں نہ ان بزرگوں ہی کی کوئی قدر و قیمت باقی رہتی ہے' جن کا انتخاب اپنے مرضیات سے آگاہ کرنے کے لئے قدرت کرتی رہی ہے۔ ''الرسل و الانبیاء'' کے عنوان اور ناموں سے ہم جنہیں پہچانتے ہیں (صلوات اللہ علیھم والسلام) اسی کے ساتھ اس پیغام اور کلام کی بھی اہمیت ان کے دلوں سے نکل جاتی ہے اور نکال دی جاتی ہے جس کا مخاطب اپنے بندوں کو حضرات انبیاء ورسل (علیہم السلام) کے توسط سے ان کا پیدا کرنے والا خالق بناتا ہے' ذہنی انحطاط اور فکری پستی کی یہی ملعون نفسیاتی کیفیت تیرہ درونی اور شوربختی کی اس گستاخانہ منزل تک پہنچا دیتی ہے جس میں حکمت و نادانی اور شرافت و کبریائی کا سب سے بڑا ابلیسی سرمایہ اللہ کی آیتوں کا استہزا اور ان آیتوں کے پہنچانے والے رسولوں کا صرف ٹھٹھا اور تمسخر رہ جاتا ہے۔

کائنات کو اس پیدا کرنے والے خالق قیوم کی آیات اور نشانیوں کی حیثیت سے استعمال کرنے کے نقطہ نظر سے محرومی کا یہی آخری انجام اور انتہائی بلکہ شاید لازمی نتیجہ' ایسا لازمی نتیجہ کہ مرنے سے اسی زندگی میں پھوٹ پھوٹ کر اس کی گندگی اور عفونت ان سے بہ نکلتی ہے' ہر گلی کوچے

میں اسی کی بدبو سے وہ پہچانے جاتے ہیں بلکہ اسی کی بھبھک اور بھپھارے سے اپنی شناخت وہ خود ہی کراتے پھرتے ہیں۔ یہی استہزا ان کی منطق اور یہی تمسخر ان کا فلسفہ بن جاتا ہے' ان کی تقریروں' تحریروں' رسالوں اور اخباروں' قصوں اور کہانیوں حتیٰ کہ تھیٹروں اور سینماؤں تک کا لازمی جزو یعنی استہزاء کا یہی سنڈاس بنا ہوا ہے اور یہ ان کی آخری علامت اور امتیازی خصوصیت ہے جس پر ان کے متعلقہ قرآنی اشارے ختم ہو جاتے ہیں۔

چاہئے کہ قرآن کے بتائے ہوئے ان ہی نشانات اور علامتوں سے ہم ان لوگوں کو پہچانیں جن کو ''یاجوج و ماجوج یا قریب قریب کچھ اسی قسم کے ملتے جلتے ناموں سے موسوم کر کے مذاہب و ادیان میں چوکنا اور ہوشیار رہنے کا مطالبہ کیا گیا ہے' اور ذات سے زیادہ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں' ان لوگوں کے خاص امتیازی صفات ہی کو زیادہ اہمیت دینی چاہئے' جنہیں دین کے بڑے فتنوں میں غیر معمولی بڑا فتنہ رسالات و نبوات کے وثائق میں قرار دیا گیا ہے۔ کم از کم قرآن کو خدا کی کتاب ماننے والی امت کے لئے تو حجت تمام ہو چکی ہے۔ قرآن کی مذکورہ بالا بینات و تصریحات میں جو کچھ پایا جا رہا ہے اس کو پالینے کے بعد کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انسانی توانائیوں کی قدر و قیمت ان فکری آندھیوں اور ذہنی جھگڑوں کے گرد و غبار میں مجھ سے او جھل ہو کر رہ گئی' جنہیں ''یاجوجیت و ماجوجیت'' کے فتنے نے اٹھایا تھا یقیناً اس عذر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

اہل ایمان کے لئے بشارت:

بظاہر اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن اور قرآن کے لانے والے رسول علیہ السلام پر ایمان لانے والوں اور اسی ایمان کے مطابق اپنی عملی زندگی کے سنوارنے والوں کو یہ بشارت آخر میں سنائی گئی ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتْ لَھُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا﴾

''قطعاً جن لوگوں نے مان لیا اور صالحات و سلجھے ہوئے کام کئے ہوں گے ان کے لئے

فردوس کے باغات مہمان نوازی کے لئے' ہمیشہ رہیں گے ان ہی باغوں میں۔''

اگر چہ یہ بشارت ایمان وعمل صالح والوں کے لئے قرآن کی عام بشارت ہے' قدم قدم پر اس کو دہرایا گیا ہے' یعنی چند روزہ خاکی زندگی کو کائنات کی مرکزی قوت اور محوری وجود کے مطابق رکھنے کی کوشش ہر کوشش کرنے والے کو اس ماحول تک پہنچا دیتی ہے جس میں اپنی ہر خواہش اور دل کے ہر تقاضے' ہر احساس کے ہم آہنگ عالم کی اسی مرکزی قوت اور محوری وجود کو پایا جائے گا۔ وفاقی نتیجہ میں پیدا ہونے والی اسی زندگی کا نام فردوسی زندگی ہے' لیکن اس عام بشارت میں خاص اس موقع پر ایک خاص اضافے کو بھی ہم پاتے ہیں۔ یہ

﴿لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا٥﴾

''نہ چاہیں گے ان باغوں سے منتقل ہونا''

کا اضافہ ہے۔ میں اسی اضافہ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

جیسا کہ معلوم ہے وفاقی نتیجہ سے پیدا ہونے والی فردوسی زندگی کے متعلق اس قسم کے خیالات کہ اس زندگی کے پانے والے انسان' انسان باقی نہ رہیں گے بلکہ فرشتہ یا اس سے بھی بڑھ کر (العیاذ باللہ) بجائے مخلوق کی ذات میں محو اور گم ہو کر ان میں ہر ایک خالق ہی بن جائے گا۔ اسی طرح مجازاۃ کی سزائی شکل میں باور کرایا جا رہا ہے کہ آدمی بجائے آدمی رہنے کے گھوڑا' ہاتھی' بیل' چوہا وغیرہ بن جاتا ہے۔ قرآن نے ان مالیخولیائی افکار اور خود تراشیدہ اوہام کے لئے اپنے اندر کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ صاف صاف کھلے کھلے لفظوں میں ہر جگہ اسی حقیقت کا مسلسل اعلان اور اعادہ اس کتاب میں کیا گیا ہے کہ جزائی اور سزائی' مکافات و مجازات کی دونوں حالتوں میں انسان بہر حال انسان اور اپنے سارے انسانی جذبات اور خصوصیات کے ساتھ نتیجہ کی آنے والی زندگی میں بھی باقی رہے گا۔ ❶ ایسی صورت میں انسانی فطرت کی اسی خصوصیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ لذیذ شئے کا مسلسل بار بار استعمال آدمی میں ملال یعنی اکتا جانے کی کیفیت کو پیدا کر دیتا ہے۔ بلند سے بلند ترین پیمانے پر راحت و آرام

❶ اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے خاکسار کی کتاب ''الدین القیم'' کا مطالعہ کیا جائے جسے کئی سال ہوئے کتب خانہ ''الفرقان'' نے شائع کیا تھا۔ اب پاکستان میں بھی شائع ہو چکی ہے اور مل جاتی ہے۔ (غ'م)

عیش وسکون ہی کا نظم کیوں کر دیا جائے' لیکن ایک ہی حال کے دوام واستمرار سے راحت و آرام کی ایسی زندگی بھی آدمی کے لئے اجیرن ہی بن جاتی ہے۔ عموماً بورڈنگوں اور اقامت خانوں کا کھانا طلبہ پر اسی لئے ناگوار اور دوبھر بن کر رہ جاتا ہے کہ چند گنے چنے خاص کھانے کے تسلسل سے دل اکتا جاتے ہیں۔ آدمی کی فطرت کا یہی جبلی قانون اور تقاضا ہے۔ وسوسہ یہی ہوتا ہے کہ خلود و دوام کے ساتھ آدمی کی فردوسی زندگی کی لذت وسرور کا تسلسل کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ بظاہر یہاں نئی آگاہی

﴿لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا۝﴾

''نہیں چاہیں گے ان باغوں سے منتقل ہونا''

کے الفاظ سے جو بخشی گئی ہے ان سے اسی وسوسہ کا ازالہ شاید مقصود ہے اور اس کی آیت یعنی:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۝ (الکھف)

''کہہ دو! اگر ہو جائے سمندر روشنائی میرے رب کے کلمات کے (لکھنے) کے لئے تو تھ جائے گا سمندر کا پانی قبل اس کے کہ ختم ہوں میرے رب کے کلمات' اگرچہ لاتے ہی چلے جائیں اسی قسم کے سمندر (کے پانی) کو مدد کے لئے''

اس آیت کا دہلہ اولیٰ یا سرسری نظر میں اپنے ماسبق سے بظاہر تعلق محسوس نہیں ہوتا' لیکن اگر فکر معقول سے کام لیا جائے تو وہی وسوسہ یعنی فردوسی زندگی میں استمرار و دوام کی وجہ سے اکتا اور گھبرا جانے کا خطرہ فطرت انسانی کے عالم اقتضاء کے مطابق دلوں میں جو پیدا ہوتا ہے اسی خطرے سے محفوظ ہونے کی ضمانت ان آیتوں میں ہم پا سکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانی احساسات لذت وسرور کو جنت کی زندگی میں جن چیزوں سے حاصل کریں گے' ان کے متعلق یہ مفروضہ ہی صحیح نہیں ہے کہ ایک دفعہ جو کچھ دیا جائے گا وہی ہمیشہ ملتا رہے گا۔ سورہ بقرہ کی مشہور آیت:

﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَ اُتُوْا بِهٖ

مُتَشَابِهًا۔﴾

''جب کبھی کوئی پھل جنت والوں کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ تو وہی ہے جو دیا گیا تھا ہمیں پہلے (حالانکہ یہ واقعہ نہ ہوگا) بلکہ بخشی جائیں گی ان کو ملتی جلتی چیزیں۔''

اس میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب کبھی جس چیز کے متعلق یہ خیال پیدا ہوگا کہ وہی بجنسہ مکرر دی گئی ہے تو فوراً اس خیال کا ازالہ تجربہ سے ہو جائے گا کہ صرف صورت میں مشابہت تھی لیکن معنوی حیثیت سے کبھی جنت کی کوئی چیز دہرائی نہ جائے گی۔ جہاں کا یہ کلی قانون ہو جو کلما کے لفظ کا اقتضاء ہے وہاں تکرار و اعادہ کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے ایک دن سمجھاتے ہوئے فرمایا تھا:

لیس فی الدنیا مما فی لجنة شیء ا الا الاسماء (درمنثور)

''نہیں ہے دنیا میں بہشت کی چیزوں سے لیکن صرف نام''

گویا یوں سمجھنا چاہئے جنت میں جو سیب مثلاً ملے گا' تو وہ بھی سیب ہی ہے' لیکن ہر لحاظ سے جنت والا سیب دنیا والے سیب سے اتنا مختلف ہوگا کہ دونوں میں کہنا چاہئے صرف لفظ اور نام ہی کا اشتراک ہوگا پھر فردوسی زندگی والے سیب کی ہر جہتی نوعیت کیا ہوگی؟ اسی کی طرف

مالا عین رأت والاذن سمعت ولاخطر علی قلب بشر۔

''نہ دیکھا کسی آنکھ نے' نہ سنا کسی کان نے' اور نہ خیال گزرا اس کا کسی دل میں۔''

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ﴾ (حٰم سجدہ)

''پھر نہیں جانتا ہے کوئی جو آنکھوں کی خنکی ان کے لئے چھپا کر رکھی گئی ہے''

کی یہ حدیث تفسیری توضیح ہے۔ اور یہ سب درحقیقت قرآن ہی کی آیت

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ﴾ (یونس)

''جنہوں نے اچھے کام کئے ان کے لئے اچھا معاوضہ ہے اور ''زیادہ''

کے اجمال کی تفصیل ہے' اس آیت کریمہ میں ''زیادہ'' کے جس لفظ کو پار ہے ہیں' صحیح روایت و آثار میں اس کا جو مطلب بیان کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ فردوسی زندگی میں براہ راست

حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی ذات مبارک سے انسانی فطرت کا رشتہ قائم کر دیا جائے گا۔ ❶

وہی ذات مبارک جس کے اسماء وصفات' کمالات' وشیونات کی نہ حد ہے اور نہ انتہا' پھر ان لامحدود کمالات کی باہمی ترکیب کے مظاہر جن کے مدارج کا کیفاً و کمّاً' نہ اور ہے نہ چھوڑ' اپنے ان ہی بے تھاہ معلومات کو کلمہ "کن" سے حق تعالیٰ شہودی وجود کرتے ہیں۔ معلومات کی لامحدودیت سے کن کا یہی "کلمہ" لامحدود کلمات بنا ہوا ہے اور ان کی اسی لامحدودیت کی تعبیر جیسا کہ ارباب تحقیق نے لکھا ہے' مذکورہ بالا آیت میں اس طریقے سے کی گئی ہے کہ سمندر میں سمندر ہی کا اضافہ کیوں نہ کیا جائے' لیکن "رب" کے ان لامحدود کلمات کو لکھنے کے لئے وہ کافی نہیں ہو سکتے' وجہ ظاہر ہے کہ محدود لامحدود کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

"کلمۃ اللہ" کا مفہوم:

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مسیح علیہ السلام کو قرآن میں "کلمۃ اللہ" جو فرمایا گیا ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ کلمہ کن سے براہ راست ان کی تخلیق ہوئی۔ بہشتی حقائق بھی چونکہ براہ راست کلمہ کن سے پیدا ہوتے رہیں گے اسی لئے وہ بھی کلمات ہی کے نام سے موسوم ہوئے۔ بہر حال اب سوچئے اس بات کو کہ براہ راست جب اسی ذات بابرکات سے انسانی فطرت کا تعلق قائم ہو جائے گا' جس کے کلمات کی حد و انتہا نہیں ہے تو کسی خاص نقطہ تک پہنچ کر انجماد اور ٹھہراؤ کے خطرے کی گنجائش ہی کیا پیدا ہوتی ہے۔ ایک طرف ہماری فطرت کے طلب اور تشنگی کی وہ لامحدودیت ہوگی جو کسی نوبت پر پہنچ کر بس کرنے پر راضی نہیں۔ دنیا کی زندگی میں بھی "خوب سے خوب تر" کی جستجو یہی ہماری جبلت اور فطرت کا قدرتی تقاضا ہے' پیدا کرنے والے نے طلب وتلاش کی اسی لامحدودیت کے ساتھ ہمیں پیدا کیا ہے ❷

❶ صحیح مسلم اور ترمذی وغیرہ کی مشہور روایت ہے کہ سب کچھ پا لینے کے بعد اہل جنت کے لئے یکشف الحجاب (یعنی پردہ اٹھا دیا جائے گا) حجاب کے بغیر بندے اور خدا میں رشتہ قائم ہو جائے گا۔ لفظ زیادہ کی تفسیر کتابوں میں پڑھئے۔

❷ ان الانسان خلق ھلوعا (بیشک پیدا کیا گیا ہے آدمی ھلوع) اس قرآنی آیت میں "ھلوع" کے لفظ کا مطلب وہی ہے کہ (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

اوراس کے مقابلے میں لامحدود کمالات وصفات والی اپنی ذات ہی کو ہمارا فطری مطلوب بنا دیا ہے اوریہی میرا مطلب تھا کہ مذکورہ بالا آیت بظاہراپنے ماسبق کی آیت سے غیر مربوط ہی کیوں نہ نظر آتی ہو' لیکن قرآن کا تتبع بتاتا ہے کہ سب سے زیادہ ربط اسی مقام میں ہوتا ہے جہاں دہلہ اولی میں سرسری نظر والوں کو بے ربطی محسوس ہوتی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ فردوسی زندگی میں جب تجدد اورنو بہ نو' تازہ بہ تازہ ہی کے قانون کو استمرار بخشا جائے گا۔تو **لا یبغون عنہا حولا** (نہ چاہیں گے جنتی اس سے منتقل ہونا) کے سوااورسوچا ہی کیا جاسکتا ہے۔

سچ تو یہ ہے فردوسی زندگی سے جب''نـــــــزل ''یعنی مہمان نوازی ہوگی تو جنت مستقل باشندے(DOMICILE)بن جانے کے بعد آگے کیا کچھ پیش آئے گا؟

صـدق مـولانـا الـكـريـم رضـوان مـن الـلـه اكـبـر

مرحوم ڈاکٹر اقبال کے ایک شعر کا خیال آتا ہے نہیں کہہ سکتا کہ صحیح طور پر مجھے یاد بھی رہا ہے یا نہیں تاہم اسی نہ ختم ہونے والے تجدد دوام اور تلذذ غیر مختتم وتام کی بڑی اچھی تعبیر غالباً ان ہی کے الفاظ میں یہ محفوظ رہ گئی ہے۔

تپش است زندگانی' تپش است جاودانی دل من مسافر من کہ خداش یار بادا

اسی حقیقت کی طرف مرحوم نے اپنے مشہور مصرعہ''یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ میں''اشارہ کیا ہے اوراب سمجھا جاسکتا ہے کہ اپنی سعی اوراپنی ساری توانائیوں کو ہر طرف سے پھیر کر اسی حیات دنیا اور پست زندگی میں جوملیا میٹ کررہے ہیں' وہ خود اپنے اوپر اوراپنے ساتھ انسانیت پر بھی کتنا بڑا ظلم توڑ رہے ہیں' ہائے مولانا روم کی چیخ وپکار

منگر بہر گدائے کہ خاص ازان پاکی مفروش خویش ارزاں کہ تو بس گراں بہائی

(گزشتہ سے پیوستہ)

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

بخاری ومسلم میں ہے کہ جہنم میں سزا پانے کے بعد ایک شخص گرتا پڑتا جہنم سے باہر نکلے گا' کچھ دیر اسی حال میں پڑا شکر کرے گا' مگر پھر آگے بڑھتے ہوئے بالآخر جنت میں داخل ہوجائے گا۔ارباب تحقیق کے نزدیک فطرت انسانی کی بے صبری اور لامحدودیت کی یہ تفہیمی تمثیل ہے۔

تو ہنوز ناپدیدی کہ جمال خود ندیدی سحرے چو آفتابے زدرون خود درآئی

آج انسانیت کے امکانات کی دنیا مدفن اور مقبرہ بنتی چلی جارہی ہے' لیکن سمجھنے والے سمجھ رہے ہیں کہ ان امکانات کے ظہور کا زمانہ یہی ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ جو مر رہے ہیں مرتے چلے جارہے ہیں۔ سمجھا جارہا ہے' وہی جی رہے ہیں۔ اکبر مرحوم نے سچ فرمایا تھا۔

خوشی ہے سب کو آپریشن میں خوب نشتر یہ چل رہا ہے
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے مریض کا دم نکل رہا ہے

کُل نہیں چند فتنے:

سچ تو یہ ہے کہ ابھی کل تو نہیں' لیکن دجالی استدراجات کی کچھ قسطیں پچھلی چند صدیوں میں اچانک ہمارے سامنے ضرور بے نقاب ہوئی ہیں' لیکن ان سے بھی کیا ثابت ہوتا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ بتا رہا ہے کہ تشفی اور سکون کی کیفیت سے انسانی فطرت کی طلب و تلاش کا لامحدود جذبہ اب بھی اسی طرح محروم ہے جیسے پہلے تھا ''ہمان است کہ بود'' کے سوا نہ اب تک کچھ دیکھا گیا ہے اور نہ آئندہ دیکھا جائے گا۔ بادشاہوں کو بھی سہولتیں زمین کے اس کرے میں میسر نہ تھیں' آج ہر ادنیٰ گنوار' دیہاتی ان سے ضرور مستفید ہو رہا ہے' لیکن اجتماعی طور پر دیکھئے یا انفرادی حیثیت سے ہم میں سے ہر ایک اپنے دل کا جائزہ لے اور سوچے کہ ہمارے اندر جو ''خلا'' تھا اس میں کسی قسم کی کوئی کمی ہوئی ہے۔ یقین کیجئے کہ اپنی ساری صلاحیتوں کو باہر نکال کر بھی موجودہ دنیا ہماری فطری طلب کی وسعتوں میں اگر ڈال دی جائے تو یہ سب کچھ بھی اس میں اسی طرح گم ہو کر رہ جائے گا جیسے کسی صحرائے لق و دق میں رائی کا دانہ۔ آپ بجائے گوشت کے شیروں کے پیٹ کو نہ گھاس سے بھر ہی سکتے ہیں۔ اور نہ گھاس کی خوراک پر غریب شیر کو قانع بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں' ہائے! آج وہ انسان مٹی پھانک رہا ہے' یہی اس کو پھنکوائی جارہی ہے' جس کے متعلق کہنے والے نے کبھی کہا تھا کہ

پنجہ باپنجہ خدائے زدہ ہر چہ اونیست پشت ہائے زدہ

جو گرایا گیا ہے' اسی کو باور کرایا جارہا ہے کہ وہ چڑھ رہا ہے اور اسے چڑھایا جارہا ہے۔

ازالہ شبہ!

آخری آیت جس پر سورۂ کہف ختم ہو جاتی ہے وہ یہ ہے ارشاد ہوا ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ج فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا٥﴾ (الكهف)

''کہہ دو کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ میں بھی آدمی تم ہی جیسا ہوں' مجھ پر یہ وحی نازل کی گئی ہے کہ تم لوگوں کا الٰہ (معبود) ایک ہے' پھر جو امیدوار! ہوا اپنے رب کی ملاقات کا تو اسے چاہئے کہ کرے بھلے اور سلجھے ہوئے کام اور ساجھی نہ بنائے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو''

جو کچھ اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے' بظاہر اس آیت کا بھی اس سے چنداں تعلق نظر نہیں آتا' لیکن غور کیجئے اپنے پیدا کرنے والے کی آئینی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے بجائے مشرکانہ کاروبار کے اکسپرٹوں اور لیڈروں کی ولایت اور پشت پناہی کے نظریہ کا ذکر کر کے اس پر جو تنقید کی تھی' اس تنقید کو پیش نظر رکھتے ہوئے! قدرتاً کیا یہ سوال نہیں پیدا ہوتا یا نہیں ہو سکتا ہے کہ دون الله (اللہ کے سوا) کسی دوسرے کو اولیاء بنانا اور ان ہی کی پشت پناہی ڈھونڈھنی اگر جرم ہے تو اسی جرم کے مجرم وہ بھی تو ہیں جو رسولوں اور پیغمبروں کو خدا اور اس کے درمیان واسطہ اور ایلچی مانتے ہیں اور ان کی ولایت اور پشت پناہی سے امداد حاصل کرتے ہیں' خود قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ﴾ (المائدة: ۵۵)

''تمہارا ولی (پشت پناہ) اللہ اور اللہ کے رسول ہیں''

یقیناً یہ ایک شبہ ہے اور چاہئے تھا کہ جو واقعہ ہے اس کو واشگاف کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ بندوں اور ان کا خالق میں واسطہ کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جس کی واقعیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر ایک دیکھ رہا ہے کہ روشنی میں آفتاب کو' دودھ میں مثلاً گائے کو بھینس کو واسطہ بنایا گیا ہے' اس لئے بندوں اور خدا میں واسطہ نہیں ہے۔ مشرکانہ کاروبار والوں کے طریقہ

عمل کی جو خصوصیت ہے اس کی تفصیل گزر چکی' یعنی خدائی ذمہ داریوں سے بھاگنے کی راہ انہوں نے یہ نکالی کہ ضرورتوں اور حاجتوں کے لئے وہ ان ہی درمیانی وسائط کو آگے بڑھا دیتے ہیں اور خود ان ہی درمیانی واسطوں کو کچھ لے دے کر ان ہی کی اپنے خیال کے مطابق منت و سماجت کر کے فرض کر لیتے ہیں کہ ان کا کام نکل جائے گا۔ اور ان کے مقابلے میں ان ہی ذمہ داریوں سے گریز کی دوسری راہ یہ ہے کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں ماہر اور حاذق بنا کر اپنی ساری ضرورتوں میں خدا سے قطعاً بے تعلق رہتے ہوئے ان ہی ایکسپرٹوں اور لیڈروں کی ولایت پر بھروسہ کر لیا جائے۔ چونکہ یہ دونوں صورتیں اپنے پیدا کرنے والے سے باغیانہ انحراف اور اپنے وجود کے نصب العین کی تکمیل سے گریز ہے' اس لئے درمیانی وسائط کی ولایت کی ان شکلوں کو قرآن نے مسترد کر دیا ہے اور ولایت کا وہ طریقہ جس میں اپنے اور اس کی مرضی کے پانے کی ضمانت پوشیدہ ہے اور اپنی پیدائش کے قدرتی نصب العین تک جس ذریعہ سے آدمی پہنچ جاتا ہے' ولایت کا یہ طریقہ تو موجودہ ہبوطی زندگی کی ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہے جس سے الگ ہو کر کامیابی تک انسانی زندگی پہنچ ہی نہیں سکتی۔ زمین کی طرف رخصت کرتے ہوئے انسان اول یعنی ہمارے پدر اول کو اسی لئے یہ وصیت کی گئی تھی۔

﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (البقرة)

''پھر آتے رہیں میری طرف سے تمہارے پاس راہ بتانے والے۔ ان راہ بتانے والوں کے پیچھے پیچھے جو چلیں گے نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ کبھی کڑھیں گے۔''

بہر حال اسی حقیقت کا اظہار جہاں تک میرا خیال ہے سورۂ کہف کی اس آخری آیت میں بھی کیا گیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ صاف صاف کھلے لفظوں میں کہہ دیجئے کہ میں بھی تم ہی جیسا ایک آدمی ہوں' قدرت نے صرف اپنے اس منشاء کے اظہار اور ترجمانی کے لئے میرا انتخاب فرمایا ہے' جس کی جوہری روح اور مرکزی عنصر یہ ہے کہ خالق کائنات ہی کو ساری انسانیت کا ''الٰہ'' اور ہر چھوٹی بڑی دینی و دنیوی ضرورت کا مرجع و ماویٰ بنا لیا جائے اور وہی سب کا آخری ٹھکانہ بن جائے۔ یہ تو

﴿ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾

''اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تمہارا الہ (معبود) ایک ہے۔''

کا مطلب اور خلاصہ ہوا' لیکن آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ ﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا٥ ﴾ (الکھف)

''پھر جو امیدوار ہوا اپنے پالنے والے کی ملاقات کا تو اسے چاہئے کہ کرے بھلے (اور سلجھے ہوئے) کام اور ساجھی نہ بنائے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو۔''

جہاں تک میرا خیال ہے' خالق کائنات کو صحیح معنوں میں اپنا تنہا معبود اور واحد الہ بنانے کے عملی طریقہ کی طرف ان الفاظ سے جو توجہ دلائی گئی' اس کا حاصل بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ذات حق کے ساتھ براہ راست رشتہ پیدا کرنے کی جن دلوں میں امنگ اور آرزو ہو' ان کو اپنی دینی زندگی میں ترتیب کی پابندی پر اصرار کرنا چاہئے کہ ان کی زندگی عمل صالح کی زندگی بن جائے۔ اگرچہ عمل صالح عام لفظ ہے' لیکن آگے خالق کی عبادت اور خالق کے ساتھ بندوں کو جو تعلق رکھنا چاہئے' اس کا ذکر چونکہ کیا گیا ہے' اس لئے مقابلۃً یہی سمجھنا چاہئے مخلوقات کے ساتھ تعلقات کو سلجھاتے ہوئے خالق کی عبادت میں سرگرمی ہی صحیح نتیجے تک آدمی کو پہنچائے گی۔ گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ خالق کی عبادت (نماز روزہ) وغیرہ میں جو چوکس نظر آتے ہیں' لیکن اسی کے ساتھ مخلوقات کے تعلقات میں لاپرواہیوں سے کام لیتے ہیں یا اس کے برعکس مخلوقات یا حقوق العباد کو اہم قرار دیتے ہوئے خالق کے ساتھ صحیح تعلق قائم کرنے کے ذوق سے جو محروم ہیں یہ دونوں ہی طبقے انسانی سلوک کی صحیح فطری راہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔ ٹھیک راستے پر وہی چل رہے ہیں جن کی نگاہوں میں دونوں ہی کی اہمیت ہے۔

اسی کے ساتھ اگر اس نکتے پر بھی نظر رکھی جائے کہ عمل صالح کا ذکر عبادت رب سے پہلے کیا گیا ہے۔ تو بظاہر اس سے یہ اشارہ بھی مل سکتا ہے کہ بین المخلوقاتی تعلقات کو الجھا کر خالق سے رشتے جوڑنے والے غیر طبعی طریقہ عمل میں مشغول ہیں۔

یوم الجمعۃ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ بمطابق ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء

عند اذان العصر بہ مقام کہف الایمان المشہور' "بہ کرہ"

سورۂ کہف کے متعلق ایک ظلوم وجہول کے واردات واحساسات پورے ہوئے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُo رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَاج رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ج رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ج وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْلَنَا وقفه وَارْحَمْنَاوقفه اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَo سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُo وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَo الَّذِىْ بِعِزَّتِهٖ وَجَلَالِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ هٰذَا وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۔

خاکسار

مناظر احسن گیلانی

☆☆☆

اصحاب کہف

جدید تحقیق کی روشنی میں

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

اصحاب کہف کے غار میں

اس مسئلہ میں علماء اور محققین کی آرا بہت مختلف رہی ہیں کہ اصحاب کہف کا وہ غار جس میں وہ تین سو سال سے زیادہ سوتے رہے، کس جگہ واقع ہے؟ بعض حضرات نے اس کی جگہ ترکی کے شہر افسس میں بتائی ہے، بعض نے اندلس کے ایک غار کو اصحاب کہف کا غار قرار دیا ہے، بعض نے کہا ہے کہ وہ اردن میں واقع ہے، بعض کا کہنا ہے کہ شام میں ہے اور بعض کا خیال ہے کہ وہ یمن میں ہے۔ لیکن اردن کے ایک محقق محمد تیسیر ظبیان صاحب، جو وہاں کے رسالے ''الشریعۃ'' کے ایڈیٹر تھے، ۱۹۷۶ء میں پاکستان تشریف لائے تو حضرت والد ماجد قدس سرہ سے ملاقات کے لئے دار العلوم بھی تشریف لائے۔ اس وقت انہوں نے بڑے جزم اور وثوق کے ساتھ بتایا کہ یہ غار حال ہی میں عمان کے قریب ایک پہاڑ پر دریافت ہو گیا ہے۔ انہوں نے ذکر کیا کہ میں نے اس کی تحقیق کے لئے ایک مقالہ بھی لکھا ہے۔ جو دلائل و قرائن اس وقت انہوں نے ذکر کئے، ان کے پیش نظر یہ بات بہت قریب قیاس معلوم ہوتی تھی کہ غالباً اصحاب کہف کا یہ غار وہی ہوگا۔

اس وقت سے اس مقام کو دیکھنے کی خواہش تھی جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دس سال بعد آج پوری ہوئی۔ تیسیر ظبیان صاحب کا تو اب انتقال ہو چکا تھا، لیکن وہ اپنی تحقیق کے نتائج ایک مفصل کتاب میں محفوظ کر گئے ہیں جو ''موقع اصحاب الکہف'' کے نام سے دار الاعتصام نے شائع کر دی ہے۔

''اصحاب کہف'' کا واقعہ قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے، اور اسی واقعے کی وجہ سے قرآن کریم کی ایک پوری سورت کا نام ''سورۃ الکہف'' ہے۔ ''کہف'' عربی زبان میں غار کو کہتے ہیں اور واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک بت پرست بادشاہ کے زمانے میں کچھ نوجوان دین توحید پر ایمان لے آئے تھے اور شرک و بت پرستی سے بیزار تھے۔ بت پرست بادشاہ اور اس کے کارندوں نے ان پر ظلم و ستم توڑنے شروع کئے۔ لہٰذا یہ لوگ بستی سے فرار ہو کر ایک غار میں مقیم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر گہری نیند مسلط فرما دی اور یہ سالوں تک پڑے سوتے رہے۔ غار کا محل وقوع ایسا تھا کہ سورج کی روشنی اور ہوا تو بقدر ضرورت اندر پہنچتی تھی لیکن دھوپ کسی وقت اندر نہیں آتی تھی۔ کئی

سال گزرنے کے بعد بت پرست بادشاہ کی حکومت ختم ہوگئی اور اس کی جگہ ایک موحد اور صحیح العقیدہ نیک بادشاہ برسر اقتدار آ گیا۔ اس کے زمانے میں یہ لوگ اپنی نیند سے بیدار ہوئے۔ بھوک لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے میں سے ایک ساتھی کو سکے دے کر شہر بھیجا' اور یہ تاکید کی کہ خفیہ طریقے پر جا کر کوئی حلال کھانا خرید لائے۔ وہ لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ ابھی تک اسی بت پرست بادشاہ کا زمانہ ہے' اس لئے خطرہ تھا کہ اگر ان لوگوں کا اتہ پتہ انہیں معلوم ہوگیا تو وہ ظلم وستم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ چنانچہ یہ صاحب چھپتے چھپاتے بستی میں پہنچے اور ایک نان بائی کی دکان سے کھانا خریدنا چاہا' لیکن جب سکہ اس کے حوالے کیا تو وہ بہت پرانے زمانے کا تھا' جس سے سارا راز کھل گیا۔ انہیں یہ معلوم ہو کر اطمینان ہوا کہ حکومت بدل چکی ہے۔ شدہ شدہ بادشاہ وقت کو بھی اطلاع پہنچی' اور ان صاحب نے اپنے ساتھیوں کو بھی نئے حالات کی اطلاع دے دی۔

قرآن کریم نے اجمالی طور پر مذکورہ بالا واقعہ بیان کرنے کے بعد یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ اس دور کے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں کی قدر دانی کے طور پر ان کے اوپر ایک مسجد بھی تعمیر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

قرآن کریم نے اپنے عام اسلوب کے مطابق اس واقعے کی تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات بیان نہیں فرمائیں کہ یہ واقعہ کس دور میں اور کہاں پیش آیا؟ چنانچہ تاریخی روایات کی بنیاد پر مفسرین اور مورخین نے اس سلسلے میں مختلف آراء ظاہر کی ہیں۔ زیادہ تر محققین کا رجحان یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عروج آسمانی کے کچھ ہی عرصہ بعد' یعنی پہلی سے تیسری صدی عیسوی تک کا ہے۔ اس وقت اس علاقے پر نبطی بت پرست بادشادہ کی حکمرانی تھی' لیکن رفتہ رفتہ دین عیسوی جو فلسطین کے علاقے میں ظاہر ہوا تھا اس کے اثرات یہاں تک پہنچ رہے تھے۔ انہی کی بناء پر یہ نوجوان اس دین کے حلقہ بگوش ہوئے' پھر جس زمانے میں یہ سعید روحیں غار میں محو خواب تھیں' اس دور میں رفتہ رفتہ دین عیسوی کے پیروکار اس علاقے کو نبطی حکمرانوں سے آزاد کرا کر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہاں کے باشندوں نے بھی دین عیسوئی قبول کرلیا۔

پھر جب نیند سے بیدار ہونے کے بعد ان حضرات کو بدلے ہوئے حالات معلوم ہوئے تو

اگرچہ انہیں دین برحق کی نشرو اشاعت سے خوشی ہوئی لیکن انہوں نے اپنے لئے یہی پسند کیا کہ دنیا کے ہنگاموں سے الگ اسی غار میں اپنی باقی زندگی گزار دیں۔ لوگوں نے اصرار بھی کیا کہ وہ اب شہر میں آ جائیں' لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے' اور اپنی باقی زندگی اسی غار میں گزار دی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بادشاہ وقت ان کا حال معلوم کر کے ان کی زیارت کے لئے غار میں پہنچا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا' لیکن دوسری روایات میں ان کی وفات کے بارے میں خاموشی ہے۔

مسیحی مصادر میں بھی یہی قصہ معمولی فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اس واقعہ کی تفصیلات ۵۲۱ھ میں ساروغ (عراق) کے ایک کاہن نے جس کا نام یعقوب (یا جیمس) تھا' ایک مفصل مقالے میں لکھی تھیں۔ یہ مقالہ سریانی زبان میں تھا۔ پھر اس کے یونانی اور لاطینی ترجمے ہوتے رہے۔ اس کے بیان کے مطابق یہ واقعہ ۲۵۰ء میں ایشیائے کوچک کے شہر افسس میں پیش آیا تھا۔ ان نواجوں کی تعداد سات تھی اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا پیغام دنیا کو سنا کر دوبارہ اسی غار میں سو گئے۔ [1]

چونکہ یعقوب ساروغی نے ان کے بارے میں ''دوبارہ سونے'' کا لفظ استعمال کیا تھا' اس لئے بہت سے لوگوں کا اعتقاد یہ بھی رہا ہے کہ اصحاب کہف ابھی تک زندہ ہیں اور قیامت کے قریب دوبارہ اٹھیں گے۔

مسیحی مصادر میں تقریباً جزم کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ ترکی کے شہر افسس کے قریب پیش آیا تھا (جس کا اسلامی نام طرسوس ہے) اور وہیں پر ایک غار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اصحاب کہف کا غار ہے۔ شاید انہی مسیحی روایات کے زیر اثر بہت سے مسلمان مفسرین اور مورخین نے بھی اصحاب کہف کا محل وقوع افسس ہی کو بتایا ہے۔ تاہم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت تفسیر ابن جریرؒ میں مروی ہے جس میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اصحاب کہف کا غار ایلہ (خلیج عقبہ) کے قریب (یعنی اردن میں) واقع ہے۔ اس روایت اور متعدد دوسرے قرائن کی بنیاد پر آخر دور کے بہت سے محققین نے اسی کو ترجیح دی ہے

[1] ''موقع اصحاب الکہف'' مؤلفہ تیسیر ظبیان' ص ۳۹ مطبوعہ قاہرہ

کہ یہ غار اردن میں واقع ہے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ نے قصص القرآن میں اس موضوع پر بہت مفصل بحث کی ہے اور متعلقہ تاریخی اور جغرافیائی شواہد کی روشنی میں اسی کو درست قرار دیا ہے کہ یہ غار اردن میں ہے۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ارض القرآن میں اردن کے قدیم شہر ''پٹرا'' کو رقیم قرار دیا ہے۔ والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بھی ''تفسیر معارف القرآن'' میں مفصل بحث کے بعد اسی طرف رجحان ظاہر فرمایا ہے کہ یہ غار اردن میں ہے' اور مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے بھی یہی تھی۔

ان تمام حضرات کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ اردن کے مشہور تاریخی شہر پٹرا کا اصل نام رقیم تھا۔ جسے رومی حکومت نے بدل کر پٹرا کر دیا' اور یہ غار اسی کے قریب کہیں واقع تھا۔

لیکن ۱۹۵۳ء میں اردن کے محقق تیسیر ظبیان صاحب کو کسی طرح پتہ چلا کہ عمان کے قریب ایک پہاڑ پر ایک ایسا غار واقع ہے جس میں کچھ قبریں اور مردہ ڈھانچے موجود ہیں اور اس غار کے اوپر ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ اس غار کی تلاش میں روانہ ہوئے' یہ جگہ عام راستے سے ہٹ کر واقع تھی' اسی لئے کئی کلومیٹر دشوار گزار راستہ طے کر کے وہ اس غار کے دہانے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ تیسیر ظبیان صاحب کے الفاظ ہیں:

''ہم ایک اندھیرے غار کے سامنے کھڑے تھے جو ایک دور افتادہ جگہ اور ایک چٹیل پہاڑ پر واقع تھا' غار میں اس قدر اندھیرا تھا کہ ہمارا اندر داخل ہونا مشکل ہو گیا' ایک چرواہے نے ہمیں بتایا کہ غار کے اندر کچھ قبریں ہیں اور ان میں بوسیدہ ہڈیاں پڑی ہیں' غار کا دروازہ جنوب کی سمت تھا اور اس کے دونوں کناروں پر دو ستون تھے جو چٹان کو کھود کر بنائے گئے تھے' میری نظر اچانک ان ستونوں پر بنے ہوئے نقوش پر پڑی تو اس پر بیزنطی نقوش نظر آ رہے تھے۔ غار کو ہر طرف سے پتھروں کے ڈھیروں اور ملبے نے چھپایا ہوا تھا۔ اور یہاں سے تقریباً سو میٹر کے فاصلے پر ایک بستی تھی جس کا نام ''رجیب'' تھا۔

تیسیر ظبیان صاحب نے اپنی تحقیق جاری رکھی' محکمہ آثار قدیمہ کو متوجہ کیا' بالآخر ایک ماہر اثریات رفیق دجانی صاحب نے ماہرانہ تحقیق کے بعد یہ رائے ظاہر کی کہ یہی غار اصحاب کہف کا غار ہے' چنانچہ ۱۹۶۱ء میں اس کی کھدائی کا کام شروع ہوا تو اس رائے کی تائید میں بہت سے

قرائن وشواہد ملتے چلے گئے جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اس غار کا دہانہ جنوب کی طرف ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس پر قرآن کریم کی آیت پوری صادق ہے۔

﴿وتری الشمس اذا طلعت تزاورعن کھفھم ذات الیمین واذا غربت تقرضھم ذات الشمال و ھم فی فجوۃ منہ۔﴾

''اور تو دیکھے گا سورج کو جب وہ طلوع ہوتا تو ان کے غار سے دائیں جانب جھکتا ہوا گزرتا اور جب غروب ہوتا تو ان کے بائیں جانب کتراکر گزرتا اور یہ لوگ اس غار کے کشادہ حصے میں تھے''

اس غار میں صورتحال یہی ہے کہ دھوپ کسی وقت اندر نہیں آتی ' بلکہ طلوع وغروب کے وقت دائیں بائیں سے گزر جاتی ہے اور غار کے اندر ایک کشادہ خلا بھی ہے جس میں ہوا اور روشنی آرام سے پہنچتی ہے۔

(۲) قرآن کریم نے یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ بستی کے لوگوں نے اس غار کے اوپر مسجد بنانے کا ارادہ کیا تھا ' چنانچہ اس غار کے ٹھیک ' اوپر کھدائی کرنے اور ملبہ ہٹانے کے بعد ایک مسجد بھی برآمد ہوئی ہے۔ جو قدیم رومی طرز کے پتھروں سے بنی ہوئی ہے' ماہرین آثار قدیمہ کا کہنا ہے کہ یہ پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ شروع میں بازنطینی طرز کا ایک معبد تھا ' اور عبدالملک بن مروانؒ کے زمانے میں اسے مسجد بنا دیا گیا۔

(۳) عصر حاضر کے بیشتر محققین کا کہنا یہ ہے کہ وہ مشرک بادشاہ جس کے ظلم وستم سے تنگ آ کر اصحاب کہف نے غار میں پناہ لی تھی ' ٹراجان تھا جو ۹۸ء سے ۱۱۷ء تک حکمران رہا ہے' اور اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ بت پرستی سے انکار کرنے والوں پر سخت ظلم ڈھاتا تھا۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ ٹراجان نے ۱۰۶ء میں شرق اردن کا علاقہ فتح کر لیا تھا اور اسی نے عمان کا وہ اسٹیڈیم تعمیر کیا تھا جس کا ذکر پیچھے آ چکا ہے' اور وہ بادشاہ جس کے عہد میں اصحاب کہف بیدار ہوئے اس کا نام جدید محققین تھیوڈوسیس بتاتے ہیں جو پانچویں صدی کے آغاز میں گزرا ہے۔

دوسری طرف اس نئے دریافت شدہ غار کے اندر جو سکے پڑے ہوئے ملے ہیں ان میں

سے کچھ اجان کے زمانے کے ہیں (موقع اصحاب الکھف ص ۳۵) جس سے اس خیال کو بہت تقویت ملتی ہے کہ یہی اصحاب کہف کا غار ہے۔

(۴) قرآن کریم نے اصحاب کہف کو ''اصحاب الکھف والرقیم'' (غاراور رقیم والے) کہا ہے' رقیم کیا چیز ہے؟ اس کی تشریح میں مختلف آراء بیان کی جاتی ہیں' لیکن بیشتر محققین کا خیال یہ ہے کہ رقیم اس بستی کا نام تھا جس میں ابتداءً یہ حضرات آباد تھے۔ اب جس جگہ یہ غار واقع ہے وہاں سے کل سو میٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی ''رجیب'' کہلاتی ہے۔ رفیق الدجانی صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ ''رقیم'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے' کیونکہ یہاں کے بدو اکثر قاف کو جیم اور میم کو با سے بدل کر بولتے ہیں (موقع اصحاب کھف ص ۱۱۸) چنانچہ اب حکومت اردن نے اس بستی کا نام سرکاری طور پر ''رقیم'' ہی کر دیا ہے' بعض قدیم علماء جغرافیہ نے بھی رقیم کی بستی کو عمان کے قریب بتایا ہے' چنانچہ معروف جغرافیہ نگار ابوعبداللہ البشاری المقدسی اپنی کتاب ''احسن التقاسیم فی معرفة الاقالیم'' میں لکھتے ہیں:

والرقیم بلد فی شرق الاردن بالقرب من عمان حیث وجدت مغارة فیھا عدد من االبحث غیر البالیة۔ (موقع اصحاب الکھف ص ۴۹)

رقیم شرق اردن میں عمان کے قریب ایک شہر ہے جہاں ایک غار بھی پایا گیا ہے جس میں کچھ انسانی ڈھانچے بھی ہیں جو زیادہ بوسیدہ نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ یاقوت حمویؒ نے بھی رقیم کی تشریح کرتے ہوئے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ:

ان بالبلقاء بارض العرب من نواحی دمشق موضعا یزعمون انه الکھف والرقیم قرب عمان۔ (معجم البلدان للحموی' ص ۶۱ ج ۹)

دمشق کے مضافات میں جو عربی سرزمین بلقاء کہلاتی ہے' اس میں شہر عمان کے قریب ایک جگہ ہے جس کے بارے میں ان لوگوں کا خیال ہے کہ وہی کہف اور رقیم ہے۔

(۵) تیسیر ظبیان صاحب نے بعض روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمان اسی علاقے کے کسی غار کو اصحاب کہف کا غار سمجھتے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ کے بارے میں مروی ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے انہیں بادشاہ روم کے پاس ایلچی بنا

کر بھیجا تو وہ راستے میں شام وحجاز کے راستے پر ایک پہاڑ سے گزرے جس کا نام جبل الرقیم تھا' اس میں ایک غار بھی تھا جس میں کچھ ڈھانچے تھے' اور وہ بوسیدہ بھی نہیں ہوئے تھے' نیز تفسیر قرطبی میں حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں بھی مروی ہے کہ وہ اس غار سے گزرے تھے اور اسے اصحاب کہف کا غار قرار دیا تھا۔ فتوح الشام میں واقدی نے بھی حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کا ایک طویل قصہ لکھا ہے کہ وہ شام کی طرف جہاد کے لئے روانہ ہوئے اور راستہ بھول گئے' بالآخر بھٹکتے بھٹکتے جبل الرقیم کے پاس پہنچے تو اسے دیکھ کر پہچان گئے۔ اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ اصحاب کہف کا غار ہے' چنانچہ وہاں نماز پڑھ کر عمان شہر میں داخل ہوئے۔ (موقع اصحاب کہف ص ۴۶ و ۴۷ و ۱۰۳)

بہر کیف! اتنے پرانے واقعے کے محل وقوع کے بارے میں حتمی طور پر سو فیصد یقین کے ساتھ کچھ کہنا تو مشکل ہے لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ اب تک جتنے مقامات کے بارے میں مقام اصحاب کہف ہونے کی رائے ظاہر کی گئی ہے ان سب میں جتنے زیادہ قرائن وشواہد اس غار کے حق میں ہیں کسی اور غار کے حق میں اتنے قرائن موجود نہیں ہیں۔ تیسیر ظبیان صاحب نے اپنی کتاب میں افسس کے غار سے اس غار کا موازنہ بھی کیا ہے' اس موازنے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

غار عمان شہر سے ۷ کلومیٹر جنوب میں واقع ہے اور اردن کی مرکزی شاہراہ جو عقبہ سے عمان تک گئی ہے اس سے اس کا فاصلہ ۳ کلومیٹر ہے۔ ہم تقریباً نو بجے صبح یہاں پہنچے اب کاروں کے لئے پہاڑ کے اوپر تک جانے کے لئے راستہ بنا دیا گیا ہے۔ کار سے اتر کر تھوڑا سا اوپر چڑھے تو ایک کشادہ صحن سا ہے جس میں قدیم طرز تعمیر کے کچھ ستون وغیرہ بنے ہوئے ہیں۔ اس صحن کو عبور کر کے غار کا دہانہ ہے دہانہ کے فرش پر ایک خاصی چوڑے پتھر کی بنی ہوئی ایک چوکھٹ سی ہے۔ اس سے غار کے اندر اترنے کے لئے تقریباً دو سیڑھیاں نیچے جانا پڑتا ہے۔ یہاں آ کر یہ غار تین حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ایک حصہ دہانے سے سیدھا شمال تک گیا ہے' دوسرا دائیں ہاتھ مشرق کی طرف مڑ گیا ہے اور تیسرا بائیں ہاتھ مغرب کی طرف۔ مشرقی اور مغربی حصوں میں آٹھ تابوت نما قبریں بنی ہوئی ہیں۔ مشرقی حصے کی ایک قبر میں ایک چھوٹا سا سوراخ بھی ہے۔ اس سوراخ میں جھانک کر دیکھیں تو ایک انسانی ڈھانچہ صاف نظر آتا ہے۔ اگر اندھیرا ہو تو غار کا

مجاور موم بتی جلا کر اندر کا منظر دکھا دیتا ہے۔

لیکن غار کا جو حصہ جنوب سے شمال کی طرف سیدھا گیا ہے' وہ تقریباً سپاٹ ہے' اور اسی کے بارے میں تیسیر ظبیان صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہی وہ ''فجوہ'' ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔ جب ۱۹۶۱ء میں اس غار کی صفائی اور کھدائی کا کام شروع ہوا تو رفیق الدجانی کہتے ہیں کہ غار کی اسی درمیانی جگہ میں ایک جانور کا جبڑا پڑا ہوا ملا' جس میں ایک نوکیلا دانت اور چار داڑھیں محفوظ تھیں' تیسیر ظبیان صاحب کا خیال ہے کہ یہ اصحاب کہف کے کتے کا جبڑا تھا۔ اس کے علاوہ اسی جگہ پر رومی' اسلامی اور عثمانی دور کے بہت سے سکے' ٹھیکری کے برتن' کوڑیوں کے ہار' پیتل کے کنگن اور انگوٹھیاں بھی پڑی ہوئی ملی تھیں۔ اب یہ ساری چیزیں ایک الماری میں جمع کر کے غار کے شمالی دیوار میں محفوظ کر دی گئی ہیں جو ہم نے بھی دیکھیں۔

غار کے مشرقی حصہ میں ایک اوپر کو بلند ہوتی ہوئی چھوٹی سی سرنگ ہے جو دھواں نکالنے والی چمنی کی شکل میں ہے یہ سرنگ غار کی چھت پر جو مسجد بنی ہوئی ہے اس میں جا کر نکلی ہے' لیکن جب یہ غار دریافت ہوا اس وقت اس سرنگ کے بالائی دہانے پر ایک پتھر رکھا ہوا ملا تھا' اتفاق سے سلطان صلاح الدین ایوبی کے لشکر کے جرنیل اسامہ بن منقذ نے اپنی کتاب ''الاعتبار'' میں بھی ذکر کیا ہے کہ میں تیس شہسواروں کے ساتھ اس غار میں گیا' اور وہاں نماز پڑھی' لیکن وہاں ایک تنگ سرنگ تھی اس میں داخل نہیں ہوا۔ تیسیر ظبیان صاحب کا خیال ہے کہ یہ وہی تنگ سرنگ ہے۔ (موقع اصحاب الکہف' ص ۴۹)

غار کو جب صاف کر کے دیکھا گیا تو اس کی دیواروں پر خط کوفی اور خط یونانی میں کچھ عبارتیں بھی لکھی ہوئی تھیں' جو اب پڑھی نہیں جاتیں۔

غار سے باہر نکلے تو سامنے کے صحن میں ایک گول دائرہ بنا نظر آیا' مجاور نے بتایا کہ غار کی دریافت کے وقت یہاں ایک زیتون کے درخت کا تنا برآمد ہوا تھا' رفیق الدجانی صاحب نے لکھا ہے کہ زیتون کا یہ درخت بدوی دور کا ہے اور اس کے قریب ایک مسقّف قبر بھی تھی' اور جب ہم نے پہلے پہل یہاں کھدائی اور صفائی شروع کی تو آس پاس کے معمر لوگوں نے بتایا کہ زیتون کا یہ درخت بیس سال پہلے تک تر و تازہ تھا اور ہم اس کا پھل بھی کھایا کرتے تھے۔

غار کے ٹھیک اوپر ایک قدیم مسجد کی دیواریں ایک محراب سمیت چند فٹ تک ابھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ جب شروع میں تیسر ظبیان اور رفیق دجانی صاحب یہاں پہنچے تھے اس وقت یہ مسجد نظر نہیں آتی تھی۔ کھدائی اور صفائی کے بعد مسجد برآمد ہوئی۔ یہ مسجد دس میٹر لمبی اور دس میٹر چوڑی ہے اور کھدائی کے دوران اس کے بیچ میں چار گول ستون برآمد ہوئے جو رومی طرز کے ہیں' یہاں سے رومی بادشاہ جسٹن کے عہد (۵۱۷' ۵۲۷) کے کچھ پیتل کے سکے بھی کھدائی کے دروان برآمد ہوئے' ڈیڑھ میٹر کے برابر ایک چھوٹا سا کمرہ بھی نکلا جس کی چھت کو شاید اذان کے لئے استعمال کیا جاتا تھا' اسی کے قریب کچھ مٹی کے لوٹے بھی پائے گئے جو وضو میں استعمال ہوتے ہوں گے۔ یہیں سے ایک کتبہ بھی برآمد ہوا جس کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ احمد بن طولون کے بیٹے خمازویہ کے زمانے (۸۹۵عیسوی) میں اس مسجد کی مرمت کی گئی تھی۔

اس تمام مجموعے سے ماہرین نے جو نتائج نکالے ہیں' ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتداء میں یہاں رومیوں نے ایک عبادت گاہ بنائی تھی' عہد اسلام میں (غالبًا عبدالملک بن مروان کے زمانے میں) اسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا لیکن مسلمانوں نے اس کے طول وعرض میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔

اس وقت اردن کے محکمہ آثار قدیمہ اور محکمہ اوقاف نے اس غار کے تحفظ اور اس کی صفائی وغیرہ پر خاص توجہ صرف کی ہے۔ اس کے قریب ایک نئی مسجد بھی تعمیر کر دی ہے' زائرین کی سہولت کے لئے راستہ آسان بنا دیا ہے' اور غار کے اندر کتبات لگا دیئے ہیں۔

بہر کیف! عہد حاضر کی اس عظیم قرآنی دریافت کی زیارت زندگی کے یادگارترین تجربات میں سے ایک تھی۔ اصحاب کہف کا واقعہ دیدہ بینا کے لئے عبرتوں کے بیشمار پہلو رکھتا ہے۔

مخدوم مکرم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم نے اسی واقعے کے بصائر وعبر پر ایک مستقل کتاب ''معرکۃ الایمان و مادیت'' کے نام سے تحریر فرمائی ہے' جو واقعے کی تاریخی اور جغرافیائی تحقیقات سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اور قرآن کریم میں اس واقعے کا ذکر درحقیقت انہیں عبرتوں کی طرف توجہ دلانے کے لئے آیا ہے۔ (جہان دیدہ)

﴿تمت بالخیر﴾